سفر مینا
افسانے ـــــ سفرنامے
اشفاق احمد

عقابی
بانو قدسیہ کا
نیا ناول
راجہ گدھ
سنگ میل پبلیکیشنز لاہور

سفر مینا

افسانے ــــــ سفر نامے

ناولٹ

اشفاق احمد

سنگِ میل پبلی کیشنز۔ چوک اُردو بازار۔ لاہور ۲

ضابطہ

بار دوم ——— ۱۹۸۴ء

بار اوّل ——— اپریل ۱۹۸۳ء

تعداد ——— ایک ہزار

پبلشر ——— نیاز احمد

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

پرنٹر ——— منظور پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت ——— ۶۰/۰۰ روپے

انیق، انیس اور اثیر

کے نام

ترتیب

سفرنامے

افسانے

ناولٹ

چند حرف

سفر مینا میرے سفرناموں اور افسانوں کا مشترکہ مجموعہ ہے۔ ان دونوں صنفوں کو میں نے الگ شائع کرنے کا پروگرام وضع کیا تھا۔ لیکن جب ان کی ترتیب و تہذیب کے لیے مسودات کو دیکھنا شروع کیا تو یوں لگا کہ سفرنامے افسانوں کے رنگ میں پھیل گئے ہیں اور افسانے اندرونی سفر کے مسافر بن گئے ہیں۔ چنانچہ جب ان کے رنگوں کی حدوں کو ایک دوسری میں اُترے دیکھا تو میں نے انہیں یکجا کر دیا اور ان کا نام سفر مینا رکھ دیا۔

یہ نام اپنے اصل معنی سے ہٹ کر رکھا گیا ہے کہ اس میں ہر سفر کے اندر ایک مینا ہے اور ہر مینا ایک ایسے کارواں کے ساتھ ہے جو آتے جاتے موسموں کے ساتھ اپنے ٹھکانے بدلتا رہتا ہے۔

یہ افسانے، سفرنامے اور یہ ناولٹ میرے بہت ہی قریب بلکہ میرے اندر سے ہو کر گزرے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ آپ بھی ان کو اپنی جگہ کھڑے ہو کر اپنے رُخ سے دیکھیں۔ جس طرح عید کا چاند دیکھ لینے والے کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے کو بھی ہلال عید دکھائے اسی طرح میری بھی آرزو ہے کہ آپ بھی ان نظاروں کو دیکھیں اور کرب کی لذت سے آشنا ہوں۔

اشفاق احمد

داستان سرائے
۱۲۱ رسی ماڈل ٹاؤن
لاہور

سوادِ رومۃُ الکبریٰ

ہر مسافر سولی پر لٹک رہا ہے، نہ جان نکلتی ہے نہ پھندا ٹوٹتا ہے۔ ہوا میں اس طرح معلق ہمیں سات گھنٹے گزر چکے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے گویا اس الف لیلوی قالین میں لپٹے ہمیں ایک جُگ بیت گیا ہے۔ بحیرہ روم کے اوپر آگ لپکتا اور شعلے بھڑکاتا ہمارا طیارہ شاید آگے بڑھ رہا ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی نشست میں مجسم سوال بن کر دھنسا ہوا ہے، کسی کی آنکھیں بند ہیں اور کسی کی کھلی مگر ہر ایک جاگ رہا ہے، ہر ایک سوچ رہا ہے اور ہر ایک دوسرے سے پوچھ رہا ہے۔ ہوگا کبھی ختم یہ سفر کیا؟ اور دوسرا تیسرے کو کہتا ہے منزل کبھی آئے گی نظر کیا؟ اور منزل کا نام و نشان کوسوں نظر نہیں آتا، باہر اس قدر اندھیرا ہے کہ کوئی دریچے سے ادھر جھانکنے کی کوشش بھی نہیں کرتا ——— کہنے لگا چاند ہم نشینو! ——— کاک پٹ کو جانے والا دروازہ کھول کر چاند نمودار ہوا۔ اس کے سر پر سیاہ رنگ کی ٹیڑھی ٹوپی ہے۔ پاؤں میں اونچی ایڑی کا جوتا ہے۔ ہونٹوں پر سرخی ہے آنکھوں میں نیند کی گہری تحریر اور سینہ پر ہوائی کمپنی کا چمکتا ہوا نشان۔ اس نے اگلی نشستوں پر بیٹھے ہوئے مسافروں کو سفر کی موجودہ صورت کی تحریر دے کر لب کھولے بغیر کہا ہے۔ ہم نشینو! ہم اکتیس ہزار فٹ کی اونچائی پر پرواز کر رہے ہیں۔ ہماری رفتار ڈھائی سو میل فی گھنٹہ ہے۔ ترکیہ ہمارے دائیں جانب ہے۔ ہم ناک کی سیدھ روم جا رہے ہیں۔ باہر اس قدر سردی ہے، طیارے کا درجہ حرارت یہ ہے۔ سفری صورت کی تحریر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہو رہی ہے اور چاند ایک سوئے ہوئے مسافر کا کمبل ٹھیک کرنے کو جھکتا ہے۔ وہ آنکھیں کھول کر کہتا ہے "شکریہ شکریہ میں سویا نہیں جاگ رہا ہوں سوچ رہا ہوں اور ——— اور" اور چاند کہتا ہے کوئی بات نہیں یہ رسم قدیم ہے یہاں کے مسافر سوتے نہیں سمجھتے

ہیں اور سوچ نیند سے زیادہ ہوش ربا ہوتی ہے ۔ اس لیے کمبل پھسل کر نیچے گر جاتے ہیں ۔ مسافروں کا کام انہیں گرانا ہے ۔ ہمارا اٹھانا ـــ کوئی بات نہیں ، کوئی بات نہیں ، یہ رسمِ قدیم ہے یہاں کی !!

ہمارا طیارہ روم کے ہوائی مستقر چیامپینو پر اتر آیا ہے اور مشرق کی طرف منہ کر کے ٹھہر گیا ہے ۔ بڑی دور میرے دیس سے سورج نمودار ہو رہا ہے اس کی شرماتی لجاتی اٹھن لگی کرنیں طیارے کے گرگٹ ایسے سر سے کھیل رہی ہیں اور ہم سب اپنے اپنے ٹائٹ بیگ اٹھائے سکاؤٹوں کی طرح زینے سے نیچے اتر رہے ہیں ۔ میرا اور میرے دو ہمراہیوں کا سفر ختم ہوا ۔ باقیوں کو تھوڑی دیر بعد پھر اسی سولی پر چڑھنا ہے پھر وہی کھیل کھیلنا ہے ۔ یہ دیس دیس کے راہی کیسے مستعد ہیں کتنے باذوق ہیں ۔ آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں کم کوش لوگوں کا سفر ختم ہوا !

زینہ کے پاس آہنی فرش پر ایک اطالوی نوجوان ہاتھ میں کاغذوں کا ایک پلندہ اٹھائے ہر ایک کے پاسپورٹ اور اس کے ٹکٹ کا معائنہ کر رہا ہے ۔ اس نے مسافروں کے دو گروہ بنا دیئے ہیں ایک وہ جنہیں ابھی اور آگے جانا ہے اور ایک وہ گروہ جو صرف تین افراد پر مشتمل ہے اور جس میں مَیں بھی شامل ہوں ۔ باذوق راہیوں کو وہ اپنے ساتھ لے کر ایک طرف چل دیتا ہے اور ہم تینوں وہیں کھڑے اپنے اپنے بیگ جھلا رہے ہیں ۔ آس پاس کے پہاڑوں پر بسی ہوئی بستیوں پر نگاہیں دوڑا رہے ہیں ۔ چڑھتے اترتے طیاروں کو دیکھ رہے ہیں اور ایک دوسرے سے بات کرنا چاہتے ہیں ایک دوسرے کو الوداع کہنا چاہتے ہیں اور نہیں کہہ سکتے ۔ لجاتی شرماتی کرنیں اب ہمارے طیارے سے مانوس ہو گئی ہیں ۔ ان کی نربلتا دور ہوتی جا رہی ہے ۔ رنگ بدلتا جا رہا ہے اور وہ پہلے سے شوخ ہو گئی ہیں ـــ نیلی وردیاں پہنے دو قلی ایک ٹھیلہ ـــ دھکیلتے ہوئے ادھر آئے ہیں ان کے ساتھ ایک خاکی وردی والا جمعدار ہے ۔ سامان اترنے لگا ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنے بکس کو اترتے دیکھوں جو میں نے انار کلی سے خریدا تھا اور جس کے گرد ابا جان نے نئی ادوائن کی رسّی اس لیے بندھوا دی تھی کہ جنگ کے بعد تمام

بکس معمولی وضع کے بنتے لگے تھے اور ان کی کنڈیاں اور چھپکے مضبوط نہیں ہوتے۔ لیکن اوپر چڑھے ہوئے اور نیچے کھڑے قلی کے درمیان کوئی جھگڑا ہو گیا ہے۔ وہ اطالوی زبان میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے ہیں اور میرا بکس جس میں اور چیزوں کے علاوہ المونیم کا ایک لوٹا بھی ہے نیچے نہیں اتر رہا۔ خاکی وردی والا جمعدار مسکراتے ہوئے ہمارے پاس آ گیا اور ہاتھ پھیلا کر کہہ رہا ہے "کمینہ!" میرے دونوں ساتھی حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے ہیں اور میں ویسی ہی مسکراہٹ سے جمعدار کو کہتا ہوں "کمینہ نہیں کمینے دو جو ہیں" لیکن جمعدار میری بات نہیں سمجھتا اور قدرے سر جھکا کر اور دونوں ہاتھ الہ دین کی طرح پھیلا کر ہم سے کہتا ہے" کمینہ! کمینہ!!" اب ہم تینوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے ہیں۔ وہ ٹھگنے کا اطالوی ہمیں کمینہ بنا رہا ہے۔ ہم جو اس کے دیس میں معزز مہمانوں کی طرح وارد ہوئے ہیں۔ اطالیہ کی صدیوں پرانی تہذیب اور قرنوں پرانے تمدن سے متعارف ہونے آئے ہیں۔ پاپا سے عقیدت رکھتے ہیں۔ کلیساؤں میں جوتے اتار کر داخل ہونے کا تہیہ کر کے آئے ہیں۔ ہمارا اس طرح سے استقبال کیا جا رہا ہے، ہمیں یوں ذلیل کیا جا رہا ہے کہ ایک نوکر پیشہ ہمارے منہ پر ہمیں کمینہ کہہ رہا ہے۔ ہماری، ہمارے دیس کی اور ہمارے آزاد شہری پن کی ہنسی اڑائی جا رہی ہے۔ غیرت کہتی ہے پاکستان کے آزاد شہری تیرے اب وجد کا سر شاہانِ فغفور کے آگے نہ جھکا اور تو ایک شکست خوردہ ملک کے حقیر کیڑے سے اپنے آپ کو کمینہ کہلوا رہا ہے! آگے بڑھ اور اس رذیل کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کر۔ لیکن آپ کو کمینہ کہلوا رہا ہے! آگے بڑھ اور اس رذیل کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کر۔ لیکن تربیت کہتی ہے ذرا سوچ ذرا سمجھ انگریز نہیں تو انگریز کا بھائی ہے۔ ایسا خیال دل میں لائے گا تو ہتھکڑی پہنا دی جائے گی اور — اور میں ہنس کر کہتا ہوں "کمینہ کمینہ ہاں ہاں کمینہ" یعنی کیا کروں مجبور ہوں۔

لمبی لمبی میزوں پر ہمارا سامان چن دیا گیا ہے۔ اب کسٹمز والے ان کا معائنہ کریں گے۔ ہم

اپنے اپنے بکسوں کے پاس اس طرح کھڑے ہیں جیسے سائیس گھوڑوں کے پاس ہوا کرتے ہیں۔ کبھی رومال سے بکس کی سطح صاف کی جا رہی ہے۔ کبھی پچکے ہوئے کونے کو دیکھا جا رہا ہے اور گاہے ان لیبلوں کو پڑھنے کی کوشش کی جا رہی ہے جو ہوائی کمپنی نے ان پر چپکا دیئے ہیں۔ مزوبی مجھے لینے کے لیے آ گیا ہے لیکن اسے اندر آنے کی اجازت نہیں وہ باہر برآمدے میں کھڑا دروازے کے شیشے پر انگلی سے نوبت بجا رہا ہے۔ میں اسے ہاتھ اٹھا کر سلام کر رہا ہوں اور پتہ نہیں کیوں کھسیانی ہنسی ہنس رہا ہوں۔ کسٹمز والے ہر ایک کا بکس کھلوا کر دیکھ رہے ہیں میں بھی اپنی رسی کی مضبوط گرہیں کھولنے میں مصروف ہوں لیکن وہ بری طرح سے پکی ہو گئی ہیں۔ شاید وہ کھل بھی سکیں لیکن میری گھبراہٹ مانع ہے۔ میں شرمندہ ہو رہا ہوں کہ ابھی میرا بکس کھلے گا تو اس میں سے لوٹا برآمد ہو گا یقیناً سب مسافر اسے دیکھ کر ہنسیں گے۔ خدا جانے کسٹمز والوں کو اس کی سمجھ نہ آئے اور وہ اس پر بہت زیادہ محصول لگا دیں یا کوئی مشکوک نگاہوں سے اس کا معائنہ کرے اور اسے ہائیڈروجن بم کا نہایت ہی اہم پرزہ خیال کرے۔ بہت ممکن ہے وہ اسے جادو کی کوئی چیز سمجھیں اور مجھے اسی کمرے میں شعبدہ دکھانے کے لیے کہیں۔ پھر میں کیا کروں گا اور ان سے کس طرح کہوں گا کہ لوٹے کا کھیل سب کے سامنے نہیں کھیلا جاتا! خوف بڑھتا جا رہا ہے اور گرہیں اور بھی ہوتی جا رہی ہیں۔ کسٹمز آفیسر میرے بکس کے پاس آ کر اپنے کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے اور پوچھتا ہے "پاکستان؟"

ہاں ہاں، میں قدرے فخر سے کہتا ہوں، "پاکستان۔"

"بکچہ دلیس؟" وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھتا ہے۔

پھر وہ میرے بکس کے گرد لپٹی ہوئی رسی کو کھینچ کر پوچھتا ہے "جوٹ جوٹ؟"

"نہیں نہیں" میں جواب دیتا ہوں "یہ جوٹ نہیں۔ جوٹ تو بہت خوبصورت ہوتی ہے جیسے جیسے —" اور میں سوچنے لگتا ہوں جوٹ بھلا کیسی ہوتی ہے۔ حکومت کے کتابچوں میں تو اسے گولڈن فائبر کا نام دیا جاتا ہے۔ مگر خدا معلوم کیسی ہوتی ہو گی۔ کیسی بھی ہو بہت خوبصورت ہوتی ہے۔

جیسے — جیسے — کسٹمز آفیسر میرے بکس پر انگلی بجا کر پوچھتا ہے "چائے"۔
"تو" میں بڑے دھڑلے سے کہتا ہوں
"سگریٹ؟" وہ پھر پوچھتا ہے۔
اور میں جیب سے اپنا سگریٹ کیس نکال کر کہتا ہوں "چار" اور پھر قدرے توقف کے بعد میں سگریٹ کیس آگے بڑھا کر کہتا ہوں! HAVE ONE۔ تھوڑی دیر تک وہ موٹی موٹی اور بھدی انگلیاں میرے سگریٹ کی چکیلی سطح پر سکیٹنگ کرتی ہیں اور میرے پاس تین سگریٹ رہ جاتے ہیں۔ وہ مجھے بکس کھولنے کی زحمت دیئے بغیر چاک سے اس پر دستخط کرتا ہے اور آگے بڑھ جاتا ہے۔
ہوائی کمپنی کا موٹر چند سواریوں کے ہمراہ مجھے اور زوبی کو لاد کر ہوائی اڈے سے شہر کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بھڑے بیٹھے ہیں۔ تیزی سے باتیں ہو رہی ہیں شکایتیں کی جا رہی ہیں، گالیاں دی جا رہی ہیں اور موٹر سر سبز کھیتوں میں مڑتا گھومتا سڑک چاٹتا آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ گھاٹیوں میں یسوع مسیح کی بھیڑیں چر رہی ہیں ان کے پیچھے دختر دہقان ایک لمبی سی چھڑی لیے ادھر ادھر گھوم رہی ہے۔ دور تک پاپاؤں کے زمانے کے اگوے ڈکٹ کے کھنڈرات کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ کچھ محرابیں ڈھے گئی ہیں باقی ایستادہ ہیں۔ پتھروں کی یہ دیواریں دیکھ کر بھیڑوں کی رنگت پر نگاہ جما کر اور دختر دہقان کا لباس دیکھ کر مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ میں واقعی روم میں پہنچ گیا ہوں۔ لامذہب وحشیوں کا روم، سیزر کا روم، پاپاؤں کا روم اور مسولینی کے بعد صدر جمہوریہ کا روم، رومۃ الکبریٰ!
روم واقعی بہت بڑا ہے، بہت عظیم ہے۔ اس کے کھنڈر عظیم، اس کے کلیسا عظیم۔ اس کی امنگیں بڑی اس کا نام بڑا۔ روم میں وہ سب کچھ موجود ہے جو زندگی کی حرارت برقرار رکھتا ہے یا رکھ سکتا ہے۔ لیکن روم میں وہ چیز کہیں نظر نہیں آتی جو تصویروں میں دیکھتے تھے۔ وہ رنگ کہیں بھی ابھرتا دکھائی نہیں دیتا جو ہوائی کمپنیوں کے اشتہاروں میں نمایاں ہوا کرتا ہے۔ بڑے

بڑے معبد دھونسے ہوئے ہیں چھوٹی چھوٹی خانقاہیں سنوار لائی ہوئی ہیں اونچے اونچے محل ٹھنڈے ٹھنڈے کھڑے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گھروندے سہمے سہمے سے پھیلے ہیں۔ بازاروں میں رونق ہے گلیوں میں بھیڑ ہے ہوٹلوں میں قہقہے ہیں۔ ریسٹوران میں سرگوشیاں ہیں لیکن کہیں بھی وہ بات نہیں جسے سالوں پہلے میرے تصور نے جنم دیا تھا۔

جسے ہر مغربی ملک کی سیر کے متمنی کا دماغ چتلی مرغی کی طرح سیتا رہتا ہے اور آخر میں اس سے بیروکابد وضع چوزہ برآمد ہوتا ہے۔ میں اس وقت اجنبی دیس میں ہوتے ہوئے بھی گویا اپنے وطن ہی میں ہوں۔ روم کی کون سی بات ہے جو لاہور سے نہیں ملتی۔ ویسے ہی لوگ ہیں وہی ان کا اندازِ زیست ہے۔ خواجہ اس قدر بلند بام ہے کہ بندے کی آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی بندہ اس قدر منفعل ہے کہ آقا اس سے بات کر کے اپنی فردیت کھونا نہیں چاہتا بھوک، بیماری، افلاس نے اس سنگین شہر کے سوادرسوں کو بیٹھادیا ہے۔ ہر گلی کوچے کے فلک بوس گرجوں میں ان بے نواؤں کی صدائیں گھنٹیاں بن کر گونجتی ہیں اور آسمانوں سے من وسلویٰ کا نزول نہیں ہوتا۔ قدم قدم پہ دیواروں میں مریم کی تصویریں نصب ہیں۔ ہر بے چارا ان کے قریب سے گزرتے ہوئے اپنی میلی کچیلی ٹوپی سر سے اٹھا کر فرش پہ تقریباً دوزانو ہو جاتا ہے اور میڈونا مجسم بے چارگی بن کر اسے تکے جاتی ہے۔ عورت کا دل واقعی نرم ہوتا ہے۔

میڈونا اسے خالی نہیں جانے دیتی۔ جونہی وہ پٹڑی پر جھکتا ہے اسے سگریٹ کے چند ٹکڑے ادھر ادھر نظر آجاتے ہیں۔ جنہیں وہ کمال عقیدت سے اٹھا کر اپنی جیبوں میں ڈال لیتا ہے جب بہت سے ٹکڑے اکٹھے ہو جاتے ہیں تو وہ انہیں طائبر کے کنارے بیٹھ کر اخبار کے کاغذ پہ بٹورتا ہے اور اس تمباکو سے اپنا مٹی کا پائپ بھر کر سلگاتا ہے اور آرام سے کش کھینچنے لگتا ہے۔ اس نے اپنی ٹانگیں پٹڑی پر پھیلا رکھی ہیں اور اسے روکنے والا کوئی نہیں۔ وہ اپنے دائیں بائیں بار بار تھوک رہا ہے اور کوئی پوچھنے والا نہیں اور کوئی اسے پوچھ بھی کیسے سکتا ہے اور وہ اکیلا تو نہیں اس کے ساتھ ہزاروں اسی قسم کے مرد اور عورتیں بیٹھی ہیں دھوئی

کے مرغولے بنا رہی ہیں بھوک رہی ہیں ٹانگیں ہلا رہی ہیں۔ عورتوں کو تو شام کے وقت کچھ پیرے
مل بھی جاتے ہیں لیکن مردوں کو کوئی نہیں پوچھتا اور وہ مرد جن کی داڑھیاں بڑھ رہی ہوں،
عمر بڑھ گئی ہو اور قد بڑھ چکے ہوں ان کے لیے تو کوئی بھی مقام نہیں۔ لڑکوں بالوں کو ہزاروں لاکھوں
گھومنے والے ٹورسٹوں میں ایک آدھ ڈھائی دن کی ملازمت دے بھی دیتا ہے۔ اگر میں اطالوی
بول سکتا یا ان کی بولی سمجھتا تو ضرور ان بیکار مزدوروں سے پوچھتا۔ آخر اس طرح بیکار کیوں پڑے
رہتے ہو کوئی کام کرو۔ ملکِ خدا تنگ نہیں ہے، اطالیہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ — اور
میں ہی ریڈیو روم سے ہر روز یہ خبریں نشر کرتا ہوں" فرانس سے اطالوی مزدوروں کی واپسی"
آسٹریلیا میں اطالوی محنت کش فاقے سے مر رہے ہیں، انہیں واپس لانے کے لیے چھپن
ہزار ٹن کا" جولیا" بھیجا جا رہا ہے۔ جب وہ مزدور واپس اپنے دیس پہنچ جاتے ہیں تو میں
ریڈیو اسٹیشن آتے ہوئے انہیں ٹائبر کے کنارے دیکھتا ہوں وہ سگریٹیں پھونک رہے ہوتے
ہیں اور دھوئیں کے مرغولے بنایا کرتے ہیں۔ باہر کی ساری سے گھر کی آدھی بھلی۔ آسٹریلیا کے
مکھن اور پنیر سے اطالوی سگرٹوں کے ٹکڑے بھلے۔

برخوردار اشفاق احمد سلامت تا قیامت باشید!

اپنے ملک کی زبان میں لکھا ہوا یہ خط دیکھ کر تم حیران تو ہو جاؤ گے لیکن خیر کوئی بات نہیں۔
آہستہ آہستہ خود بخود تم کو تو میرا پتہ لگ جائے گا۔ اس ناچیز بندہ کو انیز و ٹیپسالی کہتے ہیں، میں
پندرہ برس تک پاکستان میں رہا ہوں، جی ہاں صرف پندرہ برس۔ وہاں کے سب لوگ مجھے
فادر انیزو کے نام سے پکارتے ہیں۔ میں نے آپ کا لاہور بھی تو دیکھا ہے مگر تھوڑا دیکھا
ہے۔ زیادہ دیر تک میں ملتان کے بڑے پاک گرجے میں پادری رہا ہوں۔ چک بیالی کے
ایک بڑے میاں مولوی خوشی محمد صاحب سے میں نے اردو سیکھا۔ پنجابی میں گاؤں میں گھومنے
سے خود بخود سیکھ گیا۔ اب میں دونوں زبانیں بڑی اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ میرا مطلب

یہ رہا کہ میں بس جاتا ہوں - ہر روز سویرے میں پاک نماز سے فارغ ہو کر سائیکل پر دیہاتوں ——— کا دورہ کرنے تو جایا کرتا اور وہاں پاک مسیح کی زندگی پر وعظ کیا کرتا۔ پندرہ برس زندگی کا ایک بڑا حصہ ہیں۔ میری تو آدھی زندگی بس وہیں گزری ۔

تم کو ہمارے وطن اطالیہ میں آئے تین مہینے ہو گئے ہیں مگر تم یہاں کے لوگوں کے ساتھ میل ملاپ زیادہ تو نہیں کر سکے ہو۔ پہلی بات تو یہ سن لو کہ لفظ "کمینہ" سن کر غصہ نہ ہوا کرو اس کا مطلب پاکستان کا کمینہ نہیں ہے اس کے معنی ہیں "آیئے چلیں" امید کرتا ہوں اب تم پر اس لفظ کے معنی تو واضح ہو گئے ہوں گے اور جناب طول عمرہ جب روم کی سڑکیں پار کیا کرو تو دائیں بائیں دونوں طرف دیکھ کر کیا کرو، ایسا نہ کرنے سے بڑا خطرہ ہے کوئی بس یا موٹر یا ٹرام یا موٹر سائیکل تم کو مار دے گا۔ میں نے آپ کے وطن کا لون کھایا ہے اس لیے تمہاری خیر خواہی تو چاہتا ہی ہوں۔ آگے تمہاری اختیاری ہے ۔

کل تم یونیورسٹی کے ایک پروفیسر صاحب سے جھگڑا کر رہے تھے ۔ تم ٹھیک بھی کہہ رہے تھے اور غلط بھی کہہ رہے تھے۔ انگریز بہت بدمعاش ہے ۔ اس نے ہمارے اوپر تمہارے سے زیادہ ظلم کیا ہے مگر خیر کوئی بات نہیں پاک خدا تو ہر چیز دیکھتا ہے وہ خود بخود بدلہ لے لے گا مگر امریکن بدمعاش نہیں ہیں - انہوں نے اطالیہ کی بڑی مدد کی ہے ۔ تم کہہ رہے تھے، اطالیہ میں امریکنوں کا راج ہے یہ بات نادرست ہے اور لازم نہیں تھا کہ اکو کہتے۔ ہمارا بالکل جمہوری نظام ہے ۔ اطالوی جمہوریہ کے صدر کا نام لوئی جی اے اینا ڈی ہے ۔ مجلس مشاورت کے صدر کا نام آنریبل دی گاسپری ہے ۔ دی گاسپری صاحب وزیر خارجہ بھی ہوتے ہیں ۔ وزیر خزانہ کا نام آنریبل پے لا ہے ۔ وزیر زراعت بھی اطالوی ہیں۔ ان کا نام آنریبل فان فانی ہے وعلیٰ ہذا القیاس تم تو خود سب کے نام جانتے ہو ۔ سب لوگ اطالوی ہیں تو امریکنوں کی حکومت تو کسی طرح بھی نہیں ہو سکتی ۔ بس امریکن ہمارے دوست تو ہوتے ہیں ۔ ہماری حکومت نے ان کو ہر طرح کی آزادی دیدی ہے ۔ انہوں نے ہم کو ڈالر دے کر مدد کی ہے ۔ ہمارے ملک میں

اقوام متحدہ کا زراعتی صدر دفتر FAO کھول دیا ہے امریکی پکے عیسائی ہیں ۔ بہت سے امریکی آج دن تک تقدس ماٰب پاپا کو مانتے ہیں ۔ جنگ کے بعد بہت سے امریکی سپاہیوں نے اطالوی خاتونوں سے شادی کی اور ہمارے مسئلہ زیادتی خاتونوں کو تو حل کیا اور یہ تو کوئی جھوٹی بات نہیں ہے کہ پاک دین کی تبلیغ ڈالر سے ہوتی ہے اگر ڈالر نہ ہوں تو لیرے سے دین کی تبلیغ نہیں ہوسکتی ۔ کیونکہ لیرے کی قیمت بہت تھوڑی ہے امریکہ ہماری مدد نہ کرے تو ساری دنیا پاک خدا کے خلاف ہو جائے اور پاک گرجے تہس نہس ہو جائیں ۔ تم اس بات کی شکایت بھی پروفیسر صاحب سے کر رہے تھے کہ اطالوی دکاندار اس گاہک کو جلدی سودا دیتے ہیں جس کے پاس ــــــ ڈالر ہوتا ہے اور جس کے پاس لیرے ہوتے ہیں اس کو تو بعد میں پوچھتے ہیں ۔ یہ تو بالکل سیدھی سی بات ہوئی اگر تم کسی دکان پر ایک ہزار روپے کا اور ایک چھوٹی کا سودا کرنے جاؤ تو دکاندار ہزار روپے والا سودا پہلے کرے گا ۔ غصہ نہیں کرنا اب تو بات تمہاری عقل میں آگئی ہونی چاہیئے ۔

جب تم ہوٹل میں کھانا کھانے جاتے ہو تو ہر دفعہ بیرے سے پوچھتے ہو سور تو نہیں ہے ؟ یہ بات ٹھیک نہیں ۔ مذہب اسلام کے حکم اور فرمان کے مطابق تم پر اہل کتاب کا ذبیحہ اور اہل کتاب کی خاتونیں حلال ہیں ۔ ایسے تو مت پوچھا کرو ۔ گوشت کے ساتھ ساتھ تم پر عیسائی خاتونیں بھی حلال ہیں ۔ اطالیہ کو مسئلہ زیادتی خاتونوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے ۔ ایک بات واجب ہے اس کو یاد رکھنا کہ صرف پاک نکاح کا حکم اور فرمان ، اسلام نے دیا ہے ۔

ریڈیو سٹیشن پر پارٹی بازی ہو رہی ہے ۔ واکا ۔ پارودی اور کاسارو سا تم کو اپنی پارٹی میں تو ملانا چاہتے ہیں اور ٹیکنیکل سائیڈ کے لوگ تم کو اپنی طرف بلاتے ہیں ۔ تم کسی کے ساتھ نہ ملنا ۔ بس اپنا پروگرام کرے جاؤ اور ہر ایک کو آری ودیر لا کہہ کر گھر چلے جایا کرو ۔ داکا اور کاسارو سا پارٹی کے لوگ ہڑتال کرنے لگے ہیں تم ان کی بات نہ سمجھنا اور ہڑتال ہو جائے تم ریڈیو اسٹیشن

پکڑ تو ضرور لگا جانا یہاں رومن اور غیر رومن کا سوال تو چل رہا ہے پر تم بس پاکستانی بن کر رہنا۔

اب میں تم کو تھوڑی سی نصیحتیں کرتا ہوں جو تمہارے فائدے کا باعث ہوں گی۔

۱۔ کسی بڑے پاک گرجے یا پرانی تواریخی عمارت یا اسٹیشن کے پاس سودا نہ خریدا کرو دکاندار تو بہت زیادہ قیمت لگاتے ہیں۔

۲۔ بس یا ٹرام میں کسی خاتون کے آنے پہ اٹھ کر نہ کھڑے ہوا کرو۔ یہ کوئی انگلستان نہیں ہے روم کو تو بس پاکستان ہی سمجھو۔

۳۔ امریکی سگریٹ دکانوں سے نہ خریدو۔ سڑک کے کنارے جو لوگ میٹھی گولیاں اور تورونے بیچتے ہیں اور درحقیقت میں میٹھی گولیاں یا تورونے نہیں بیچتے وہ سگریٹ چھپا کر رکھتے ہیں اور ان کو بیچتے ہیں۔ ان کے پاس ہو کر چھوٹی آواز میں کہا کرو۔

"سگاریتے امریکانو"؟ وہ بہت سستے سگریٹ بیچتے ہیں۔

۴۔ کافی یا چائے پی کر بیرے کو پانچ لیرے سے تو زیادہ نہ دیا کرو۔

۵۔ مہینہ میں فقط بالفقط ایک بار نہایا کرو۔

۶۔ ریڈیو سٹیشن کے سنہری نکٹائی والے اور لال کوٹ والے سے ہاتھ نہ ملایا کرو۔ وہ تو چپڑاسی ہے۔

۷۔ بسکٹوں کے ڈبے کو اپنے بکس میں بند کر کے جایا کرو۔ تمہاری نوکرانی کمرے کی صفائی کے ساتھ بسکٹوں کی صفائی بول دیتی ہے۔

۸۔ بس میں یا ٹرام میں ٹکٹ لینے کے بعد باقی کے لیرے تو ضرور گنا کرو۔

۹۔ دلا کو تم ہمیشہ ڈلا کہتے ہو یہ درست ہے۔ انگریزی ڈی کو ہمیشہ دی پڑھا کرو۔

۱۰۔ شام کے وقت دلا برگیزے سیر کرنے مت جایا کرو۔ شام کو وہاں بدمعاش عورتیں آتی ہیں۔ پاک خدا سب کچھ دیکھتا ہے۔ وہ برے کاموں کا برا بدلہ تو دے گا۔

۱۱- اپنی تنخواہ کا حساب لکھا کرو۔

اب اتنی نصیحتیں کرتا ہوں۔اس کے بعد اور بھی لکھوں گا اگر تم میرے کہنے پر چلو گے تو پاک زندگی ملے گی۔ میرے استاد مدرس مولوی خوشی محمد فرمایا کرتے ہیں مر گئے مردود نہ فاتحہ نہ درود۔

تمہارا خیر خواہ

فادر انیزو

ریڈیو روم کا وہ بڑا کمرہ جہاں پروگرام اسسٹنٹ بیٹھتے ہیں اور جہاں ٹائپسٹ لڑکیوں کی میزیں ہیں۔ بیرونی نشریات کے سٹوڈیوز کے دروازے اسی کمرے میں کھلتے ہیں۔ ہر سٹوڈیو کے پاس متعلقہ ملک کے ریکارڈوں کی مختصر سی لائبریری ہے۔ اطالوی اناؤنسر کرسیوں اور میزوں پر بیٹھے سگریٹ پی رہے ہیں۔ بیرونی نشریات کے چند براڈ کاسٹر آگئے ہیں۔ باقی آیا چاہتے ہیں جو آگئے ہیں وہ اپنی اپنی لائبریری سے ریکارڈ چھانٹ رہے ہیں باقی گپیں ہانک رہے ہیں۔ گفتگو زیادہ تر اطالوی، فرانسیسی اور انگریزی میں ہو رہی ہے گاہے گاہے ایک آدھ لفظ اردو فارسی یا عربی کا بھی سننے میں آجاتا ہے۔

پروگرام اسسٹنٹ: روسی زبان میں کیا رکھا ہے۔ وسکی۔ فسکی۔ کسکگی۔ دلفوو۔ خروکود۔ نوودو —— و —— الٹی آر۔ الٹی پی۔ الٹا کے۔ بھلا یہ بھی کوئی زبان ہوئی۔؟

روسی براڈ کاسٹر: اور اطالوی میں کیا دھرا ہے۔ ایک جملے میں دس مرتبہ الورا آتا ہے۔ الورا دیکھیے۔ الورا اندیامو۔ الورایہ، الورا وہ بھلا......

اطالوی اناؤنسر: —— حضور اس الورا میں صدیوں پرانی تہذیب اور قرنوں پرانا تمدن پوشیدہ ہے۔ احیار کا سارا طلسم اس ایک لفظ میں مخفی ہے۔ آپ اس کا مطلب کیا سمجھیں؟

ایرانی براڈکاسٹر: (لائبریری سے ریکارڈ چھانٹتے ہوئے) اور کیا وقت ہوا ہے؟

پروگرام اسسٹنٹ: تم اپنی الیست کیسٹ جیسیت والی موسیقی کے ریکارڈ چھانٹتے رہو۔ گجر بجے گا تو آپ ہی پتہ چل جائے گا۔

ایرانی: برادرم ہمارے منہ نہ لگنا۔ ایرانی پدر سوختہ ہا بڑے وہ ہوتے ہیں شکل وصورت کے اچھے ہو چیستاں بنادیں گے پھر ہر ایک سے پوچھتے پھرو گے بتاؤ میں مرد ہوں کہ عورت؟

پروگرام اسسٹنٹ: یہ کیا بات ہوئی بھلا۔

ایرانی (ہنس کر) اس بات کو مائیکل انجیلو سے پوچھو لیونار دو دا ونچی سے پوچھو۔ وہ اس بات کے بڑے دھنی تھے مجھ سے کیا کہتے ہو!

دوسرا اطالوی اناؤنسر: یہ آج پاکستان زندہ باد کے ہونٹ کس سینوریتا نے چاٹ لیے ہیں جو اس طرح سے چپ بیٹھا ہے

پاکستانی: (سرخ سکرٹ والی ٹائپسٹ کی طرف دیکھ کر) اب اتنے سارے لوگوں میں اس کا نام کس طرح سے لوں۔

ایرانی: کہہ دو کہہ دو! جان عم کہہ دو!! این ہمہ خانہ بر انداز اند کسی کا نام لے دو۔

پاکستانی: اور اگر پاکستانی سفیر متعینہ روم کو پتہ چل گیا تو؟

مصری: تو ہم تمہیں قاہرہ لے چلیں گے واللہ قاہرہ!

پاکستانی: (شرمندگی سے) پھر کبھی سہی۔

پروگرام اسسٹنٹ: جناب یہ لطیف کی بولی بولنے والے کسی کام کے نہیں۔ ذرا اس کا منہ دیکھو جیسے سکول سے بھاگ کر آیا ہو۔

پاکستانی: (مسکرا کر) بھاگ کے آیا ہوں پٹ کے تو نہیں آیا۔

ایرانی: (جلدی سے) تو کیوں پٹتے شیر فیسلاں بیٹیں وہ جو دوسرے کی کمائی کھاتے ہوں۔

اطالوی اناؤنسر: کیا مطلب؟

روسی: مطلب وہی جو ہے۔

اطالوی اناؤنسر: گویا ہم.....

روسی (بات کاٹ کر) بھلا آپ کا کسی نے نام لیا؟ ہم تو ان کی بات کر رہے ہیں جن کے ہاتھ دوسروں کی جیبوں میں ہوتے ہیں اور جن کی جیبوں میں دوسروں کی کرنسی ہوتی ہے۔

پروگرام اسسٹنٹ: یعنی؟

ایرانی: یعنی کچھ لوگ ایسے بھی ہیں۔

عمر رسیدہ پروگرام اسسٹنٹ: (ہانک لگا کر) معاف کیجیے گا حضرات یہاں پالیٹکس پر بحث نہیں ہو سکتی۔

مصری: (حیران ہو کر) پالیٹکس! نعوذ باللہ! نعوذ باللہ!!

ایرانی: (ایک آنکھ میچ کر) جان عم اس چیز کو تمہارے ریختہ میں کیا کہتے ہیں!

پاکستانی: چور کی داڑھی میں تنکا! کا ہے درریش دزدے۔

مصری: اس کا مطلب؟

ایرانی: بخدا مطلب کچھ بھی ہو بس مزا آگیا۔ کیا خوب ریختہ ہے..... بخدا!

(ہندوستانی براڈ کاسٹر داخل ہوتا ہے۔ چاروں طرف سے ہنستے ہنستے کا شور بلند ہوتا ہے)

پاکستانی: (اونچی آواز) پاکستان

سب مل کر: زندہ باد

ہندوستانی: ہاں ہاں جنبہ باد جنبہ باد — سب اچھا — سب اچھا۔

پاکستانی: میں نے کہا ٹھاکر آج بھیگی بلی بنے پھرتے ہو کیا بات ہے؟

ہندوستانی: کوئی نئی بات نہیں۔ روج چوک ہو جاتی ہے۔ آج چھاتا پھر بھول گیا۔

کتنی دیر ہے ؟

پاکستانی : بس دیر ہے اندھیر نہیں۔ دیکھتے جاؤ۔

ہندوستانی : میں جانوں تمہارا مجاک نہیں ختم ہو پائے گا۔

پاکستانی : ارے یہ مذاق ہے کیا۔

ہندوستانی : تو اور کیا پاٹھ ہے۔

ایک ٹائپسٹ : بس جب یہ دونوں ملے اپنا فورم کھول بیٹھے۔

دوسری : (ہنس کر) اور دوسروں کے ہونٹ سینسر نے چاٹ گئیں۔

مصری : (ایرانی کی کہنی ملا کر) سنو جیبی کیا بات ہوتی ہے ادھر۔

ایرانی : (ادھر دیکھ کر) وائے بر حال ما — بخال ہندواش بخشم سمرقند و بخارا را — سنتے ہو ٹھاکر خال۔ ہندواش!

ہندوستانی : (معنی نہ سمجھتے ہوئے) کھال ہندواش ہاں ہاں کھال ہندواش سب اچھا۔۔۔۔ سب اچھا۔۔۔۔ ہی ہی ہی ہی۔

ٹائپسٹ : وہی بوخارا جہاں قالین بنتے ہیں۔

ایرانی : ہاں ہاں وہی بوخارا۔

دوسری ٹائپسٹ : ہم تو اسے اطاوی میں بوخارا کہتے ہیں تم بوخارارا کہتے ہو۔ کون دوست ہے۔

پاکستانی : دونوں ٹھیک ہیں لیکن بوخارا زیادہ مناسب ہے — بوخارارا۔

ٹائپسٹ لڑکیاں : (دھراتے ہوئے) بوخارارا — بوخارارا —

پروگرام اسسٹنٹ : (ٹھاکر کو سگریٹ پیش کرتے ہوئے) جب تم پاکستانی سے ملتے ہو تو تم دونوں ایک ہی بول بولتے ہو۔ ہم اپنی لاگ بک میں ہر روز آپ کے نام کے آگے اردو لکھتے ہیں۔ آج تک میری سمجھ میں یہ بات نہیں آسکی کہ وہ ہندی بولتا ہے یا آپ اردو؟

ہندوستانی : دراصل ہم ایک ہی زبان بولتے ہیں - ہندی یا فرق صرف لکھائی کا ہے ورنہ ......

پاکستانی : (چلاکر) جھوٹ ہے . غلط ہے . تمہیں دھوکا دیا جارہا ہے - ہم جب بھی بات کرتے ہیں اُردو میں کرتے ہیں ہندوستان پاکستان دونوں ملکوں میں .....

ہندوستانی : (بات کاٹ کر) دھیرے دھیرے ــــ دھاندلی نہ مچاؤ - تمہیں تو بس ہوتا آتا ہے (پروگرام اسسٹنٹ کو مخاطب کرکے) دیکھیے بات ایک ہی ہے ، ملک ایک ہی ہے ، بس سیاسی اختلاف .....

پاکستانی : ملک ایک ہے ؟ ملک ایک ہے ؟ ایک بار پھر کہو - خدا کی قسم ایک بار اور کہہ کے دیکھو ساری زندگی اطالیہ کے جیل خانے میں کٹ جائے گی -

ہندوستانی : (ہنس کر) ارے یہ تو فاشسٹ ہے - اس کو تو .....

سنہرے بالوں والی ٹائپسٹ : (دھیمی آواز میں) فاشسٹ ہے تو ــــ تو ــــ پھر تو ــــ پھر تو بہت ..... (ڈر کر خاموش ہو جاتی ہے)

مصری : ڈرومت ، جو دل میں ہے صاف صاف کہہ دو تمہیں ملازمت ہی کرنی ہے نا - روم نہ سہی قاہرہ سہی ــــ واللہ ہم تمہیں قاہرہ بلوالیں گے -

(لیکن لڑکی خاموش رہتی ہے)

پاکستانی : (جیب سے خط نکال کر) ان ٹکٹوں کو دیکھو یہ پاکستان کی ٹکٹیں ہیں (بٹوہ کھول کر) یہ پاکستان کا روپیہ ہے - یہ آدھا روپیہ اس کو ہم اٹھنی کہتے ہیں اس کی قیمت تمہارے سو لیرا کے برابر ہے - اور ــــ اور ــــ (جیبیں ٹٹولتے ہوئے) یہ ہندوستان کی ٹکٹیں ہیں - پڑھو ان پر کیا لکھا ہے - پڑھو ان پر کیا لکھا ہے ــــ ایک ہی بات ہے ہونہہ ایک ہی ملک ہے !

(سب اپنی اپنی نشستیں چھوڑ کر ٹکٹ دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں)

روسی: (ایک ٹکٹ کو بغور دیکھتے ہوئے) یہ مغل آرٹ ہے نا؟

پاکستانی (غرور سے) ہاں۔

سنہرے بالوں والی: اور یہ اونٹ ہیں نا؟

پاکستانی: ہاں

سنہرے بالوں والی: (دوسری ٹائپسٹ کو مخاطب کرکے) پتہ ہے اُونٹ مہینہ بھر پانی کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔

پاکستانی: فخر سے) ایک مہینہ پانچ دن تک۔

دوسری ٹائپسٹ: پاکستان میں اُونٹ ہوتے ہیں؟

پاکستانی: بہت۔

ہندوستانی: (دبی زبان سے) ہندوستان میں بھی ہوتے ہیں۔

پاکستانی: (حقارت سے) ہوتے ہیں لیکن گھٹیا قسم کے۔

سنہرے بالوں والی: (ہندوستانی کو مخاطب کرکے) کیا ہندوستان کے اُونٹ بھی پانی کے بغیر زندہ رہتے ہیں؟

پاکستانی: (وثوق کے ساتھ) چار پانچ دن سے زیادہ نہیں۔

ہندوستانی: بھگوان کے لیے ایسی باتیں تو نہ کیجئے۔ ایسی باتیں تو بچے بھی....

پاکستانی: (بات کاٹ کر) بس بس بٹا کر بس!

ٹائپسٹ: پاکستان میں کیا پانی کی قلت ہے؟

پاکستانی: (جزبز ہو کر) کیسی باتیں کرتی ہو۔ وہاں تو قدم قدم پر بل کھاتے دریا بہتے ہیں اور.....

ٹائپسٹ: (جلدی سے) تو پھر تم اونٹوں کو پانی کیوں نہیں پینے دیتے؟

پاکستانی: (بغلیں جھانکتے ہوئے) پانی..... پانی تو وہ خود ہی نہیں پیتے میرا

مطلب ہے..... اُونٹ تو بس اُونٹ کی طرح ...... (گجر کی صدا بلند ہوتی ہے اور سب اپنے اپنے سٹوڈیو کی طرف بھاگتے ہیں)

آج میں سارا دن گھر سے باہر نہیں نکلا۔ آدھی رات سے بارش ہو رہی ہے اور دن بھر ہوتی رہی ہے۔ روم بھی عجیب بستی ہے۔ دو چار دن دھوپ تو پانچ سات دن بارش۔ نہ یہاں کی مخلوق قرینے سے کوئی کام کرتی ہے نہ خالق۔ دوپہر کے وقت، معمول کے مطابق بھوک نے ستایا تو میں نے دراز کھول کر دیکھا۔ اس میں تین آلو ایک انڈا اور پنیر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا پڑا تھا۔ ایک آدمی کے لیے اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔ سٹوو لیمپ جلایا آلو کے قتلے زیتون کے تیل میں تلے انہیں پنیر کے ٹکڑوں کے ساتھ کھاتا رہا۔ اس دوران میں انڈا اُبل گیا۔ ہاف بائیل کرنے کو رکھا تھا لیکن وہ آپ سے آپ فل بائیل ہو گیا۔ چائے کی ایک پیالی کے ساتھ ماحضر تناول فرمایا اور کمبل لپیٹ کر پھر بستر میں دبک گیا۔ یورپ کی زمستانی ہوا جس میں..... شمشیر کی سی تیزی ہوتی ہے نیند کے غلبہ کو دو چند کر دیتی ہے۔ میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے وہ چند کر دیتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ شام کے تین بجے میری گھر والی نے دروازے پر ہولے سے انگلی بجائی میں ہڑبڑا کر اٹھا اور ورود مسعود کی وجہ دریافت کرنے کے لیے دروازہ کھولا۔ اس نے میری طبیعت اور صحت کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا۔ جب میں نے اس کی خاطر خواہ تسلی کر دی تو اس نے میری پچھلی رات کے مشاغل دریافت کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے اندر بلا کر صوفے پر بٹھا لیا اور خود الماری سے TEACH YORSELF ITALIAN نکال کر اس میں سے جواب کے مناسب کلمات ڈھونڈھنے لگا۔ پندرہ منٹوں میں گیارہ ایسے فقرے مل گئے۔ جنہیں بار بار دھرا کر میں نے اسے یقین دلایا کہ فی الحال مجھے دیگر مشغلوں سے نیند زیادہ پیاری ہے۔ جوں جوں اس دیس کے لوگوں سے واقفیت بڑھتی جائے گی اور میں ان کی بولی بولنے لگوں گا تو شاید راتوں کی نیند حرام ہو جائے۔ وہ میرے

جواب کی طرف توجہ دیئے بغیر میرا تلفظ ٹھیک کرتی رہی اور پھر اٹھ کر چلی گئی - اس وقت صرف ایک تمنا دل میں کروٹیں لے رہی ہے کہ اے کاش سنہ ۵۰ء کے دن واپس لوٹ آئیں اور کہیں سے KING STORK کی ایک ڈبیہ ہاتھ آجائے - ان دنوں میں اور پروفیسر محی الدین اثر گورنمنٹ کالج کے اوول میں بیٹھ کر جس خلوص اور محبت سے "بگلے" کی سگرٹیں پیا کرتے تھے کوئی ذمہ دار باپ اپنے بچہ کا منہ بھی کیا چومتا ہوگا! اطالیہ کی سگرٹوں میں خدا جانے کیا بھرا ہے کہ سگریٹ اور سیٹی میں فرق ہی محسوس نہیں ہوتا اندر پھونکو باہر پھونکو اک ہوک سی اٹھ کر رہ جاتی ہے نہ دھواں نکلتا ہے نہ سگریٹ کی خوشگوار تلخی کا مزہ ملتا ہے - بچپن میں میں جھاڑو کی باریک مگر ٹھوس سینکوں کو لیمپ کی چمنی کے اندر ڈال کر سلگاتا تھا اور کش کھینچا کرتا تھا تو ہلکا سا اچھو ہوتا تھا چھوٹی سی چھینک آتی تھی اور ذرا سی نمکینی حلق کو چھوتی تھی - اطالوی سگریٹوں میں یہ بات نہیں - ان کا کش کھینچتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے گویا پینے والے کا کوئی پرانا دوست (جس سے ملے کم از کم پندرہ سال بیت چکے ہوں) خواب میں سگریٹ سلگائے بیٹھا ہے - ایسے میں بگلا یاد نہ آئے تو کیا ہو!

میرے کمرے کے اوپر سینورا ددکا اپنے فرنیچر کو پھر ترتیب دے رہی ہے - میز اور کرسیاں گھسیٹی جارہی ہیں - الماری کی جگہ تبدیل کی جارہی ہے اور سینورا کی اونچی ایڑی ٹک ٹک اس کے فرش اور میری چھت پر بج رہی ہے - ایک زمانہ تھا یہ لوگ ڈیوک تھے - ان کے اپنے محل تھے - اپنے باغات تھے اور فرسکاتی میں ان کے اپنے تاکستان تھے - انہوں نے اپنے باغیچوں میں تیار ہونے والی شراب کے علاوہ کبھی کوئی چیز نہ چکھی تھی - لیکن ایام کے الٹ پھیر نے اس خاندان کو اب دو کمروں میں مقید کر دیا ہے - لیرا لیرا جمع کر کے یہ ہر پندرھواں دن دینو کی ایک گھٹیا سی بوتل خرید کے لاتے ہیں اور پانی ملا ملا کے پیتے ہیں اگلے وقتوں کی یادگار دو کرسیاں اور ایک صوفہ ان کے گھر میں باقی رہ گیا ہے - سینورا سارا دن اسی کے پیچھے پڑی رہتی ہیں - ہر آدھ گھنٹے کے بعد ان کی جگہ تبدیل ہوتی ہے مگر پھر بھی وہ اگلی سی بات پیدا

نہیں ہوتی۔ اس مسلسل کھینچ گھسیٹ نے میری زندگی حرام کر دی ہے۔ اس پر بھی خاموش رہتا ہوں، میری گھر والی نے انہیں کچھ نہ کہنے کی تنبیہہ کر رکھی ہے۔ اس لیے کہ سینورا کسی عام آدمی کی بات سہار نہیں سکتیں اور گزشتہ ایام یاد کر کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگتی ہیں مجھے اس کمرے میں رہتے گو تھوڑے ہی دن گزرے ہیں اس پر بھی سینورا کے ہر کام اور ہر سرگرمی سے واقف ہو گیا ہوں۔ ان کی اونچی ایڑی نے ایک ہی ہفتہ میں مجھے خانہ ساز تاربرقی کے سارے رموز سمجھا دیے ہیں۔ میں کرسی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا ہوں۔ بستر میں لیٹ کر سگریٹ پی رہا ہوں یا شیشے کے سامنے بیٹھ کر حجامت بنا رہا ہوں گویا کچھ بھی کر رہا ہوں۔ سینورا ہر وقت میرے سامنے ہیں اور میں اپنی سماعت کے زور سے ان کی مصروفیتوں کو دیکھ رہا ہوں۔ اب وہ ایک کرسی سے اٹھ کر دوسری پر بیٹھی ہیں۔ اب انہوں نے چلمچی میں پانی بھر کے منہ دھویا ہے۔ اب وہ قد آدم آئینہ کے سامنے بال سنوار رہی ہیں۔ ابھی وہ بھیگا ہوا ٹاٹ فرش پر رگڑ رہی تھیں۔ اب وہ لپ سٹک لگا رہی ہیں۔ ابھی انہوں نے باہر جانے کا ارادہ کیا تھا اور اب وہ سیڑھیاں اتر رہی ہیں۔ ان کے شوہر سہ ساتا دو ٹلے بس کے ڈرائیور ہیں جو سینٹ پیٹر سے سٹیشن جاتی ہے اور اسٹیشن سے پھر سینٹ پیٹر واپس آجاتی ہے۔ مجھے اکثر ان کی بس میں سوار ہونے کا موقع ملتا ہے اور کبھی کبھی جب سواریوں کے ریلے کے آگے قدم نہیں جمتے تو میں عین ان کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔ وہ ہر موٹر، موٹر سائیکل یا بگھی والے کو اپنا راستہ کاٹتے ہوئے دیکھ کر یا جو رہا ہے پر سرخ بتی سے آنکھیں چار ہوتے ہی یہ بڑی بڑی گالیاں دیتے ہیں۔ ذلیل۔ بدفطرت اور غلام کا بچہ ان کا تکیہ کلام ہے۔ ہائے! کلاہ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی!

آج پھر ٹھاکر کے ہمراہ گلیریا گیا تھا۔ روم کے عین مرکز میں یہ پرانی وضع کے سنگین ستونوں والا برآمدہ بڑی اہمیت رکھتا ہے یہاں ہر قسم کا بیوپار ہوتا ہے۔ اعلیٰ قسم کی دکانوں سے لے کر چھابڑی والوں تک ہر طرح کا سودا دستیاب ہوتا ہے، لیکن اس مقام کی سب سے

بڑی تجارت غیر ملکی سکّوں کی خرید و فروخت ہے۔ حکومت کے اس ناجائز لین دین کو ختم کرنے کے لیے جگہ جگہ سپاہی متعین کئے ہیں۔ میلی کچیلی برساتیوں میں ملبوس ادھیڑ عمر کے بھورے بھورے آدمی آپ کے قریب سے گزریں گے اور ہولے سے کہیں گے چینج ایکسچینج؟ اگر آپ کو ضرورت ہے تو بیچ کھیت سودا ہو گا اور سپاہی دوسری طرف منہ پھیر لیں گے۔ یہاں کی بلیک مارکیٹ کا دستور الٹا ہے۔ پاؤنڈ کے تبادلۂ زر کی سرکاری قیمت سترہ سو چونتیس لیرے ہے۔ لیکن گلیریا میں سولہ سو یا بعض اوقات (جھگڑا کرنے پر) پندرہ سو لیرے کا بھی پاؤنڈ مل جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے لوگ آفسٹ پرنٹنگ کے بڑے ماہر ہیں ـــــ ہاں تو میں آج شام گلیریا گیا تھا۔ ٹھاکر کو دس پاؤنڈ خریدنے تھے اور مجھے آج کا پرچہ۔ میں اخبار بڑی مشکل سے پڑھتا ہوں۔ مشکل سے کیا پڑھ ہی نہیں سکتا بس تصویریں دیکھتا ہوں یا سینما کے اشتہار، پھر بھی تقریباً ہر روز اخبار خریدتا ہوں۔ "پائیسے سیرا" پارٹی کا اخبار ہے۔ مجھے پارٹی سے کوئی لگاؤ نہیں اس عورت سے پیار ہے جو "ہوٹل" کے سامنے یہ اخبار بیچا کرتی ہے۔ اس کا قد، اس کی شکل اس کی آواز بالکل اس عورت سے ملتی ہے جو لاہور سرائے رتن چند میں ماڈل ٹاؤن لبسوں اور پنجاب ٹرانسپورٹ کی لاریوں کے درمیان اخبار بیچا کرتی ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے دیس اپنا شہر اپنا ہر کوئی یاد آ جاتا ہے اس اطالوی اخبار فروش کے ایک پاؤں میں فلیٹ بوٹ ہوتا ہے، دوسرے میں لدمن چپل۔ سر پہ ایک میلا سا مفلر اور تن پہ کمبل کاٹ کر بنایا ہوا ایک کوٹ۔ اس کی آواز میں ایسی گھن گرج ہے گویا نقارے پر چوٹ پڑی ہو۔ پٹڑی پہ یوں چلتی ہے جیسے روم نہ پہلے پاپا کا تھا نہ اب دی گاسپری کا ہے۔ ہنستی ہے تو اور بھی ہیبت ناک ہو جاتی ہے۔ اسی دہشت کو دبانے کے لیے میں اس سے پیار کرنے لگا ہوں اور اس سے اخبار خریدتا ہوں۔ اس کے آس پاس وہ عورتیں بھی ٹہلا کرتی ہیں جو لڑکیوں کا روپ دھار کر آدھی آدھی رات تک گاہک کی تلاش میں ہر ایک سے آنکھیں لڑاتی ہیں، اور روم چونکہ، بقول ٹھاکر، یاتریوں کا شہر ہے اس لیے ان کو اکثر ایسے یاتری مل جاتے ہیں جو تھوڑے سے لیرے خرچ کر کے الکھ جگا لیتے ہیں۔ بہت سی دیویاں

جن کی عمر کافی ڈھل چکی ہے اور جنہیں میک اپ کا شعور نہیں ان کے من مندر میں صرف اُس وقت دیپ جلتے ہیں جب امریکی بحریہ کا کوئی جہاز نیپلز کے کنارے لنگر انداز ہوتا ہے اور سپاہی روم دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔

افسوس میری ڈائری بڑی روکھی پھیکی اور بے کیف سی ہے۔ ان اوراق میں چوٹی کے لکھنے والوں کا انداز نہیں۔ مجھے چاہیئے کہ کچھ سیاست کے بارے میں لکھوں کچھ تمدن کی باتیں کروں۔ تھوڑا سا پرانی تاریخ کا حوالہ دوں۔ ذرا سا آرٹ پر تنقید کروں۔ کہہ سن کر مل ملا کر پڑھ پڑھا کے تہذیبوں کے ڈنڈے ملاؤں تاکہ ذرا چمک پیدا ہو اور معتبری کا پہلو نہ دبے —— آئندہ یوں ہی کروں گا۔ اب ایسے ہی ہوگا!

—— آج میرے بھتیجے خالد کا خط آیا ہے۔ اس پر سیاہی کے بے بے شمار دھبے ہیں اور جا بجا ننھی ننھی انگلیوں کے کتنے ہی چھاپے ہیں۔ اس نے لکھا ہے چاچا جان میرے خط میں جو "ٹمکنے" آپ کو نظر آتے ہیں دراصل وہ آنسو ہیں جو آپ کی یاد میں میری آنکھوں سے بہے ہیں۔ اس کا خط پڑھ کر مجھے اپنے بچپن کا زمانہ یاد آ رہا ہے۔ میں نے اپنے ماموں کو ایک ایسا ہی خط لکھا تھا۔ لیکن چونکہ میں خالد سے قدرے چالاک تھا اس لیے اس پر ڈراپر میں پانی بھر کر قطرے ٹپکائے تھے۔

—— آج صبح سٹوو لیمپ جلاتے ہوئے انگلی جل گئی۔ لکھا تو جا سکتا ہے لیکن میں یونہی نہیں لکھنا سوء ادب ہے!

—— روم میں خواب بہت آتے ہیں، وحشت خیز، کربناک، دلچسپ، پُر لطف، جنت نگاہ اور فردوس گوش قسم کے خواب میں نے زوبی کے دوست ڈاکٹر بالدی سے اس کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے کہا معدہ میں خرابی کے باعث ایسی باتیں ہوا کرتی ہیں، فروٹ سالٹ پیجیئے۔ دو دن سے باقاعدہ فروٹ سالٹ پی رہا ہوں۔ خوابوں کی شدت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ البتہ ان کا دھندلاپن دور ہو گیا ہے۔ اب ایسے واضح اور کنٹراسٹ قسم

کے خواب آنے لگے ہیں کہ ان کا ہاف ٹون بلاک تیار ہو سکتا ہے۔ پہلے سیدھے سادھے خواب ہوا کرتے تھے، اب ٹیکنیکلر ہو گئے ہیں۔ رات میں منٹو، انجم رومانی، پروفیسر عاشق، استاد عشق لہر اور ایم اسماعیل ایک جگہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ نواب سائل دہلوی جانشین نواب مرزا خاں داغ دو گھوڑوں والی رومن رتھ میں سوار چوک انارکلی میں آ پہنچے (خیال رہے میں نے نواب سائل کی تصویر تک نہیں دیکھی) گھوڑوں کے سم سونے سے منڈھے ہوئے تھے اور ان کے نتھنوں سے رنگ برنگا دھواں نکل رہا تھا۔ نواب صاحب مرحوم نے ایک فولادی خود پہن رکھا تھا۔ کلائیوں کے گرد دبیز چمڑے کی پٹیاں کس کر بندھی ہوئی تھیں اور کندھوں پر چیتے کی کھال لٹک رہی تھی۔ انھوں نے منہ زور گھوڑوں کی راسیں کھینچتے ہوئے منٹو سے ہسپانوی میں پوچھا "سیر کو چلو گے"؟ منٹو نے ململ کے کرتے کی آستین چڑھا کر بڑی نستعلیق فرانسیسی میں جواب دیا "ضرور ضرور! میں کیا ساری پارٹی چلے گی"۔ باوجود اس کے کہ رتھ میں مشکل سے ایک آدمی کے کھڑے ہونے کی جگہ تھی ہم سب اس میں سوار ہو گئے گھوڑے بڑے بدلگام تھے، اچھلے کودے الف ہوئے لیکن ان کی ایک بھی پیش نہ گئی اور رتھ تیر سا چلا۔ راستہ میں اکبری دروازہ دہلی دروازہ پھر اس کے بعد ایک مور یہ پل دو مور یہ پل۔ ریل کی بہت سی پٹڑیاں اور چند گندے نالے عبور کرنے کے بعد ہم روم کے ہوائی اڈے چامپینوں کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں ہسپانوی آبادکاروں کی ایک چھوٹی سی بستی دکھائی دی۔ دور دریائے کبیر چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ نواب صاحب نے رتھ ایک جھونپڑی کے سامنے روک کر عجیب سی زبان میں آواز دی، اندر سے ایک نوجوان بل فائیٹر کا لباس پہنے برآمد ہوا۔ اس کے پیچھے شاید اس کی بیوی تھی۔ نواب صاحب نے ہسپانوی میں پوچھا "کھواب کے فصل کیسی ہے"۔ اس نے خالص پوٹھوہاری میں جواب دیا: "کچھ نہ پوچھو نواب صاحب اس موسم نے تو ہمیں برباد کر دیا۔ خیال تھا اب کی فصل سے باپ دادا کا سارا قرضہ اتر جائے گا لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ نہیں تو اتنا ہی اور سر پر چڑھ جائے گا"۔ نواب صاحب نے حیران ہو کر پوچھا: "کیوں خیر تو ہے"؟ اس نے اپنا سرخ

کبڑا بیوی کو پکڑاتے ہوئے کہا" اب کے پانچ گھماؤں میں بلیک اینڈ وہائٹ اور تین گھماؤں میں بھری فائیو بوئے تھے۔ بوٹے بہت اچھے تھے۔ پھل بھی کافی لگا لیکن ایک رات جو کہر پڑی تو سارے سگریٹ مرجھا کر بیڑیاں بن گئے —— ہم تو برباد ہو گئے نواب صاحب " اس پر منٹو اپنے مخصوص لہجے میں کہنے لگا: "تو ٹھیک ہے بیڑیاں پاکستان بھیج دو" ہسپانوی نے مایوس ہو کر جواب دیا" اس کے لیے ایکسپورٹ لائسنس نہیں ملتا منٹو صاحب" اس پر منٹو نے خوش ہو کر کہا" یہ تو اور بھی اچھی بات ہے، خود پی جاؤ"۔

آج پھر ڈاکٹر بالدی سے ملا اور ان سے اپنی شکایت بیان کی۔ انہوں نے رائے دی ہے کہ فروٹ سالٹ کی مقدار بڑھادی جائے! —— سن باون ختم ہوا اور نومولود سال کی عمر تین منٹ ہو گئی۔ میں اپنی کھڑکی کے پٹ کھولے جلدی جلدی یہ سطور گھسیٹ رہا ہوں۔ اس وقت سارے روم میں چراغاں ہو رہا ہے۔ گولے چھوٹ رہے ہیں۔ زفیل دیتی آتش بازیاں ڈوب رہی ہیں ابھر رہی ہیں۔ لوگ اپنے اپنے دریچوں سے پرانی چیزیں سڑک پر پھینک رہے ہیں۔ چھن چھن بوتلیں ٹوٹ رہی ہیں ٹھناٹھن پرانے ڈبے اور ٹوٹے پچکے برتن زمین پر گرائے جا رہے ہیں۔ دھب دھب گودڑ راہوں پر گر رہے ہیں۔ چرک چرڑکرک پرانی چوکیاں اور سٹول پھینکے جا رہے ہیں۔ بھد بھد بلب پھوٹ رہے ہیں۔ بلچ بلچ کرتے باون کے کیلنڈر کھڑکیوں سے نیچے اتر رہے ہیں۔ لوگ اپنے اپنے کوٹھوں پر چڑھے خوشی کے نعرے لگا رہے ہیں۔ زندہ باد نیا سال خوش آمدید نئے سال پرانی چیزیں پھینک دو۔ پرانی چیزیں چھوڑ دو۔ نیا سال آگیا نیا سال آگیا —— سپاہی لوہے کے ٹوپ پہنے سڑکوں میں سیٹیاں بجا رہے ہیں اور بھولے بھٹکے اجنبیوں کو دیواروں کے ساتھ لگ جانے کا مشورہ دے رہے ہیں —— لوگ شور مچا رہے ہیں —— گا رہے ہیں —— تالیاں بجا رہے ہیں —— پرانی چیزیں کھڑکیوں سے نیچے کود رہی ہیں —— سپاہی چلا رہے ہیں —— فائر بریگیڈ تیزی سے ادھر ادھر گھوم رہے ہیں —— سامنے دریچہ میں وہ

آدھی بھگی ہوئی شراب کی خالی بوتلیں پرانے کنستر اور بلب نیچے پھینک رہی ہے اور چلا رہی ہے پرانی چیزیں پھینک دو —— پرانی چیزیں توڑ دو —— اور میرے کمرے میں کوئی ایسی چیز دکھائی نہیں دیتی جو میری ہو جسے میں پھینک سکوں —— توڑ سکوں —— تیس سال کی کوششوں کے بعد بھی میں کوئی چیز نہ اپنا سکا —— تیس سال —— ؟ ہاں تیس سال —— ! او تیس سال پرانے انسان ! —— لیکن میری کھڑکی بہت اونچی ہے —— نیچے سیاہ پتھر کی سڑک ہے —— اور پتھریلی سڑک بہت ٹھنڈی ہے —— سپاہی سیٹیاں بجا رہے ہیں اور وہ کھڑکی میں لٹکی ہوئی اپنے بازو جھلا جھلا کر کہہ رہی ہے توڑ دو —— پھینک دو پرانی چیزوں کو چھوڑ دو —— ہاں ہاں میں کہتا ہوں پھینک دو —— پھینک دو چھوڑ دو —— توڑ دو چھوڑ دو —— ہاں ہاں —— نئے سال خوش آمدید —— نئے سال خوش آمدید ——

خوابوں کا جزیرہ

"یہ امریکہ نہیں ہے جو تم دیکھ رہے ہو۔"
"یا جو تم دیکھ چکے ہو۔"
"اصل امریکہ نیویارک ہے۔"
"اصل امریکہ کیلیفورنیا ہے۔"
"نیویارک سٹی"
"سان فرانسسکو"

گلوریا اور میری آپس میں جھگڑ رہی تھیں اور بوئنگ طیارہ بڑے بڑے پر پھیلائے زوں زوں کی آواز نکالتا، نیویارک شہر پر منڈلا رہا تھا۔

کیپٹن نے کہا "خواتین و حضرات، میں ٹھیک سے نہیں کہہ سکتا کہ ہم کس وقت لینڈ کریں گے، لیکن اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ لینڈنگ کیو میں اس وقت ہمارا ساتواں نمبر ہے۔"

ساتوں جہاز کافی دیر تک فضا میں تیرتے رہے اور پھر ایک ایک کر کے اترنے لگے۔

جس وقت ہمارے بوئنگ کے پاؤں زمین پر پڑے، تو اپنی ہستی کا پھر سے یقین ہونے لگا۔ موسیقی بج رہی تھی اور جہاز ہولے ہولے ٹیکسی کرتا ہوائی اڈے کی عمارت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے شیشوں میں سے دیکھا، نیویارک کی فلک بوس عمارتیں ایک دوسری کے پیچھے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ میرے کانوں میں پھر گلوریا اور میری کے فقرے

گونجنے لگے اور مجھے بریڈلاف کی وہ بھیگی ہوئی شام یاد آگئی جب ہم بیٹی کے کمرے میں آتش دان میں لکڑیاں جھونکتے ہوئے ادب اور تھیٹر پر زور دار بحث کر رہے تھے اور فریج میں سے ٹھنڈے خربوزے نکال کر کھا رہے تھے۔ گلوریا نیویارک میں رہتی تھی اور اس شہر کو امریکہ کا نمائندہ شہر متصور کرتی تھی۔ میری سان فرانسسکو کی باسی تھی اور وہ اپنے شہر کو امریکی تہذیب کا اصل علمبردار سمجھتی تھی۔ جب دونوں میں کافی گرما گرمی ہو گئی، تو بیٹی نے ایک بھونڈا سا صلح جو قسم کا گانا شروع کر دیا اور دونوں اپنی اپنی کرسیوں سے ٹیک لگا کر بھڑ بھڑ جلتی آگ کا نظارہ کرنے لگیں۔

ایئرپورٹ بلڈنگ کے بڑے ہال میں ہم کھڑے اپنے سامان کا انتظار کر رہے تھے کہ میری نظر سرخ رنگ کے ایک نوٹس بورڈ پر پڑی لکھا تھا "جاپانی پسوؤں سے ہوشیار رہیئے۔ یہ پسو آپ کے سامان اور آپ کے کپڑوں سے چمٹ کر جہاز میں پہنچ جاتے ہیں اور وہاں سے دوسرے مسافروں پر منتقل ہو کر دور دراز علاقوں میں پھیل جاتے ہیں۔ ہم انہیں تلف کرنے کی حتی الوسع کوشش کرتے ہیں، لیکن آپ بھی ان سے ہوشیار رہیئے اور اس معاملے میں ہماری مدد کیجیئے۔"

گلوریا بیگم تمہارے شہر میں یہ پسوؤں کی کیا خبر ہے؟

میرا بکس آگیا اور میں اسے کندھے پر اٹھا کر بس پکڑنے نیچے پورچ میں چلا آیا۔

نیویارک کے بارے میں لڑکپن سے بڑے بڑے خواب دیکھے تھے اور اب یہ خواب اپنی اصل تعبیریں لے کر کوچ کے ساتھ ساتھ بھاگ رہے تھے۔ میرا خیال تھا۔ نیویارک کی سڑکیں شفاف اور یہاں کے گھر اجلے اجلے ہوں گے۔ سڑکوں پر بلا کی بھیڑ ہو گی۔ کوئی آدمی پیدل چلتا نظر نہیں آئے گا۔ ہر شخص نے بڑا طرح دار سوٹ پہن رکھا ہو گا۔ اور ہر میم نک سک سے درست فلم کی ہیروئن نظر آتی ہو گی۔ لیکن میرے خوابوں کی تعبیریں بھائیں بھائیں کرتی مجھے ڈرا رہی تھیں اور کوچ سڑک کا سینہ چاٹتی بھاگی، جا رہی تھی۔ کوچ میں سوائے میرے اور کوئی

غیر ملکی نہیں تھا۔ لیکن ہر ملکی میری طرح گردن گھما گھما کر باہر شہر کا نظارہ کر رہا تھا اور روشنیوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ایک بزنس مین گود میں سفری ٹیپ ریکارڈر رکھے چٹھیاں ریکارڈ کر رہا تھا۔ دوسرا اجنبی شیور سے اپنی ڈاڑھی بنا رہا تھا۔ ایک عورت اپنے ہینڈ بیگ کے آئینے میں مسلسل اپنی شکل دیکھے جا رہی تھی اور میں اس کی صورت کا نظارہ کر رہا تھا۔

ایئر ٹرمینل پر جس ٹیکسی والے نے مجھ پر رحم کھایا اور پچھلا دروازہ کھول کر مجھے اندر بیٹھنے کی دعوت دی، وہ چھ فٹ ڈیڑھ انچ کا ایک دبلا پتلا ادھیڑ عمر کا آدمی تھا، جس نے نہایت بوسیدہ برساتی پہن رکھی تھی اور جس کی ٹوپی کے کنارے میل سے چیکٹ ہو رہے تھے۔ جب ہم اس عمارت سے باہر نکلے تو اس نے آئینے پر نگاہیں گاڑ کر پوچھا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

میں نے کوٹ کی جیب سے میزبان حکومت کا وہ لمبا سا لفافہ نکالا جس میں میرے نیویارک ہوٹل کا نام اور پتہ درج تھا۔ میں نے کھنکار کر اور گلا اچھی طرح سے صاف کر کے نام اور پتہ تین مرتبہ بآواز بلند پڑھا، لیکن ٹیکسی ڈرائیور کا کوئی ردعمل معلوم نہ ہوا۔ اس نے موٹر چلاتے ہوئے ایک ہاتھ سٹیئرنگ سے اٹھایا اور پیچھے میری طرف بڑھا کر وہ کاغذ مجھ سے لے لیا۔ اس کا بازو بہت لمبا، ہاتھ بہت کرخت اور انگلیاں بے حد نوکیلی تھیں۔ ہوٹل کا نام اور پتہ پڑھنے کے بعد اس نے وہ کاغذ مجھے واپس کر دیا اور آرام سے موٹر چلانے لگا۔ باہر ٹھنڈی برفیلی اور تیز ہوا چل رہی تھی اور ٹیکسی کے کھلے شیشے میں سے کٹاریں مار رہی تھی۔ میں نے میٹر کی طرف غور سے دیکھا جو کھٹا کھٹ سینٹوں پر سینٹ بدلے جاتا تھا اور دوسری کھڑکی میں ڈالر اوپر ابھار رہا تھا۔ جب میٹر کی کھڑکی میں تیسرا ڈالر انگڑائی لے کر چیتے کی طرح لپکا تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ڈرائیور نے ہاتھ کا اشارہ دے کر بریکیں باندھیں اور ٹیکسی ہوٹل کے دروازے پر آن رکی۔ ٹیکسی کے رکتے دس سینٹ اور میٹر کی آنکھ میں آ کر چمکنے لگے میں نے جلدی سے اپنا سامان نکال کر بجری پر رکھا اور چار ڈالر کرخت ہاتھ میں تھما کر کہا "شکریہ"

باقی کی ریزگاری رہنے دیجیئے۔

دس فیصد ٹپ کے حساب سے کل تیس سینٹ بنتے تھے۔ لیکن ساٹھ سینٹ لوڑ میں نے خوفزدگی کے تحت ادا کر دیئے۔ مبادا کہیں وہ ڈرٹی سوائین وغیرہ کی گردان شروع کر دے۔

ہوٹل کا کاؤنٹر کلرک بہت شریف آدمی تھا۔ اس نے مسکرا کر مجھے سلام کیا اور کھلی ہوئی باچھوں کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ میں نے اسے اپنے نام بتاتے ہوئے کہا۔

"میری بکنگ ہے یہاں پر، اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی معرفت"

"ضرور ضرور" اس نے رجسٹر کے اوراق الٹتے ہوئے کہا: "یہ رہی آپ کی بکنگ:

پھر اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور پوچھا: "آپ پاکستان سے آئے ہیں؟"

"جی:"

"واہ وا، کیا کہنے پاکستان کے، بہت بڑا ملک ہے پاکستان، ہمارا دوست ہے ہمارے ہوٹل نے بڑی سروس کی ہے آپ کے ہم وطنوں کی"۔

"میرے ہم وطنوں کی" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں، آپ سڈکین کو جانتے ہیں؟ آپ کے ملک کا نامی گرامی مصور ہے"۔

"صادقین؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل" اس نے مسکرا کر کہا، "سادکین ہمارے ہوٹل میں کوئی دو مہینے رہا ہے پانچویں منزل پر۔ بہت نفیس آدمی تھا، بالکل آپ کی طرح۔ اس کے بال بہت لمبے تھے"۔ کلرک نے مجھے ہنسانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

یہ بات سن کر مجھے اس ہوٹل سے اپنے پن کی باس آنے لگی۔ کیا ہی اچھا ہوتا، میں نے اپنے دل میں کہا، اگر صادقین ان دنوں یہاں ہوتا۔ پھر مجھے اس بڑے شہر میں گھومنے پھرنے کی آسانی ہو جاتی۔ لیکن وہ لندن جا چکا تھا اور اب سوائے راشد صاحب کے یہاں اور کوئی سہارا نہ تھا، میں نے اپنا بکس اٹھایا، چابی لی اور نیگرو ملازم کے ساتھ لفٹ میں سوار ہو گیا۔ پانچویں منزل،

پر لفٹ رکی۔ نیگرو ملازم نے میرا بکس لفٹ سے نکالا اور ایک لمبی سی گیلری سے گزار کر مجھے کمرہ نمبر ۵۱۳ پہ لا کھڑا کیا۔ پھر اس نے چابی ڈال کر دروازہ کھولا میرا بکس اندر تپائی پہ رکھا اور کہا "وہ سامنے غسل خانہ ہے"۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا، پچاس سینٹ کا ایک سکہ جیب کے ایک کونے میں پڑا تھا، میں نے حوصلہ کر کے اسے باہر نکالا اور بسم اللہ کہہ کر نیگرو ملازم کے حوالے کر دیا۔ اس نے سکے کو دو تین مرتبہ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر اپنی ٹوپی اتاری اور دوبارہ سکے کو غور سے دیکھنے لگا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ گال کو دو تین مرتبہ یوں ہلایا جیسے گھوڑا ہنہنانے سے پہلے اپنے نتھنے پھڑکاتا ہے اور پھر اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کرنے لگا۔

پھر کھٹ سے پٹ پھڑا، قدموں کی چاپ سنائی دی اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ نیگرو ملازم جا چکا تھا۔

یہ آٹھ ڈالر روز کا ایک سستا سا کمرہ تھا۔ خاصا کشادہ اور ہوا دار۔ ایک کھڑکی کمرے میں تھی، دوسری غسل خانے میں۔ دیواروں پر بسکٹی رنگ کا روغن پھرا تھا اور کھڑکیوں کے سامنے گہرے رنگ کے دبیز پردے لٹک رہے تھے۔ پلنگ کے سرہانے چھوٹی سی تپائی پر پرانی وضع کا فون رکھا تھا اور کونے میں ایک فریج پڑا تھا۔ لکھنے کی میز پر قلمدان میں نیلے اور سرخ رنگ کے دو قلم ایستادہ تھے، لیکن دواتوں میں روشنائی نہیں تھی۔ درازوں میں ہوٹل کے چھپے ہوئے کاغذ اور لفافے تھے اور ان کے نیچے سیاہ رنگ کے چھوٹے چھوٹے بیج سے بکھرے ہوئے تھے۔

میں نے دانت صاف کیے، منہ دھویا، بوٹ اتارے اور پلنگ پر الٹی پالتی مار کے وہ تھیلا کھولا جس میں پنیر اور سیاہ رنگ کی ڈبل روٹی تھی۔ نانِ جویں اور سوکھے پنیر کے لقموں کو زہر مار کرنے کے بعد، ٹونٹی کا ٹھنڈا پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کر کے نیچے کافی پینے چلا گیا۔

انیسویں گلی روشنیوں سے بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ گاڑیاں ایک دوسری کے پیچھے چیختی چنگھاڑتی جا رہی تھیں اور پٹڑی پر جوتے پالش کرنے والے اپنے اڈے جمائے بیٹھے تھے۔ شام کے

اخبار دھڑا دھڑ بک رہے تھے اور قہوہ خانوں اور ریسٹورانوں کے اندر کھانا کھانے والے اشیائے خوردنی کے ٹرے اٹھائے خالی میز کی تلاش میں دیواروں کے ساتھ ساتھ چکر لگا رہے تھے۔ ہوٹل کے پہلو میں ایک آٹومیٹک میں داخل ہو کر میں نے سیاہ کافی کی ایک پیالی لی اور اس میں آٹھ چمچ چینی کے ڈال کے وہ شیرہ پی گیا۔ اس سے تھکن بھی کم ہوئی اور رات کے کھانے کا بھرم بھی رہ گیا۔

آدھی رات کے وقت میرے خوابوں کے جزیرے میں گڑگڑاہٹ سی ہوئی اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ مجھے یوں لگا۔ جیسے مین ہٹن میں زلزلہ آگیا ہو اور فلک بوس عمارتوں نے بے بس ہو کر ایک دوسری سے سر ٹکرایا ہو۔ میں خوف سے کانپنے لگا اور اس کے ساتھ ہی میرا پلنگ لرزنے لگا آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی اور جب تک آنکھیں نہیں کھلتی تھیں اس وقت تک پلنگ کا رعشہ کم ہونے کی امید نہیں تھی۔ اچانک پھر دھڑ پھڑ پھٹاک اور گھر گھر کی آواز آئی اور آتی چلی گئی۔ کمرے کے کونے میں رکھا ہوا پرانا فریج چل رہا تھا اور اس کی آواز سے سارا کمرہ گونج رہا تھا۔

میں نے بستر سے نکل کر فریج بند کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا سوئچ کہیں نظر نہ آیا۔ تار نیچے کے پلگ میں لگی تھی اور اس کا کوئی بٹن نہیں تھا۔ فریج اس قدر بھاری تھا کہ اکیلا میں اسے ہلا نہیں سکتا تھا اور اندر اس کا ریگولیٹر خراب تھا۔ میں نے اس کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔ چھوٹے سے بلب کی پیلی پیلی روشنی سارے کمرے میں پھیل گئی۔ فریج خالی تھا اور اس کے خانوں میں کوزہ مصری کی سی برف جمی ہوئی تھی۔ اس کوزہ مصری میں بیئر کی بوتل کے دو ڈھکنے پھنسے ہوئے تھے اور ان کے نیچے کین اوپنر کی ایک چھوٹی سی قبر تھی۔ کین اوپنر کا ایک بازو سنگ مرمر کے تعویذ سے باہر تھا اور ہچکاک کی فلم کا ایک اہم حصہ نظر آتا تھا۔ میں فریج کے دروازے کو یونہی کھلا چھوڑ کر پھر اپنے بستر پر آلیٹا اور ایک سو اسی گننے تک سو گیا۔

کوئی گھنٹہ بھر بعد مجھے یوں لگا جیسے میرے پلنگ کی پائنتی کوئی چیز بھاگی پھرتی ہو۔ ننھی

سی سیماب یا خوفناک سی چیز۔ میں نے ایک آنکھ کھول کر فریج کی طرف دیکھا۔ اس کی بہت سی برف پگھل چکی تھی۔ شاید سنگِ مرمر کی تربت سے آزاد ہو کر کین اوپنر ادھر ادھر پھدک رہا ہو۔ آخر ایسے محیر العقول واقعات رونما ہوتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن وہ کین اوپنر نہیں تھا۔ ایک جمبو سائز چوہا تھا جو قالین پر پڑے ہوئے میرے چمڑے کے تھیلے کو کھدیڑ رہا تھا۔ جس میں نانِ جویں اور سوکھے پنیر کا لفافہ بند تھا۔ چوہے نے ایک نظر میری کھلی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھا اور پھر زقند لگا کر لکھنے والی میز کے نیچے بھاگ گیا۔ اس وقت مجھے سمجھ آئی کہ ہوٹل کے چھپے ہوئے پیڈ اور لفافوں کے نیچے کالے کالے بیج سے کیا تھے۔

اگلے دن صبح سویرے پانچویں اے وینیو پر چلتے ہوئے میرے قدم بٹر ٹری پہیوں پر پڑ رہے تھے، جیسے میں کہکشاں پر چلا جا رہا ہوں اور میرے ہم وطن اپنے ملک کے دونوں حصوں میں نیچے کھڑے مجھے حسرت اور چاہ کی نظروں سے دیکھ رہے ہوں۔ اپنی برتری کا احساس مجھے اوپر ہی اوپر لیے جا رہا تھا اور ان لوگوں پر مجھے مسلسل ترس آ رہا تھا، جنہوں نے امریکہ نہیں دیکھا اور ان لوگوں سے میری ہمدردی بڑھتی جا رہی تھی، جنہوں نے فلموں میں ہالی وڈ، شکاگو اور نیویارک کو دیکھا تھا اور ان کی کراچی تک پہنچنے کی بھی استطاعت نہیں تھی۔ اپنی جملہ صلاحیتوں پر ناز کرتا اور اپنی خوبیوں کو سراہتا، میں ناک کی سیدھ یو این او بلڈنگ کی طرف چلا جا رہا تھا اور کسی سے آنکھ تک نہیں ملاتا تھا۔

یو این۔ او کی عمارت دیکھ کر خوشی سے میری چیخ نکل گئی۔ اس وقت مجھے اپنی برتری اور عظمت کا اور بھی احساس ہوا۔ کہاں ہیں وہ لوگ جو صرف ٹکٹوں، کیلنڈروں اور ہوائی کمپنیوں کے اشتہاروں پر ہی اس عمارت کو دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے انکوائری سے ن۔ م راشد صاحب کا پتہ پوچھا اور لفٹ پکڑ کر اکیسویں منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

راشد صاحب اپنے کمرے میں کاغذات پر جھکے بیٹھے تھے۔ ان کی فلیٹ کونے کے میز پر پڑی تھی اور ان کی سیاہ برساتی کھونٹی سے لٹک رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کرسی سے

اُٹھے اور فارسی کا ایک شعر پڑھا۔ میں نے مسکرا کر شعر ٹال دینا چاہا، تو انہوں نے کہا۔

"فارسی سمجھتے ہو؟"

"میں نے کہا۔ جی، کم کم"

"فرمانے لگے۔ پھر تمہاری آدھی عمر ضائع ہو گئی"۔

مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ ابھی میری آدھی عمر باقی ہے۔

"پھر انہوں نے پوچھا۔ کہو نیویارک پسند آیا؟"

"میں نے کہا" جی بہت"۔

کہنے لگے "کھلیں کچھ آنکھیں؟"

میں نے کہا۔ جی بہت"۔

"اب احساس ہوا ہے کہ تم کہاں رہتے ہو؟"

"جی بہت"۔

"اور سناؤ لاہور کا کیا حال تھا؟"

"بہت اچھا تھا جی — اسمبلی کے پہلو میں ایک آٹھ منزلہ عمارت بن رہی ہے"۔

"آٹھ منزلہ" انہوں نے قہقہہ لگایا "بہت ترقی کر رہا ہے ہمارا شہر"۔

راشد صاحب کے کمرے کی کھڑکیاں باہر کھاڑی کے نیلے پانیوں پر کھلتی تھیں۔ باوجودیکہ دریچے اچھی طرح سے بند تھے، پھر بھی نسیم سحری کی خوشبو اندر کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں شیشوں میں سے باہر مٹیالی عمارتوں اور کالا سیاہ دھواں چھوڑتے دخانی جہازوں کو دیکھ رہا تھا کہ راشد صاحب نے کہا "دیکھو ادھر، وہ سامنے"۔

ایک موٹر لانچ بجلی کی سی تیزی سے نیلے پانیوں پر پھسلتی جا رہی تھی۔

کہنے لگی "یہ نئی ایجاد ہے کشتی پانی پر نہیں پانی کی سطح سے دو فٹ اونچا چلتی ہے"۔

میں سکتے میں آ گیا۔ واقعی موٹر بوٹ پانی کی سطح سے دو فٹ اوپر بھاگی جا رہی تھی۔ راشد

صاحب نے کہا۔

"اب آیا ہوش، سمجھے کہاں ہو؟"

"میں نے کہا "جی ہاں"۔

پھر ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور جب ان کی میز پر ڈاک کا نیا پلندہ آگیا تو میں اگلے دن پھر آنے کا وعدہ کرکے نیچے اتر آیا۔

باہر بڑی مزے دار دھوپ پھیلی تھی اور یو۔ این۔ او کی عمارت کے سامنے سڑک کے پار لکڑی کے بنچوں پر اکا دکا فارغ لوگ بیٹھے تھے۔ میں بھی سستانے کی غرض سے ایک بنچ پر جا بیٹھا۔ دوسرے کونے پر ایک بوڑھا نیگرو آنکھوں پر فیلٹ گرائے، دونوں ہاتھوں کی کنگھی گود میں ڈالے نیم دراز تھا۔ میں نے تھیلے میں سے اپنی بیوی کا خط نکالا اور بچوں کی رنگین تصویریں دیکھنے لگا، جو انہوں نے میری غیر موجودگی میں شالامار جاکر خاص میرے لیے اتروائی تھیں۔ شالامار کے وسیع و عریض قطعہ ہائے سبز پر میرے اور میرے بھائی کے بچے لڈی ناچ، ناچ رہے تھے۔ "شکر بھجی" کھیل رہے تھے درختوں پر چڑھے ہوئے تھے ایک دوسرے کو پھولوں کی چھڑیاں مار رہے تھے۔ بنچ کے دوسرے کونے پر بیٹھے ہوئے سال خوردہ نیگرو کو کھانسی کا دورہ پڑا اور اس نے پٹاخ سے اپنے سامنے تھوک دیا۔ بلغم بھرے تھوک میں چونّی بھر سیاہی مائل خون کا دھبہ تھا۔ میں نے ڈر کر گھبرا کر اور گھن کھا کر تصویروں کا لفافہ بند کیا اور اسے تھیلے میں ڈال کر سامنے آکر رکنے والی بس میں سوار ہو گیا۔

بس کے اندر مختلف تجارتی اداروں کے بڑے خوبصورت اشتہار لگے تھے بیچ بیچ میں حکومت کے محکمہ تعلقاتِ عامہ کے پلے کارڈ بھی تھے۔

اچھی صحت مند اور ستھری غذا کھائیے۔"

"اپنے آپ کو تپ دق سے محفوظ رکھیے، یہ موذی مرض ہر سال ہزاروں امریکیوں کی جان لے لیتا ہے۔"

تپ دق کے خلاف جہاد کیجئے۔ خود ٹیکہ لگوائیے، دوسروں کو اس کی ترغیب دیجئے۔"

ایک خوبصورت سا لڑکا، جزدان کندھے پر ڈالے سکول جا رہا تھا۔ نیچے لکھا تھا۔ اسے دودھ اور تازہ پھلوں کی ضرورت ہے۔ اس کی ضرورت کا خیال رکھئے۔ امریکہ کو صحت مند بنائیے۔

جب یہ بس مجھے میری منزل انیسویں گلی کے ہوٹل پر لے جانے کی بجائے کہیں اور ہی لے جاتی نظر آئی، تو میں اگلے سٹاپ پر اتر گیا۔ اس بھرے پرے شہر میں نیا ہونے کی وجہ سے میں کچھ گھبرایا ہوا سا تھا اور راستہ بھولنے کی وجہ سے میری کیفیت کچھ اور بھی احمقوں کی سی ہو رہی تھی۔ اچانک دور سے ایک مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔

اس نے ٹوپی اٹھا کر مجھے سلام کیا اور بڑی خندہ پیشانی سے میری طرف بڑھا۔ میرے قریب پہنچ کر اس نے میرے کان کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

"ایک ڈائم جناب عالی"

میں نے کہا "کیا مطلب"

کہنے لگا "ایک ڈائم خدا کے نام پر"

میں نے سرخ و سفید چہرے، کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی اور جسم پر درمیانے درجے کے سوٹ کو دیکھ کر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"تم فقیر ہو"

اس نے سر کو ہلکے سے جھٹک کر جواب دیا "یس سر"

میں نے کہا "تم کوئی کام کیوں نہیں کرتے ہو؟"

"کام! وہ زور سے ہنسا اور پھر سرگوشی کے لہجے میں بولا" کام کرنا مجھے پسند نہیں — فضول واہیات — لائیے ایک عدد ڈائم عنایت فرمائیے"

"میں نے کہا، تمہاری بیوی بھی کام نہیں کرتی؟"

"کرتی ہے" اس نے میرے کندھے پر محبت سے ہاتھ رکھ کر کہا "لیکن وہ گندے کام کرتی ہے۔ لائیے ایک ڈائم عنایت فرمائیے۔"

اس کے بعد میں نے کچھ اور پوچھنے کی جرأت ہی نہ کی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں اس سے کچھ اور پوچھتا تو وہ ایک خارا شگاف چاقو میرے پیٹ میں اتار کر کہتا۔

"حرامزادے، بکواس ہی کئے جاؤ گے یا کچھ دو گے بھی۔"

نیویارک کا فقیر پاکستانی فقیر سے ایک ڈائم لے کر چلا گیا۔

رات کے گیارہ بجے میں نے اپنا تھیلا کھولا، اس میں سے نیلے رنگ کا پیڈ نکالا اور اپنے ہوٹل کی لکھنے والی میز پر ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس رکھ کے ریاض کو خط لکھنے لگا۔

"نیویارک کی ایک اپنی فضا، ایک اپنی بوباس ہے جو دنیا کے کسی اور شہر میں نہیں ملتی اس وقت میں ہلٹن کی بار میں کٹ گلاس کا جام تھامے تمہیں یاد کر رہا ہوں۔ یہ کاک ٹیل پارٹی میرے اعزاز میں ٹائم اینڈ لائف کے ایک ڈائرکٹر نے دی ہے۔

ہال کی مدھم روشنیوں میں دھوئیں کے مرغولے بل کھا رہے ہیں اور جوڑے رقص کر رہے ہیں۔ نیویارک کے باہر کی بوباس یہاں اندر بھی ہے۔ جسموں کی گرمی اور سانسوں کی لہک نے ایک عجیب جادو جگا رکھا ہے۔ سامنے پیلی پیلی روشنی کے گول گول ہالوں میں ساٹھ پیس کا آرکسٹرا بج رہا ہے اور چبوترے پر چنچل لڑکیاں ہلا گلا ڈانس کر رہی ہیں۔ نغمہ و ساز ندوں کے ماتھوں پر پسینے کی بوندیں چمک رہی ہیں۔ ہم نے ابھی میکسی کن مصالحے دار خوراک کھائی ہے اور اب ہم بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ جب کبھی دروازے پر اطلسی پردہ کھلتا ہے، تو باہر کے بلند و بالا کاخ و کو نظر آجاتے ہیں۔ نیویارک اونچی عمارتوں اور اونچی امارتوں کا شہر ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس خوابوں کے جزیرے میں ہر شخص کے ہاتھ میں الٰہ دین کا چراغ ہے۔ جو چاہتا ہے، مانگتا ہے، مل جاتا ہے۔ برتھا ڈائرکٹر کی لڑکی ہے۔ برتھا کے بال ریشم کے سے اور آنکھیں

زمرد کی سی ہیں۔ وہ نیلے رنگ کا ریشمی رومال سر پر باندھ کر سُرخ رنگ کی تھنڈر برڈ چلاتی ہے۔ اس نے ابھی ایک خالی چیک پر دستخط کر کے اسے زبردستی میری جیب میں ٹھونس دیا کہ جتنی رقم کی ضرورت ہو، اس میں بھر لینا.....

میں ابھی یہ خط یہیں تک لکھ پایا تھا کہ کل رات والا چوہا میز کے نیچے سے بے باکانہ نکل کر میرے پلنگ کے پاس گھومنے لگا۔ میں نے جو گردن گھما کر اسے غور سے دیکھا، تو وہ ہڑبڑا کر بھاگا اور ایک ہی جست میں پھر میز کے نیچے جا چھپا۔ میں نے اپنا تھیلا اچھی طرح بند کر کے اُسے کھونٹی پر لٹکا دیا۔

مجھے معلوم ہے وہ نانِ جویں اور سوکھے پنیر کی تلاش میں آیا تھا۔

عرشِ منوّر

دونوں موٹی عورتیں مزے سے خراٹے لے رہی تھیں۔ کیوسین پادری نے ایک آنکھ کھول کر میری طرف دیکھا اور اپنی وزنی تسبیح کی صلیب پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "سردی" میں نے مسکرا کر سر کے اشارے سے جواب دیا "بڑی مزیدار ٹھنڈی ہوا ہے پادری جی — تم پردیسی ہو تم کیا جانو نسیم سحری کسے کہتے ہیں" پادری نے آنکھیں موندے ایک لمبی سی جمائی لی اور سونے کی ناکام کوشش میں اس کا نرخرہ چک لونڈے کی سی آواز نکالتا جھوٹلے سے فولادی پسٹن کی طرح اوپر نیچے تیزی سے ہلا۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا — تمناؤں کی بستی میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ وہ دن جب یاد آتے ہیں کلیجہ منہ کو آتا ہے — انجن نے دہکتا ہوا ایک بڑا سا کوئلہ اگلا اور میں نے سر اندر کر لیا۔ جوان موٹی عورت نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے کنگھی بنا کر سوتے میں یوں تن کر انگڑائی لی کر اس کی باہنوں کی محراب اوپر سامان رکھنے والے تختے تک پہنچ گئی۔ سوئے سوئے پادری کی ٹانگ ہلنے لگی۔ بوٹ تیرا چمکے وے۔ رومال تیرا مہکے وے۔ رومال تیرا مہکے وے — دل کے کھوٹے کیوسین نے اپنی پوشاک درست کرتے ہوئے کہا: "کھڑکی بند کر دیں"!

میں نے بے چارگی کے عالم میں کھڑکی کی طرف دیکھا تو جوان موٹی عورت نے کالی بھونرا سی آنکھیں کھول کر کہا "کھڑکی بند نہ کرنا۔ پردہ البتہ کھینچ لو —"

میں نے تعمیل ارشاد میں گہرے سبز رنگ کا موم جامہ فوراً کھینچ کر عورت کی طرف مسکرا کے دیکھا مگر وہ خراٹے لے رہی تھی اور پادری خارپشت کی سی تھوتھنی نکالے جوں جوں بوٹ چوسچا رہا تھا۔

ہوا کی تیزی سے موم جامے کی لمبائی کے اضلاع کمان سی بنے ہوئے تھے اور ان کے لطیف خم سے میرے وطن کی ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ چھوٹا سا ڈبہ مدھم سا بلب آٹھ سواریاں ــــ طول جمع عرض ضرب دو ضرب بلندی ــ ٹھنڈی ہوا کتنی زیادہ تھی کیسی بھرپور تھی۔ کس قدر روح پرور! کمان کے خم سے ایک اور دہکتا ہوا کونا نظر آیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا.... سوچنے لگا..... کہ.....

پلیٹ فارم پہ کوئی سبز بتی ہوا میں لہرا رہا تھا۔ کوردوبا! کوردوبا!!

میں ہڑبڑا کر اٹھا - اٹیچی کیس سنبھالا تھیلا بغل میں دبایا اور دروازے کی طرف لپکا۔

"خوش وقتی! خوش بختی!" موٹی مائی نے کہا۔

"شکریہ" میں نے جواب دیا۔

"چین کی راتیں مزے کے دن" جوان موٹی عورت نے کہا۔

"شکریہ"

"نیک نصیحت" پادری صاحب نے دعا دی۔

پھر دعاؤں اور شبھ کامناؤں کا ایک سلسلہ چل نکلا اور میں تیزی سے شکریہ شکریہ پکارتا ٹرنک گٹھڑیاں پھلانگتا پلیٹ فارم پہ اتر آیا۔

صبح کاذب کا سماں۔ مٹیالے پلیٹ فارم پر کوئی پچیس واٹ کا ایک ہی بلب اور کتابوں کے بند سٹال پر ٹانگیں لٹکائے سٹیشن کا مختصر سا عملہ ان دو قلیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جنہوں نے اِدھر اُدھر سے میرے بازو تھام رکھے تھے اور مجھے اپنی اپنی طرف گھسیٹ رہے تھے اور تیسرا آرام سے میرا اٹیچی اور تھیلا ہاتھ میں لٹکائے بڑی دور چلا جا رہا تھا۔ میں انہیں سر اور ہاتھوں حتیٰ کہ ٹانگوں کے اشاروں سے سمجھا رہا تھا کہ میں ہسپانوی نہیں جانتا۔ مگر وہ مجھے کشاں کشاں اس تیسرے قلی کی طرف لیے جا رہے تھے جو اب نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ جب وہ دونوں سے نیورا ہے نیورا!! کے نعرے لگاتے گرم گفتاری پر اتر آئے تو میرے بازوؤں نے ان کی گرفت کو قدرے

نرم پایا۔ بیشتر اس کے کہ میں خود ہمت کرتا وہ ہاتھا پائی پر اتر آئے اور میرے بازو چھوڑ دیئے۔ موقع غنیمت جان کر میں مٹیرے کے پیچھے بھاگا اور اس سے جا کر وہ تھیلا لے لیا جس میں پاسپورٹ اور سرکار ہسپانیہ کے چند نہایت اہم حکمنامے تھے۔

قلی کے مشورے سے ——— بابو صاحب کو ایک پیسیتا محنتانہ دے کر اٹیچی کیس کلوک روم میں رکھوایا اور خود سٹیشن کے عین سامنے گرامی پلاٹ سے گزر کر اس اکلوتے ریستوران میں جا بیٹھا جس کی بتیاں روشن تھیں۔

یہ کچھ ایسا شیشوں آئینوں اور رنگ برنگی تصویروں والا ریستوران نہ تھا۔ جیسے گوالمنڈی یا بھاٹی دروازے کے باہر موجود ہیں۔ بلکہ ایک وسیع دالان تھا جس کے ایک کونے میں جیبس کا کونٹر تھا۔ دوسرے میں لکڑی کے تین کیبن اور باقی کے کشادہ فرش پر لکڑی کی گول اور چوکور تپائیاں اور ٹین کی کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک تپائی کے گرد پانچ چھ مزدور جمع تھے اور چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ایک موسیقار گٹار پر دھنیں بجا رہا تھا۔ کونے سے ایک کرسی کھینچ کر میں اس گول تپائی کے قریب بیٹھ گیا جس پر دودھ کافی اور چینی کی گاڑھی سی تہہ چڑھی ہوئی تھی اور اس میں کل شام کی دو صحت مند مکھیوں کی لاشیں پھنسی ہوئی تھیں۔ میں نے شرلک ہومز کی طرح اس تپائی کا جائزہ لیا — ایک شرابی قلی اس پر کافی پی کر گیا تھا — باہر گرامی پلاٹ کے پیچھے قرطبہ کا سٹیشن صبح کاذب کی ناکافی روشنی میں فلمی ڈزولو سے برآمد ہو رہا تھا — مجھے یوں لگا جیسے میں واپس گاؤں پہنچ گیا ہوں۔ چھوٹی پٹڑی کی گاڑی کا مختصر سا سٹیشن شیشم کے پیڑوں میں چھپا ہوا میری طرف جھانک رہا تھا۔ کمیٹی کے نل کے پاس مرنڈے خطائیاں بیچنے والا بڈھا اپنے سودے کو کھجور کی پنکھی جھل رہا ہے اور ٹھنڈا سوڈا واٹر کا مریل لڑکا پھٹی ہوئی نیکر پہنے گولی والی بوتلوں کو بھورے رنگ کے گیجنے برش سے دھو رہا ہے۔ سٹیشن کے پچھواڑے روئی کی گانٹھیں باندھنے والے پریس سے بہت دور نہر کا بنگلہ ہے۔ جہاں گراموفون کی طرح چابی گھمانے والا ٹیلیفون

لگا ہے برآمدے میں سفید پگڑیاں باندھے پنسال نویس اپنے رجسٹر بھر رہے ہیں اور نہر کے اس پار قصبے کا قبرستان ہے۔ جہاں میرا دادا دفن ہے۔ میرا پڑدادا عالمگیر کی شاہی فوج میں ایک معمولی سپاہی تھا جس نے پیرانہ سالی کے باوجود تلوار چلانے اور وار روکنے میں وقت کے جیدار نوجوانوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ وہ پنج وقتہ نمازی جو زرہ پہنے اور ہتھیار سجائے دن بھر باوضو رہتا۔ آدھی رات کے بعد کمربند کھول کر تہجد گزاری میں مشغول ہو جاتا۔ اس سپاہی کے گھر اس سرہنگ زادے نے جنم لیا جو تنومند دراز قد اور قوی الجثہ ہونے کے باوجود ایک عاشق کا دل لے کر آیا۔ جب میر منقی اپنے بیٹے کو خلوت میں عشق کرنے کی تلقین کر رہے تھے اس سرہنگ زادے نے ان کی گفتگو سن لی تھی اور تیغ و سناں کو علم و دانش کی محبوبہ کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ ایک دن جب بیٹے سے بائیں پاؤں پر گھوم کر والد کا وار روکا نہ جا سکا تو پڑدادا نے ٹھنڈی سانس بھر کر اس ناخلف کو مکتب کے حوالے کر دیا۔ پندرہ سولہ برس بعد جب باپ کو اپنی قوتِ بازو اور پامردی پر بھروسہ نہ رہا تو اس نے بیٹے کے لیے ایک مناسب بَر ڈھونڈا اور ہمیانی کھول کر شادی کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ جب حسن پرست اور صاحب جمال بیٹے کو اپنی اس نسبت کا علم ہوا تو وہ شادی سے اس لیے منحرف ہو گیا کہ زشت رو رفیق سے غربت کے خارزاروں میں عمر بھر اکیلے بھٹکنا کہیں بہتر ہے۔ سپاہ عالمگیر کے معرکہ آرا بڈھے سپاہی نے بیٹے کو سمجھانے کی غرض سے ساتھ لیا اور قصبے سے دور کھیتوں میں نکل گیا۔ گھر بسانے اور کنیت کا تصور زندہ رکھنے کے لیے پیر مرد نے جتنی بھی درخواستیں بیٹے کے حضور میں گزاریں ابن رشد اور غزالی کے قاری نے انہیں براہین و دلائل سے باطل کر دیا۔ ببول کے جھنڈ خار مغیلاں کے جانکاہ بستر پر تجربہ کار بڈھے سپاہی نے مکتب کے شوخ طفل کو ایک ہی داؤ میں آہو بچے کی طرح گرا لیا اور اس کی چھاتی پر سوار ہو گیا۔ زنگ آلود پیش قبض پہلو سے نکال کر اس کے حلقوم پر رکھ دیا اور گرج کر پوچھا "بول شادی کرے گا یا نہیں" اس نے سر ہلا کر اقرار کیا۔

ایجاب وقبول کا سلسلہ چلا اور میری دادی عالمگیر فوج کے رزم آرا بڈھے سپاہی کی بہو بن کر اس کے گھر آ گئی۔ کوئی چھ مہینے تک دادا اپنے باپ اور بیوی کے ساتھ ہمارے آبائی گھر میں رہے اس کے بعد الازہر کی مطبوعہ کتابوں کا ایک ڈھیر گھر پر چھوڑ کر دکن بھاگ گئے، جن دنوں وہاں ڈپٹی نذیر احمد حفظ کلام پاک میں مصروف تھے۔ دادا جان ہائی کورٹ میں وکالت کا امتحان پاس کر رہے تھے۔ گو میرے والد اور میری دادی کو خرچ برابر پہنچ رہا تھا مگر اس بات کی توقع گاؤں بھر میں کسی کو بھی نہ تھی کہ وکیل صاحب کبھی خود بھی گھر پہنچ جائیں گے۔

دکن میں موسیٰ ندی کی طغیانی سے جہاں اس قدر نقصان ہوا وہاں بس یہی ایک فائدہ نہیں ہوا کہ گلشن ہند کا مسودہ منظر عام پر آ گیا بلکہ یہ بھی ہوا کہ ہمارے دادا فالج کے مرض میں مبتلا ہو کر محض اس لیے واپس گاؤں آنے پر مجبور ہو گئے کہ ان کا اکلوتا بیٹا خود چل کر انہیں لینے آیا تھا۔

ہم سب بھائی اپنے دادا کی قبر پر پودے لگانے جاتے۔ اور نہر سے کنستر بھر بھر کر ان کی قبر پر پانی چھڑکتے تھے۔ پھر ہمارا ایک چھوٹا بھائی مر گیا تو ہم نے اس کی قبر دادا کے پہلو میں بنوائی اور اس کے سرہانے گیندے کا ایک پودا لگایا۔ جب تک ہم چھوٹے تھے اپنے دادا کی قبر پر اکثر جایا کرتے جب ذرا بڑے ہوئے تو یہ زیارت صرف تہواروں تک محدود ہو کر رہ گئی اور جب ہماری زندگیوں میں مصروفیتوں اور دلچسپیوں کے تصور نے اپنے جال پھیلائے تو ہم نے قبرستان جانا بالکل ترک کر دیا۔

قرطبہ کے سٹیشن سے پرے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے نہر کا ایک بنگلہ ہے بنگلے کے ساتھ نہر بہہ رہی ہے۔ اس کے ساتھ قبرستان میں میرے بھائی اور دادا کی قبریں ہیں اور ان کے ساتھ اور بہت سے ایسے لوگوں کے مدفن ہیں جنہیں میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جن سے میں بارہا ملا تھا یا جن کے متعلق میں نے اپنے والد، اماں اور نانی سے بہت کچھ سن

لکھا تھا۔ سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے اور در در کی ٹھوکریں کھانے کے بعد آج بڑی مشکل سے اپنے گاؤں پہنچا تھا اور میرے اپنے گاؤں کے لوگ جنہوں نے ہمارے چلے جانے کے بعد ہماری ہر چیز پہ قبضہ کر لیا تھا۔ شک اور حیرت کی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ جیسے مجھے پہچان کر اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہوں کہ نہیں یہ وہ نہیں ہو سکتا بھلا اس میں وہ جرأت کہاں کہ ہماری سرزمین پر قدم رکھ سکے۔ ہماری مملکت کی سرحدوں کو چھو سکے:

چیتھڑوں اور پیوندوں کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے ہسپانوی موسیقار ابھی تک گٹار بجا رہا تھا اور مزدور اپنی اپنی کرسیوں پہ رات کا خمار آنکھوں میں دبائے جھوم رہے تھے دفعتہً گٹار بجانے والے مست ملنگ نے نگاہیں میری طرف پھیریں اور اپنا ساز کرسی پر چھوڑ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا میرے سامنے آکھڑا ہوا۔ کھردرے ہاتھوں سے دو مرتبہ تالی بجا کر اس نے کندھوں کو زور سے جھٹکا اور پھر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ اس کی آواز پر دوسرے لوگ بھی کھلکھلا کر ہنس دیئے اور میں نگاہیں نیچی کرکے جیبیں ٹٹولنے لگا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر کارمن خانہ بدوشوں کی طرح تالی بجائی اور ایک جھرجھری لے کر سرد قد ساکت ہو گیا۔ ریستوران کے لڑکے نے میری طرف دیکھا۔ آگے بڑھ کر گیلے کپڑے سے میز صاف کی اور سر اور کندھے جھکا کر پوچھا "کافی سے نیور؟"

موسیقار ایک بار پھر تڑپا اور اپنی کمر کو گرمٹ برمے کی طرح دو بل دے کر زور سے پکارا "اولے"۔

دور بیٹھے مزدوروں نے ایک ساتھ تالی بجائی اور پکارے کافی! کافی!! کافی!!!

ہسپانوی موسیقار چٹکیاں بجاتا ہوا میرے گرد گھومنے لگا جیسے مگس کے گرد تار بُن رہا ہو۔ کمر لچکاتے کندھے سکوڑتے پھٹے بوٹ کی ایڑیاں زمین پر بجاتے اس نے تین چار چکر میری میز کے گرد لگائے۔ پھر رک گیا۔

مزدور ایک ساتھ تالی بجا کر پکارے : کافی ! کافی !! کافی !!! موسیقار نے میرے سامنے اپنی ہتھیلیاں میز کے دونوں کناروں پر رکھ دیں اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ یہ دیدہ رنگ دریدہ چشم قلندر کی نگاہ میرے دل میں خسرو کی نعت بن کر چھری کی طرح اتر گئی۔ مجھے یوں مضطرب دیکھ کر اس نے ایک مرتبہ پھر سر جھٹکا اور زور سے پکارا" اولے "

مزدوروں نے قہقہہ لگا کر اور زور سے تالیاں بجائیں اور ان کی آواز گویا مسجد قرطبہ کی محراب میں قرأت بن کر گونجی۔

موسیقار پنجوں پر تھرکا۔ ایڑیوں پر سنبھلا اور اپنے دونوں بازو بسک پیر طائر کی طرح پھیلا کر میری طرف اُمڈا۔ مزدور اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے ہو کر مسکرانے لگے۔ گدڑی پوش جیسے سماع کی محفل میں طالب صادق کی طرح تڑپنے لگا۔ دونوں ہاتھوں سے تیز تیز چٹکیاں بجاتا چلنت لے میں ہسپانوی گیت گاتا وہ میری طرف سے گھور گھور کر دیکھنے لگا۔

مزدور چلائے : کافی ! کافی !! کافی !!!

میں نے خوفزدہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

ہاکوب درویش میری جانب بڑھا چلا آ رہا تھا اور صلح کل لوگوں کی مجلس کو اکسا رہا تھا۔

کون آیا پہن لباس کُڑے   تسیں پچھو نال اخلاص کُڑے

جب اس کی پاٹ دار آواز عین میرے سر پہ گونجنے لگی تو میں نے آنکھیں کھول کر اس طرف دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے مزدوروں کی طرف اشارہ کرتا اور پھر انہیں میری جانب سے اکساتے ہوئے، گویا کہتا :۔

چاک چاک کرنہ اسنوں آکھوں   اُمید نہ خالی گھبڑی گھاتوں

وچھڑیا ہویا پہلی راتوں   آیا کرن تلاش کُڑے

جب" آیا کرن تلاش کُڑے " کا نعرہ لگتا تو وہ اپنی تنی ہوئی بانہوں کی سیدھی

انگلیاں چلپنچوں کی طرح میری طرف تان دیتا۔

درویش کو پتہ چل گیا کہ یہاں میرے آب و جد دفن تھے اور رشتہ و پیوند کی یہ کشش مجھے اتنی دور کھینچ لائی تھی۔ آج سے چند صدیاں پیشتر واقعی میرا یہ لباس نہ تھا لیکن اب حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اور اپنی ذات چھپا کر میں چوروں کی طرح اسی گھر میں سیندھ لگانے آیا تھا جہاں ہم سب مل کر رہا کرتے تھے۔ میرا پڑدادا شہر کا کوتوال رہا تھا۔ میرا دادا قرطبہ کی دانش گاہ میں رومی قانون پڑھاتا تھا اور میرا باپ سلطانی بیطار تھا۔ بے چاری دادی سارا دن کھجوروں کا شیرہ تیار کر کے انہیں روغنی مرتبانوں میں بھرا کرتی اور اماں زیتون کا تیل بیچنے والی ان یہودنوں سے نجاے جھگڑا کرتیں جو بات بات پر لمبی لمبی قسمیں کھاتیں اور مرونگ ایسے مرتبانوں پر لمبے سے ہاتھ رکھ کر یونہی بے معنی سی ہنسی ہنسے جاتیں۔

میں نے اپنے کوٹ پتلون اور ٹائی کی طرف چور نگاہوں سے دیکھا۔ قدموں میں پڑے ہوئے چرمی تھیلے کو پیر سے پرے کھسکایا اور موقعے پر پکڑے جانے والے چور کی طرح ہسپانوی موسیقار کی طرف دیکھا۔ اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ منہ سے جھاگ بہنے لگا تھا اور وہ دم توڑنے لٹو کی طرح آخری چکر کاٹ رہا تھا۔ شاید اسے حال آ گیا تھا یا آنے والا تھا یا پتہ نہیں وہ اس کیفیت سے واپس گزر رہا تھا۔ میں نے اس خطرناک فضا میں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ آہستہ سے اپنا تھیلا اٹھایا اور چپکے سے باہر نکل آیا۔ ریستوران کا لڑکا دروازے کے باہر تک سے نیورا سے نیورا کرتا میرے پیچھے آیا لیکن میں نے پلٹ کر دیکھا نہ اس کی بات سننے کی کوشش کی۔

سورج کی پہلی کرنیں آسمان سے نیچے اتر آئی تھیں اور بڑی سڑک کے کنارے کھجوروں کے جھنڈ میں سے ہوتی ہوئیں زمین پر پہنچنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں بڑی اور عمر رسیدہ کھجوروں کے قدموں میں خرما کی نوخیز جھاڑیاں ان کرنوں سے بری طرح الجھی ہوئی تھیں۔

یہ سڑک خدا جانے کدھر جاتی تھی کدھر سے آتی تھی اور اس کے کنارے اللہ جانے

کن لوگوں کے گھر تھے۔ میں چلتا رہا چلتا رہا اور یہ امید بار بار میرے دل میں آپ سے آپ ابھرتی رہی کہ ابھی مجھے دریائے کبیر کا چوڑا چکلا پاٹ نظر آئے گا۔ ابھی اس پر جابی دار محرابوں کا پل دکھائی دے گا اور ابھی مجھے وہ منار بلند وہ جلوہ گر جبرئیل شفقت سے دیکھے گا جس کے قدموں میں مسجد قرطبہ اور اس کا صحن پھیلا ہوا تھا۔

راستے میں دودھ کے جستی کین لادے مجھے وہ گاڑی ملی جسے اعلیٰ نسل کا ایک عربی گھوڑا کھینچ رہا تھا۔ کوچوان مٹیالے رنگ کا بوسیدہ سوٹ پہنے آنکھوں پر غلیظ فیلٹ کھینچے گھوڑے کو قدم قدم چلا رہا تھا اور اس کے پیچھے ایک کسان لڑکی ہاتھ میں سبزی کی ٹوکری اٹھائے چلی آ رہی تھی۔ میں لمحہ بھر کو ٹھٹھکا اور دختر دہقان کے گیت پر کان لگا دیے۔ لڑکی کے ہونٹ بند تھے۔ آنکھیں ضرورت سے زیادہ کھلی تھیں۔ سکرٹ پر چکنائی کے داغ تھے اور سفید پنڈلیوں پر وہ ارغوانی نشان تھے جو پھلواڑی میں تازہ سبزیاں توڑتے ہوئے آپ سے آپ ابھر آتے ہیں۔ میں نے کہا یہ ضرور کسی بڑے گھر کی خادمہ ہے۔ اگر دختر دہقان ہوتی تو گیت گاتی ہوئی چلتی اور کوچوان کی چیکٹ فیلٹ اس کی آنکھوں پر یوں نہ کھنچی ہوتی!

دور سڑک کے اگلے موڑ پر دریائے کبیر کی مست رو لہروں پر سورج کی کرنیں بے تابانہ ناچ رہی تھیں۔ دریا کی چمکتی ہوئی سطح دیکھ کر میرے دل میں ایک ہی خوف کو موش کی طرح ادھر ادھر سر ٹکرانے لگا کہ اگر میں کنارے تک پہنچتا پہنچتا مر گیا تو کیا ہوگا! بالکل ایسے ہی ایک مرتبہ پہلے بھی یہی خیال میری جان کا لاگو ہو گیا تھا۔ جب میں تاج محل کی بیرونی ڈیوڑھی میں داخل ہوا تھا۔ اس دن تو جان بچ گئی تھی لیکن اب کے آثار کچھ اچھے دکھائی نہ دیتے تھے۔۔۔ میں نے جیب سے پیپر منٹ کی ایک گولی نکال کر منہ میں ڈالی۔ آنکھیں بند کیں اور سڑک کے کنارے سورج کی طرف منہ کر کے دو تین لمبی لمبی سانسیں لیں۔ دل کی دھڑکن جو پہلے بیچ میں ایک دو غوطے مار گئی تھی پھر استوار ہو گئی

اور میں دریا کی جانب چل پڑا ۔

سڑک کی سطح سے نیچے کوئی پندرہ بیس فٹ گہرے نشیب میں کسانوں کے چند کچے کوٹھے تھے جن پر لہریا ٹین کی چھتیں پڑی ہوئی تھیں۔ سورج کی روشنی میں ایک دوسری سے ملی ہوئی یہ چھتیں، دور سے بل کھاتا ہوا دریا دکھائی دیتی تھیں۔ آب رواں کبیر!

سان پابلو سڑک پر ایک معمولی سے "پانسی اون" میں مَیں نے ایک چھوٹا سا کمرہ لیا۔ ٹھنڈے پانی سے حجامت بنائی۔ لوہے کے تسلے میں ایلومینیم کے جگ سے سر کی دھول اور کانوں کی ریت صاف کی۔ دانت صاف کر کے پیپر منٹ کی ایک اور گولی منہ میں ڈالی اور تھیلا بستر پر چھوڑ کر نیچے مالکہ کے پاس پہنچ گیا۔ ضابطے کے مطابق تھانہ بھیجے جانے والے "مقصد تشریف آوری" کے دو فارم بھرے اور پاسپورٹ مالکہ کے حوالے کر کے سٹیشن سے اپنا اٹیچی کیس لینے چل دیا۔

صبح کے واقعہ سے ذہن پر ایک عجب کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ میں ہسپانیہ کی سیر کرتا یونہی اس تاریخی مقام پر آ پہنچا تھا۔ اس علاقہ کے کھنڈرات یا اس سرزمین کے تاریخی پس منظر سے مجھے کوئی قلبی یا روحانی تعلق نہ تھا۔ صحیح تعلیم نے ایسی بالغ نظر عطا کر دی تھی جو ہر چیز کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ یورپ میں دو سالہ قیام خاص طور پر مفید ثابت ہوا اور میں مذہب و مسلک کے فضول جھگڑوں سے اور بھی آزاد ہو گیا۔ انسانیت کے وسیع سمندر میں مذاہب کے چھوٹے جزیرے ترقی کے بڑے بڑے جہازوں کی راہ مارے ہے تھے اور میرے والدین کا مذہب ایسا تھا جو سب سے زیادہ تنگ نظر تکلیف دہ اور دراز دست نظر آتا تھا۔ اطالیا میں جب میرے آزاد خیال اور وسیع القلب مقامی دوست اس مذہب پر نکتہ چینی کرتے تو میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتا اور اس کی جزئیات پر تفصیل سے بحث کرتا۔ مگر آج صبح اس علاقے کی فضا نے پتا نہیں مجھ پر کیا جادو کیا کہ اسٹیشن پر اترنے سے پیشتر مجھے اس خطہ کی زمین آسمان نظر آنے لگی۔

سیدھی انگلی پر چابیوں کی زنجیر گھماتے مَیں سٹیشن کی جانب چلا جا رہا تھا اور سوچ رہا

تھا عربوں کی تہذیب اور تمدن سے مجھے کیا واسطہ۔ طارق نے کشتیاں جلا دیں تو اچھا کیا۔ محبت اور جنگ میں سب کچھ روا ہے! لیکن یہ کہ ہم ان لوگوں کو اپنے سمجھ کر ان پہ یہ بڑے بڑے جہازی ناول لکھنے لگ جائیں یا ان کی کھجوروں کے مرثیے پڑھنے لگیں ..... اور پھر ..... پھر ..... مگر یہ کہاں کی عقلمندی ہے! کہاں کا جذبہ ہے! بس اک بات تھی سو ہو ہوا گئی۔ نہ انہوں نے سوچ سمجھ کر ہمارے لیے کچھ کیا نہ ہم ..... نہ ہم ..... بلکہ الٹا ہمیں نقصان پہنچا پتا نہیں صبح مجھے کیا ہو گیا تھا جو اس بھک منگے مراثی کے سامنے تصورات کی دنیا بسا کر خواہ مخواہ خفیف ہوا۔ ناشتہ کیئے بغیر بھاگ کھڑا ہوا اور دریائے کبیر کو آبِ حیواں سمجھ کر سراب کی طرف لپکتا رہا۔

رسل۔ ہکسلے۔ جینز۔ مارکس۔ فرائیڈ کی صد سالہ کاوشوں کے قصے اور ان کی تعلیمات کی کہانیاں میری مدد کو آگے بڑھیں اور میری راہ آسان ہونے لگی۔ میں نے کہا میاں تم خود مڈل پاس کرنے کے بعد سے لے کر اب تک پاپولر مکینکس اور پاپولر سائنس پڑھتے رہے ہو۔ فزکس نے جہاں ہاں کر دی ہے وہاں ہاں رہی ہے اور جہاں نہ کر دی ہے نہ رہی ہے۔ اب کون بھلا انہیں مولوی یعقوب کے ان دلائل کو مُننے جائے گا کہ یہ اتنا بڑا کارخانہ یہ اتنا وسیع و عریض نظام کائنات یہ چاند سورج ستارے سیارے آخر انہیں بنانے والا بھی تو کوئی ہے نا۔

الیف اے کے بعد ہم سب مولوی جی کی اس دلیل پہ ہنس پڑا کرتے تھے۔

"اچھا جی! تو پھر مولوی صاحب؟"

"بس وہی خدا ہے!" مولوی یعقوب نے جواب دیا۔

"اور اسی نے نبی بھیجے کہ جاؤ اور جا کر ــــ"

مولوی صاحب طیش میں آ کر مکا دکھاتے اور چلا کر کہتے "فقرہ ختم کیا تو ناک توڑ دوں گا۔"

ہم سب کھی کھی کر کے ہنس پڑے۔

اسحاق کہتا "قربان جاؤں اس کے حسن نے ٹوٹی پنسل سے پھٹے ہوئے کاغذ پہ لکھ دیا مائع اپنی سطح ہموار رکھتے ہیں"۔

مولوی صاحب غصے سے دیوانے ہو کر اپنی بدھنی چھلکاتے اور چیخ کر کہتے "دیکھ تیرا باپ پانی کدھر سے اپنی سطح ہموار رکھتا ہے" بدھنی کی ٹونٹی سے پانی کے چھپا کے کچھ زمین پہ کچھ ہمارے کپڑوں پہ گرنے لگتے اور ہم اور زور زور سے ہنستے!

پہیہ۔ بال بیرنگ۔ ویلو۔ کنھوڈ۔ فوٹو سیل میں نے اپنے بیہودہ دل سے کہا: "برخوردار کیوں دیوانہ ہوا ہے۔ قرطبہ میں تو بس چمڑے کا کام ہوتا تھا اور وہ بھی ایسا کہ دی بیلٹ نہ بنتے تھے مشکیزے تیار ہوتے تھے"۔ دل نے جواب دیا "چلو سرخ شراب پیئیں۔ مگر اس شرط پہ کہ کوئی قرطبن ساتھ ہو"۔ میں نے کہا "بات ہوئی نا"!

اور چابی کی زنجیر میری انگلی پہ مومنٹم کے ساتھ خود بخود کھلتی اور بند ہوتی رہی!

اورینٹل کالج لاہور کی جانب سے چڑھائی چڑھتے ہوئے جنگمہ محلے کا جو علاقہ آتا ہے۔ اس میں بائیں ہاتھ کو پہلے شاید دو تین ٹھٹھیروں کی دکانیں ہیں ان کے آگے کچھ گرے پڑے کوٹھے اور ٹوٹے پھوٹے چبوترے ہیں۔ بالکل ایک ایسی جگہ پر شکستہ دیواروں اینٹوں سلوں اور بوسیدہ بلیوں میں گھری ہوئی زمین سے کوئی فٹ بھر اونچی کرسی پر پھونس اور سرکنڈوں کے دھونسے ہوئے چھپر تلے قرطبہ کی لڑکی پکوان پکا رہی تھی۔ چند اینٹیں جوڑ کر اس نے عارضی چولہا بنایا ہوا تھا۔ اس پہ لوہے کی کڑاہی دھری تھی۔ زیتون کا کچھ تیل اس میں کڑک رہا تھا باقی کا اس سفید بوتل میں پڑا تھا۔ جس کا منہ پھٹے کے گل سے بند کیا ہوا تھا۔ لڑکی گندھے ہوئے آٹے کو سگرٹ کے ڈبے میں ڈال کر زور سے دباتی نیچے ہشت پہلو سوئیں برآمد ہوتی جسے وہ اپنی ویسی ہی انگلی سے توڑ کر دونوں سرے جوڑ کر اور ایک کو کلا سا بنا کر تیل میں چھوڑ دیتی۔ میں یونہی مومنٹم میں اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

یہ لڑکی شکل سے پندرہ سولہ برس کی ہوگی مگر کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے اس

کے چہرے پر جوان عورتوں کی سی سنجیدگی نمایاں تھی۔ چہرہ بیضوی تھا۔ ماتھا فراخ۔ بھویں لمبی اور جھکی ہوئی۔ آنکھوں کے بیوٹلے شہابی سے۔ اس نے سفید لٹول کی نصف آستینوں والی قمیص پہن رکھی تھی اور ملیشیا کے سکرٹ پر پرانی برساتی کا کپڑا ڈالے بڑے انہماک سے کوکلے تل رہی تھی۔ اس کے گلے میں سمندری سیپ سے تراش ہوئی ایک صلیب آویزاں تھی اور قمیص کے کالر پر پیتل کا ایک چھوٹا سا سینخ یا گھوڑا لگا ہوا تھا۔

میں چھپر کی ایک بلی سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور آہستہ سے بولا "سینوریتا!"

اس نے نگاہیں اوپر اٹھائیں اور کالی سیاہ آنکھوں سے آنکتے ہوئے ہسپانوی میں پوچھا "کیا ہے؟"

میں نے چابیوں کی زنجیر ٹانگ کے متوازی جھلاتے ہوئے بڑی مسمی شکل بنا کر اطالوی میں پوچھا "کیا کر رہی ہو؟"

وہ مسکرانے لگی اور سر ہلا کر بولی "میں تمہاری بولی نہیں سمجھتی"۔ اس فقرے سے میں بارسلونا اور میڈرڈ میں بخوبی واقف ہو گیا تھا اور اب مجھے کچھ ایسی کوفت نہ ہوتی تھی۔ مگر اس لڑکی نے یہ اعلان کر کے کہ وہ میری عرض مدعا نہیں سمجھتی۔ مجھے آزردہ کر دیا۔ میں ایک سائینٹ کھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گیا اور اطالوی کے ہر لفظ کے پیچھے ایس اور سین کی کٹی ہوئی آواز چپکا کر ہاتھوں اور آنکھوں کے اشارے سے اسے سمجھانے لگا کہ میں ہسپانوی زبان ٹھیک سے نہیں بول سکتا۔ اس نے کڑاہی سے چھلنی بھر کر کوکلے باہر نکالے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولی "تم ہسپانوی نہیں ہو؟"

میں نے اپنے سینہ پر دو مرتبہ آہستہ سے ہاتھ بجا کر جواب دیا "ہوں تو ہسپانوی لیکن بولی نہیں جانتا"۔

اس کا ہاتھ رکا منہ کھلا آنکھیں پھٹی رہ گئیں!

میں نے سر جھکا کر عاجزی سے کہا "سچ عرض کرتا ہوں میں اسی ملک کا باشندہ ہوں"۔

لڑکی نے قدرے تامل سے پوچھا "اطالوی ہو!"

میں نے کہا "سوءِ اتفاق سے ادھر جا نکلا تھا ورنہ دراصل میرا ملک یہی ہے"۔ اس نے گندھے ہوئے آٹے کے تسلے کی طرف منہ پھیرتے ہوئے آہستہ سے کہا "خدا جانے کون ہو"۔

جب اس نے لمبی ہشت پہلو سوئیں کو کاٹ کاٹ کر انگلی اور انگوٹھے کی کھٹا کلی جنبشوں سے اس کے چھ سات کوکلے تیار کر لیے تو سب کچھ جانتے ہوئے میری طرف یوں دیکھا۔ جیسے پوچھ رہی ہو "ابھی تک تم یہیں بیٹھے ہو!"

میں نے اینٹ چولہے کے قریب کھینچ کر بھونس اور چولہے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں سے پوچھا "ایندھن جھونکتا جاؤں؟" اس نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔

میں نے جیب سے ایک پسیتا نکال کر ویسے ہی پوچھا۔ ایک پسیتے کے کتنے؟

اس نے جواب میں کچھ کہا تو میں نے میڈرڈ اور بارسلونا سے سیکھے ہوئے فقرے کو اس کے قدموں میں ڈال کر کہا "میں تمہاری بات نہیں سمجھا"۔

اس نے دائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیاں کھول کر بائیں ہاتھ کی سیدھی انگلی ان سے ملا دی۔ گوری قرطبن کا جل پریوں ایسا چھوٹا سا ہاتھ آٹے کے ملغوبے میں ڈوب ڈوب کر بہت ہی ملائم ہو گیا تھا۔ ابھی جب اس نے تسلے کے کنارے پر کلائی سے لے کر آخری پوروں تک ہاتھ کھینچا تھا تو بہت سا خون ہتھیلی کی طرف یورش کر کے اسے عنابی بنا گیا تھا اور ہارٹ لائن اتنی گہری نظر آنے لگی تھی کہ دوسری لکیریں اس کے سامنے ماند پڑ گئی تھیں۔ ہتھیلی کے کناروں اور انگلیوں کی درمیانی دراڑوں پر آٹے اور شیرے کی سوکھی ہوئی حدوں نے سارے ہاتھ کو ید بیضا سا پیارا بنا دیا تھا۔ میں نے جلدی سے دیکھا اس کی ہتھیلی پر سمندری سفر کی لکیر بھی موجود تھی۔ اسے دیکھ کر میرے کلیجے میں ٹھنڈک سی پڑ گئی۔ میں نے جلدی سے سر ہلا کر کہا "ٹھیک ہے" اور پسیتا چولھے کے پاس رکھ دیا۔ لڑکی نے تسلے کے پاس پڑے سبز سرکنڈوں کی ایک پتلی سی سینک اٹھائی اور اس میں چھ کوکلے پرو کر مجھے دے دیے۔ میں نے ان سے ایک اتار کر کھایا تو اس میں مال پوئے

کا سا مزہ تھا۔ چھوٹے بچے کی طرح مزے سے سر ہلاتے ہوئے میں نے قرطبن سے پوچھا "یہ کیوں کر بنتے ہیں ؟"

اس کی ناک کے اوپر ماتھے کی ایک چھوٹی سی سلوٹ سوالیہ نشان بن کر ابھری مگر جلد ہی وہ میرا مطلب سمجھ گئی۔ اس نے تسلے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "یہ ؟"

میں نے کہا "ہاں ہاں یہی"۔

لڑکی نے برساتی اپنے گھٹنوں پہ کھینچ کر کہا "آٹا ہوتا ہے نا ــ آٹا !"

میں نے کہا "ہاں"

"بس وہ آٹا اور . . . . ملا کر پانی میں گھول کر بناتے ہیں"۔

". . . . یہ کیا ہے" میں نے پوچھا۔ کوئی نیا سا ہسپانوی لفظ تھا۔ لمحہ بھر کیلئے وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اس نے ہاتھ مل کر بتیاں اتاریں اور چولہے میں ایندھن جھونکنے والی بانس کی سونٹی زمین سے اٹھا کر یوں منہ سے لگا لی جیسے رادھا کرشن کی بانسری چھین کر پھونکنے لگی ہو۔ سفید سفید دانتوں کی لڑی میں اس نے بانس کی ٹوری کا ایک کنارہ ہولے سے پکڑا اور یوں مصنوعی سا جھٹکا دیا جیسے ٹوری سے چھیلنے لگی ہو۔

او ہو گنا ! گنا ! ! ـــ میں چلایا۔

"گانا" ! وہ میری طرف دیکھ کر ہنس پڑی اور میں نے فوراً رومال نکال کر اسے نچوڑنے کے انداز میں بل دیا جیسے گنا بیلا جا رہا ہو۔ لڑکی نے میری سمجھ کی داد دیتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور چولہے کی طرف یوں اشارہ کیا جیسے اس پر رس کے کڑاہے چڑھے ہوں۔

"گڑ گڑ ! !" میں پھر چلایا۔

"گر" اس نے حیرت سے آنکھیں نچائیں۔

"ہاں ہاں کامل پہاڑہ مع گڑ" میں نے اپنے آپ کو خوش کرنے کے لیے کہا۔ اس دوران میں میں چھ کے چھ کو کلے کھا چکا تھا اور میرے ہاتھ میں صرف سرکنڈے

کی سینک باقی رہ گئی تھی۔

لڑکی کو کڑاہی کی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر میں نے ایک پیسا جیب سے ادر نکالا اور آگے بڑھا کر کہا "چھ اور"

اس نے میرے ہاتھ سے پیسا اور سینک دونوں لے لیے تو میں نے بانس کی سونٹی سے آہستہ آہستہ چولہے میں پھونس جھونکنا شروع کر دیا۔

لڑکی نے مجھے بھری ہوئی سینک واپس دیتے ہوئے کہا "مگر تم ہسپانوی تو نہیں ہو۔"

میں نے گرم گرم کو کلا منہ سے نکال کر کہا "خدا کی قسم میں ہسپانوی ہی ہوں۔"

اس نے آٹے کی لئی ڈبے میں ڈالتے ہوئے پوچھا "مشرق مغرب شمال جنوب کون سے علاقے کے ہو؟"

میں اس کی یہ بات سن کر ایک بار پھر آزردہ ہو گیا اور بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میں مور ہوں اور میرے باپ دادا اسی علاقے کے رہنے والے تھے۔ ہم ہلاکو اور چنگیز کی طرح یہاں نہیں آئے تھے بلکہ نئی بستیاں بسانے اور خوبصورت باغ اگانے آئے تھے۔"

اس نے ڈبہ واپس تسلے کے پاس رکھ دیا اور گھور گھور کر میری طرف دیکھنے لگی۔ پھر میری طرف انگلی تان کر بولی "مسلمان ہو؟"

میں نے شکست خوردہ سپاہی کی طرح سر جھکا کر کہا "ہاں"

لڑکی کی آنکھیں الاؤ کی طرح دہکنے لگیں۔ اس نے زمین پر تھوک کر کہا "ہونہہ —— مسلمان! مور!"

رسل۔ ہکسلے۔ جیمز جینز کا سارا علم مجھے عین وقت پر دھوکا دے گیا اور میں نے اٹھائے مسافر کی طرح سر جھکا کر کہا "ہم اتنے برے نہیں۔ اس قدر ذلیل نہیں.... ایسے کمینے....."

مگر اس نے میری بات بیچ میں ہی کاٹ دی۔ شاید وہ جلدی جلدی گالیاں دے

رہی تھی اور اسے نئے نئے کوسنے آسانی سے سوجھتے نہیں تھے۔

اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ کر میں نے ایک مرتبہ کہنا بھی چاہا کہ میں مذہب وذہب میں کچھ ایسا اعتقاد نہیں رکھتا میں تو صرف آزادی، انسان دوستی اور رواداری کا قائل ہوں۔ بال ہیر نگ ویلو اور فوٹو سیل بنانے والوں کو پیغمبروں پر ترجیح دیتا ہوں لیکن پتا نہیں مجھے کیا ہوا کہ میری زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔

ایک مسلمان گھرانے میں اپنی عمر کا بیشتر حصہ گزار کر پروورٹ ہو جانے کی وجہ سے یا شاید کسی اور سبب سے میں اس کو یہ بات کہہ نہ سکا اور سر جھکا کر ہر بات تسلیم کرتا چلا گیا۔ اس بوچھاڑ میں وہ ایک مرتبہ رکی اور قہر آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی: "اٹھو میری دکان خالی کر دو" میں نے مظلوموں کی طرح اس کی طرف دیکھا اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر بڑی لجاجت سے کہا "سینوریتا! مجھے معاف کر دیجیے۔"

وہ سر کو جھٹکا دے کر کرخت آواز میں بولی "مور اور یہ لجاجت" میں نے پھر نظریں جھکا لیں اور جواب میں آہستہ سے کہا "ہم بھی تو ایسے نہ تھے۔ آپس میں لڑتے تھے مگر رعایا پر تشدد تو نہ کرتے تھے۔ آپ امیر عبدالرحمان کو نہیں جانتیں۔ انہوں نے اسی شہر میں ایک برج بنوایا تھا اور اپنے آبائی ملک سے کھجور کا پودا منگوا کر یہاں بویا تھا۔ برج کے بالائی کٹہرے پر کھڑے ہو کر وہ پودے کو پروان چڑھتے دیکھا کرتے، اپنے وطن کی یاد میں شعر کہتے، زریاب مغنی سے عود پر نغمے سنتے اور علم و ادب اور فنون لطیفہ کے پرستاروں کو منہ مانگی مرادیں دیتے۔ انہی بادشاہوں میں الحکم ثانی بھی تو تھے، جنہوں نے دنیا کے ہر گوشے میں اپنے گماشتے محض اس لیے بھیج رکھے تھے کہ جہاں بھی کوئی نئی کتاب لکھی جائے ....."

اس نے چڑ کر کہا "میں کسی کو نہیں جانتی۔ مور سب کے سب قصائی تھے اور تُو سانپ کا بچہ سنپولیا ہے۔"

میں نے کہا "یوں نہ کہو مجھے دکھ ہوتا ہے۔ تم بھی تو ہمارا ہی خون ہو اور رشتہ و پیوند

کے ان جھمیلوں سے کوئی نیوٹن۔ کیوری اور آئین سٹائین جیسا بھی بنڈ نہ چھڑا سکا۔"

دختر قرطبہ نے تنک کر کہا "بکواس مت کرو۔"

میں خاموش ہو گیا تو اس نے تازہ تلے ہوئے کوکلوں کو مٹی کے روغنی پیالے میں ڈال کر تسلے کے ملغوبے کو دائیں ہاتھ سے گوندھنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد سر گھما کر میری طرف دیکھا اور قدرے نرمی سے پوچھا "کہاں ٹھہرے ہو؟"

میں نے بالنس کی سونٹی سے چولہے میں پھونس جھونکتے ہوئے جواب دیا۔ "پا تیوہ بالنسی اون میں۔"

پوچھنے لگی "یہاں کیا کرنے آئے ہو؟"

میں نے کہا "اپنوں سے ملنے کی تمنا کھینچ لائی ہے۔"

لڑکی نے آٹا گوندھنا بند کر دیا اور ماتھے پر سلوٹ ڈال کر بولی "یہاں تمہارا کون ہے؟ اور تم کہاں سے اسے ملنے آئے ہو؟"

میں نے سر جھکائے پھونس جھونکتے ہولے سے کہا "یہاں ہمارے شاہ عنایت رہتے ہیں۔ تم انہیں نہیں جانتی ہو مجھے بھی ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا لیکن وہ ہیں یہیں اسی بستی میں اسی حرم پاک میں کہیں چھپے ہوئے ــــ تمہیں پتا نہیں۔

عرش منور ملیاں بانگاں سنیاں تخت لہور

شاہ عنایت کنڈیاں پایاں مک چھپ کھچدا اڈور"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور سامنے سڑک صاف کرنے والے ایک دیو ہیکل آدمی کو فیردی نانڈو۔ فیردی نانڈو کہہ کر پکارتے ہوئے اونچی آواز میں چلائی "ذرا اسے دیکھنا۔ پتا نہیں کون سی بولی بول رہا ہے اور کہتا ہے میں مور ہوں ۔۔۔۔ مور۔"

ہنستے ہنستے اس نے گھٹنوں میں سر دبا لیا۔ فیردی نانڈو جھاڑو چھوڑ کر چھپر کے پاس آ گیا اور گرج کر بولا "کون ہو تم" میں نے اپنا تھیلا اٹھایا۔ کانپتی ہوئی ٹانگوں سے

اٹھا اور چلنے لگا تو فیردی نانددنے لڑکی سے پوچھا" یہ مور ہے ؟"

اس نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر ہنسی سے بے جان ہوتے ہوئے دو تین مرتبہ اثبات میں سر ہلایا اور پھر کچے فرش پر لیٹ گئی۔ فیردی نانددنے غور سے اس کی پنڈلیاں دیکھیں پھر ایک آنکھ میچ کر لچوں کی طرح میری طرف دیکھا اور اتنے زور کا قہقہہ لگایا کہ جھپر کے پاس کاغذ کی بھنبیریاں لے جاتے ہوئے دو لڑکے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر فیردی نانددو کی طرف دیکھنے لگے۔

میں کسی بات کا جواب دیے بغیر جھپر کے کچے چبوترے سے اترا اور سٹیشن کے بجائے شہر کی طرف تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

قرطبہ کی پتھروں کی قدیم سڑک گاڑیوں کے پہیوں اور گھوڑوں کے سموں سے جگہ جگہ سے دب گئی تھی اور پتھروں کے گول گول ٹکڑے سورج کی کرنوں تلے بلور کی طرح چمک رہے تھے۔

اگلے چوک پر تمباکو کی ایک چھوٹی سی دکان کے سامنے تین شکاری کھڑے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں دو نہایت ہی خوبصورت حجازی کتوں کی ڈوریں تھیں۔ دوسرے کے گلے میں شراب کی چھاگل لٹک رہی تھی اور تیسرا بارہ بور کا گھسا پٹا دستہ اپنے کرخت بوٹ کی ٹو پر بجا رہا تھا۔ میں نے ان کے قریب جا کر اطالوی میں پوچھا "مسجد کہاں ہے؟"

چھاگل والے نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ کتوں والے نے عرب میزبان کی طرح محبت سے میرا کندھا تھپک کر پوچھا "لا مزکیتا؟" میں نے سر کے اشارے سے ہاں کہا تو اس نے سامنے بازو تان کر کہا "سیدھے چلے جاؤ۔ اگلا چوک چھوڑ کر اس سے اگلے موڑ پر بائیں ہاتھ کو مڑ جانا۔"

میں نے اپنی کلائی پر گھڑی دکھاتے ہوئے پوچھا "کتنی دیر لگے گی۔"

تو چھاگل والے نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کھول کر کہا "یہی کوئی دس منٹ" بندوق

والا بدستور طبلہ بنی ٹوپیہ پر دستہ بجاتا رہا۔

میں شکاریوں کی ہدایت کے مطابق جلدی جلدی آگے بڑھنے لگا۔ دھوپ کافی تیز ہو چکی تھی اور چلنے کی وجہ سے کچھ گرمی کا احساس ہونے لگا تھا — اس وقت قرطبہ دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے اندلس کے سارے شہروں میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ آبادی کوئی دس لاکھ نفوس پر مشتمل تھی، شہر میں اسّی ہزار چار سو دکانیں سات سو مسجدیں، نو سو حمام اور —— ساڑھے چار ہزار گودام تھے۔ یہ خوشحال اور متمدن شہر وادی الکبیر کے کنارے آباد تھا۔ ساری سڑکیں پتھر کی تھیں اور گرمیوں میں ان پر خیمے تن جاتے تھے تاکہ آمد و رفت میں آسانی رہے — کاش ان سڑکوں پر کم از کم شہر کے اندرونی کونوں پر اب بھی کوئی تنبو تان دیا کرے تاکہ لوگوں کو چلنے پھرنے میں آسانی ہو یہ سوچ کر اور ایسی اَن ہونی تمنا کو اپنے پہلو میں جگہ دے کر مجھے اور بھی گرمی لگنی شروع ہو گئی۔

بڑا چوک گزر کر اور اگلے موڑ پر بائیں ہاتھ کو مڑ کر تنگ گلیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک لمبی سی گلی میں چلتے چلتے میں ایک پنساری کی دکان پر ٹھٹکا اور باہر سودا لیتی ہوئی ایک بڑھیا سے پوچھا "لا مزکیتا؟" اس نے سودے کی تھیلی پر رسّی لپیٹتے ہوئے ہاتھ سے آگے کو اشارہ کیا اور میں پھر روانہ ہو گیا۔ اس سنسان گلی میں پرانی وضع کے پانچ چھ چونے گچ گھر گزرنے کے بعد مجھے ایک نوجوان لڑکا دکھائی دیا جو گلی کے بیچوں بیچ آدھی آستینوں کی قمیض اور نیلی پتلون پہنے کھڑا تھا اور دونوں باہیں اوپر کو اٹھا رکھی تھیں۔ چھوٹے سے گھر کے نیچی چھت والے بالاخانے کی کھڑکی میں ایک صحت مند لڑکی پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی اور ادھ کٹے ترنج کو چھلکے سمیت دانتوں سے توڑ توڑ کر کھا رہی تھی۔ جب اس کے منہ میں بیج آجاتا تو کلّے پھلا کر سُرخ سُرخ ہونٹوں کو حلوان کی منہ بند تھیلی کی طرح سکوڑتی اور "پھش" کر کے ہوائی بندوق داغ دیتی۔ لڑکا اپنے جسم پر چھرہ لگ چکنے کے بعد سنا ہوا بیج زمین سے اٹھاتا اور اپنے منہ میں ڈال لیتا — میں تو یہاں محض اس لئے رک گیا تھا کہ مجھے مسجد کا راستہ

پوچھنا تھا —— جب ان کے کھیل میں ثانیہ بھر کا انٹرول بھی نہ ہوا تو میں پوچھے بنا آگے بڑھ گیا۔

زرد اور خاکستری رنگ کے پتھروں کی جس دیوار پر جا کر یہ گلی ختم ہوتی تھی وہ مسجد قرطبہ کی فصیل تھی۔ گلی کے دہانے پر پہنچ کر میں نے دیوار کے ساتھ ساتھ نگاہ دوڑائی تو میری آنکھوں کے سامنے گھپ اندھیرا چھا گیا اور مجھ پر کچھ ویسی رقت سی طاری ہو گئی جو نانی اماں پر فلمی طرز کی نعتیں سن کر طاری ہو جایا کرتی تھی۔ میں نے ایک جھرجھری لی۔ شانے جھٹکے اور ایک منجھے ہوئے ٹورسٹ کی طرح اپنے آپ سے انگریزی میں کہا "تو یہ ہے مسلمانوں کا وہ عبادت کدہ جس کی تعمیر انہوں نے آٹھویں صدی میں شروع کی تھی اچھی خاصی عالی شان عمارت ہے"۔

مگر یہ فقرہ مجھے ٹھیک سے سہارا نہ دے سکا اور میں یہ دیکھ کر دکھی ہو گیا کہ اس عمارت کی اچھی نگہداشت کیوں نہیں ہوتی۔ اس کی شکست و ریخت پر کوئی توجہ کیوں نہیں دیتا۔ سیڑھیاں کیوں ٹوٹ گئی ہیں۔ کنگرے کیسے ڈھے گئے ہیں۔ ڈاٹوں کے پتھر اندر کو کیوں پچک گئے ہیں —— کرسی کے اوپر دیوار کو شورہ چاٹ رہا ہے تو دنیا کے کسی عبدالرحمان کو خبر کیوں نہیں ہوتی؟ ——

لاحول ولاقوۃ۔ میں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر کہا ابھی انسان کو اپنے جذبات کی تادیب کیلئے کتنے سالوں کتنی صدیوں کی ضرورت ہے۔ مذہب کا جنازہ نکل چکا۔ دھرم کی نردیں پٹ چکیں۔ وقت کے تقاضے بدل گئے لیکن ہم پڑھ لکھ کر بھی رجعت پسند ہی رہا۔ لاحول ولاقوۃ۔

المینار پر حضرت عیسیٰ کا مجسمہ جھک رہا تھا۔ میں نے نصرانی تحمل کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ اس سے نیچے کانسی کے بڑے بڑے گھنٹے لٹک رہے تھے اور ان کی لٹھ کے ساتھ فولادی رستے کا سرا بٹ کیا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ پتھر کے دو پرنالوں کے سوا باقی سب ٹوٹے ہوئے تھے اور ان کے موکھوں میں زنگ آلود ٹین ٹیڑھا ترچھا کر کے پھنسایا ہوا تھا۔

مسلسل بارشوں سے کنگرے اور منڈیریں سیاہ ہو چکی تھیں اور ادھر ادھر پھپھوندی کی دبیز تہیں دیوار سے چپک رہی تھیں۔ میں حوصلہ کر کے آگے بڑھا اور اونچی دیوار کے قدموں میں کھڑے ہو کر "لامزکیتا" پر اپنے دونوں ہاتھ یوں رکھ دیئے جیسے جوگیا بابا پہنے کھیٹ نے ماردی کو پکار پکار کر شاہ عمر کے حرم پر ماتھا رکھ دیا تھا۔ ماردی قید تھی، شاہ عمر جابر تھا اور حرم کی دیواریں بہت ہی اونچی تھیں۔ میں نے اپنی ہتھیلیوں کو دیکھا ان پر بھورے رنگ کے مہین مہین ذرے چمٹ گئے تھے۔ دیکھتے دیکھتے یہ ذرے گالوں تک پہنچے پلکوں سے لگے اور پھر ماتھے پر چمٹ کر رہ گئے۔ جب کبھی حیدر آباد میں میرا دادا بیمار پڑا ہوگا اس نے ضرور اسی طرح تیمم کر کے نماز ادا کی ہوگی ۔۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر اپنا چہرہ صاف کیا اور بڑے چوبی دروازے سے اندر صحن میں داخل ہو گیا۔

چھوٹے قد کی دو موٹی عورتیں لیموں کے ایک سایہ دار پیڑ تلے بیٹھی گپیں ہانک رہی تھیں۔ ایک کے سامنے پرانے کپڑوں کی گٹھڑی رکھی تھی اور دوسری کی گود میں میلی کچیلی بڑی تقطیع کی بائیبل۔ اندر گرجے میں عبادت گزارنے کے بعد یہ چند منٹ ستانے یہاں بیٹھی ہوں گی اور پھر اڑوس پڑوس کی کہانیاں انہیں کہیں سے کہیں لے اڑی ہوں گی۔ سامنے باب النخیل کے پاس سرو کی دور افتادہ چھاؤں میں مسجد قرطبہ کا یا یوں سمجھیے گرجے کا محافظ کرسی ڈالے اخبار دیکھ رہا تھا۔ میں نے صحن میں پہنچ کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی لیموں کے پیڑ یتیم خانے کے مدرسے میں حمد کہنے والے بچوں کی طرح کھڑے تھے۔ سرو کا درخت بہت بلند تھا لیکن اس کی بلندی میں ایک طرح کی دست بستگی مضمر تھی جیسے وہ ہاتھ باندھ کر آسمان سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ کھجور کا تنا خمیدہ تھا اور اس کی چھدری ڈالیاں جگہ جگہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر زمین کی جانب جھول گئی تھیں اور ان میں آب و نم کا نشان تک نہ تھا۔

میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا محافظ کی طرف بڑھا اور اس کے پاس جا کر رک گیا۔ اس نے عینک اتار کر میری طرف دیکھا اور انگریزی میں پوچھا "فرمایئے! میں آپ کے لیے کیا کر

سکتا ہوں۔"

میں نے منفعل بچے کی طرح ہتھیلا جھلا کر کہا "میں مسجد دیکھنی چاہتا ہوں اور اگر اجازت ملے....."

لیکن اس نے میرا فقرہ بیچ ہی میں کاٹ دیا اور اخبار کی تہہ لگاتے ہوئے بولا "مسجد اس وقت بند ہے شام کے چار بجے کھلے گی اس وقت آیئے گا۔"

میں نے کہا "مسجد کے بھی کوئی اوقات ہوتے ہیں! یہ تو خدا کا گھر ہے۔ اسے تو ہمیشہ کھلے رہنا چاہیئے۔"

محافظ ہنس پڑا اور ران پہ اخبار کا پٹاخہ بجا کر بولا "کبھی مسجد بھی خدا کا گھر ہوئی ہے!"

میں سہم گیا اور باب الفتیل کے اوپر درجن میری اور بچے کی ریلیف کی طرف اشارہ کر کے بولا "یہ جو ہیں یہاں!"

محافظ ایک مرتبہ پھر مسکرایا اور رازدارانہ لہجہ میں کہنے لگا "یہ تو عمارت کی ناپاکی دور کرنے اور پلید روحوں کو بھگانے کے لیے لگائی گئی ہے۔ ورنہ ان کا ٹھکانہ تو ہمارے دلوں میں ہے۔"

جان کتنی عزیز ہوتی ہے اور پھر پردیس میں مرنے کو تو کسی کا بھی جی نہیں چاہتا۔ میں نے بے معنی طریق پر سر ہلایا اور موضوع بدلنے کی خاطر پوچھا "آپ یہاں کے محافظ ہیں۔"

اس نے گھٹنے پر تین مرتبہ پھسل جانے والی پنڈلی کو کھجایا اور کہا "ہاں! میں بھی ایک محافظ ہوں اور دوسروں کی طرح یہاں کا گائیڈ بھی ہوں۔"

میں نے کہا "پھر تو آپ کے پاس چابیاں بھی ہوں گی۔ کھول کر دکھا ہی کیوں نہ دیجئے۔"

گائیڈ نے حسرت بھرے لہجے میں کہا "حکم نہیں۔"

میں نے کہا "یہ حکم بھی عجیب مصیبت ہوتے ہیں مانو تو مرو نہ مانو تو سولی چڑھو۔"

اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہولے سے کہا "کچھ نہ پوچھو۔ جو لمحہ خیریت سے گزر جائے وہی اچھا۔"

میں نے شہ پا کر آہستہ سے پوچھا "یہ درخت اسی وقت کے ہیں یا بعد میں لگائے

گئے ہیں۔"

گائیڈ نے "توبہ کرو جی" کے انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا "اب تک رہ سکتے تھے وہ درخت!
بعد میں کاشت کیے گئے ہیں لیکن اسی انداز میں اور اسی ترتیب سے۔ مثلاً اس صحن کو "صحن نارنج"
کہتے ہیں۔ یہاں موروں کے زمانے میں لیموں اور سنگترے کے پودے ہوا کرتے تھے.... اور گرد
سرو کے پیڑ تھے اور درمیان میں کھجور کے درخت کھجور مسلمانوں کا متبرک درخت ہے نا اس لیے ہم نے
بھی بڑی محبت سے ان درختوں کو پالا ہے۔

میں نے کہا "تم لوگوں نے خواہ مخواہ اتنی مشقت کیوں کی۔ رہنے دیتے۔"

"ٹورسٹ پسند کرتے ہیں" گائیڈ نے تجارتی راز کھولا۔

"کوئی مسلمان ٹورسٹ بھی آتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کبھی کبھار آہی نکلتا ہے" گائیڈ نے لاپرواہی سے کہا "زیادہ تر مراکشی ہوتے ہیں۔"

"وہی جو یہاں سے بھاگ گئے تھے۔" میں نے کہا۔

"ہاں وہی جنہیں یہاں سے نکال دیا گیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا "ذرا دروازہ نہیں کھول دیتے؟ میں ایک منٹ میں اندر جا کر سب کچھ دیکھ لوں
گا۔"

اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور پھر بڑے دھیمے لہجے میں کہا "کہہ جو دیا کہ حکم نہیں۔"
میں اس کے پاس ہری ہری گھاس پر بیٹھ گیا اور سامنے المینار کی طرف دیکھنے لگا
جس پر حضرت عیسیٰ کا بت ہاتھ میں آہنی عصا لیے چاروں طرف دیکھتا رہتا ہے کہ اس معبد
پر کوئی آفت تو نہیں آرہی۔

وہ پھر اخبار پڑھنے لگ گیا تو مجھے اس کی بے توجہی پر بڑا غصہ آیا مگر تتے ہو کر بھی
کام نکلتا نظر نہ آتا تھا۔ میں نے آرام سے پوچھا "اتنے بڑے صحن میں وہ لوگ کرتے کیا تھے؟"
اس نے اخبار سے نگاہ ہٹائی اور کچھ استادوں کا کچھ گائیڈوں کا لہجہ لیے ہوئے کہا "یہاں

وہ موذن کی آواز پر آہستہ آہستہ جمع ہوتے تھے اور عبادت کدے میں داخل ہونے سے پیشتر ہاتھ پاؤں دھوتے تھے اس وقت یہاں نہایت ہی خوبصورت حوض بنے ہوئے تھے جن کے کنارے مور جُوتے اتار کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتے تھے اور ہاتھ منہ دھونے کی رسم ادا کرتے تھے پھر وہ مسجد کے اندر فوجی انداز میں قطاریں باندھ کر کھڑے ہو جاتے اور مکہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے۔ ان کا پادری امام کہلاتا تھا۔ جو سفید چوغہ اور سر پر سبز عمامہ پہن کر قرآن سے کچھ چیزیں پڑھتا تھا اور اس کے پیچھے کھڑے ہونے والے اس کے حکم کے مطابق حرکت کرتے تھے۔ دراصل یہ عبادت نہ تھی فوجی پریڈ تھی اور ان لوگوں میں بڑا اتفاق تھا۔ عبادت کے بعد وہ لوگ پھر اسی صحن میں آجاتے اور مختلف گروہوں میں بٹ کر فلسفہ قانون اور علم البیان پر مباحثے شروع کر دیتے۔ علم کی بنیادیں یونان میں رکھی گئیں۔ وہ روما کے فورم میں پروان چڑھا اور قرطبہ کے صحن نارنج میں تکمیل کو پہنچا اور سچی بات تو یہ ہے کہ موجودہ دنیا نے سائنس میں جتنی ترقی کی ہے۔ وہ سب ہمارے ہسپانیہ کی بدولت ہے "۔ اس نے مسجد کی دیوار پر حسرت کی ایک نظر ڈالی اور اخبار کا کونہ پھاڑ کر چبانے لگا۔

میں نے ذرا آگے بڑھ کر خوش ہو کے پوچھا "تو گویا مور اچھے تھے اور انہوں نے......"

اچھے برے کا سوال نہیں" اس نے مجھے سمجھانے کی غرض سے کہا "انہوں نے انسانیت پر جو احسان کیے ہیں دنیا کی خاص طور پر یورپ کی کوئی قوم اس سے انکار نہیں کر سکتی"۔ میں خوشی کے مارے دیوانہ ہو گیا اور ایک دم سر و قد اٹھ کھڑا ہوا۔ جی چاہا گائیڈ سے لپٹ کر اس کا منہ چوم لوں مگر ہمت نہ پڑی۔ جب وہ میری طرف برابر دیکھے گیا تو میں نے بائیں ہاتھ سے چھاتی بجا کر اور سر اونچا کر کے کہا "میں بھی مور ہوں"۔

"کیا؟" اس کے ہاتھ سے اخبار گرتے گرتے بچا۔

"میں نے کہا میں بھی مور ہوں"۔

"یعنی تم مسلمان ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں" میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا" یہ دیکھو..... دیکھو یہ میرا شناختی کارڈ ہے ...... روم یونیورسٹی کا شناختی کارڈ۔ دیکھو میرا خاندانی نام "احمد" ہے ۔ احمد موروں کا نام ہی ہوا کرتا ہے نا۔"

اس نے کارڈ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ ساری عبارت کو غور سے پڑھا اور پھر دوستانہ لہجے میں پوچھا" کہاں ٹھہرے ہو؟"

"پاتیو پانسی اودن میں" میں نے فخر سے جواب دیا۔

"ہوں" اس نے کارڈ واپس لوٹا دیا اور اخبار سے اپنی گردن کے پاس ہوا کرنے لگا۔ کچھ ایسی گرمی تو نہ تھی ۔ میں نے شوخ بچے کی طرح مچل کر کہا" اب تو دروازہ کھول دو۔"

گائیڈ نے کہا" میرے پیارے بھائی مسجد چار بجے سے پہلے نہیں کھل سکتی۔ میں حکم کے ہاتھوں مجبور ہوں۔"

میں نے کہا" اچھا میں چار بجے ہی آجاؤں گا لیکن اب ذرا جھری میں سے جھانک کر اندر تو دیکھ لوں کہ سیاہ و سفید ٹکڑوں کی نعل ایسی محرابیں کیسے لگتی ہیں۔"

اس نے بڑی نرمی سے جواب دیا" اندر اندھیرے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔"

میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا" اس وقت میں اندر کا اندھیرا دیکھ کر ہی مطمئن ہو جاؤں گا جھری میں سے ٹھنڈا ٹھنڈا سیلا سیلا اندھیرا میری آنکھ گال کو تو لگ سکے گا۔ مجھے اندر سے مسجد کی مخصوص لپٹ تو آئے گی میں سانس لیتے ہوئے .....؛"

اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا" اگر تم کوشش کرو گے تو میں تمہیں دروازے سے نوچ کر یہاں صحن کی روش پر پھینک دوں گا" وہ منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا جیسے مجھے شہ دے رہا ہو کہ" آگے بڑھ کے تو دیکھو۔"

" میں نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے قدرے زور سے کہا" اچھا میں چار بجے ہی آجاؤں

گا — اس وقت تو تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔"

"ہاں اگر میں ڈیوٹی پر نہ ہوا تو مجھے اعتراض نہ ہو گا۔"

میں اس کا یہ فقرہ سن کر سناٹے میں آگیا اور کوئی اور بات کیے بغیر چوروں کی طرح آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا صحن سے باہر نکل گیا۔

مسجد کے پچھواڑے پرانی طرز کے ایک رومن دروازے سے گزر کر دریائے کبیر کا وہ حصّہ ایک دم آنکھوں کے سامنے آگیا جہاں دخترِ دہقان گیت گایا کرتی تھیں۔ اس کہنہ پل پر جیسی طرز کا ایک بوڑھا مزے مزے اپنی خچر ہانکے جاتا تھا۔ نیچے چابی دار محرابوں میں سے ہوتا ہوا دریائے کبیر کا گدلا گدلا پانی رواں تھا۔ پانی کے کم ہونے کی وجہ سے جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی ریتیاں مردہ کچھوؤں کی طرح پڑی تھیں اور ان پر گلے سڑے سرکنڈے اور جھاڑ جھنکاڑ کے اجڑے ہوئے گھونسلے پڑے تھے۔ مسجد کے عین پیچھے اونچے اونچے نرسلوں کے آس پاس سوئر چر رہے تھے اور اپنی غلیظ دُم میں گھما گھما کر دائرے نیم دائرے اور سوالیہ نشان بنا رہے تھے۔ چار پانچ سوئر ایک سوئر کو نرسلوں سے کوڑے کے ڈھیر تک اور ڈھیر سے نرسلوں تک بھگائے پھرتے تھے —

چونکہ مسجد کے دروازے بند ہیں۔ میں نے سوچا اسی لیے دریائے وادی الکبیر کا منظر گھناؤنا ہو گیا ہے جونہی مقدس باب کھلیں گے۔ ترنجن میں گانے والی دہقان لڑکیاں آپ سے آپ اس کے کناروں پر جمع ہو جائیں گی۔

صبح سے اب تک چلتا رہا تھا! تھک گیا تھا۔ جسے دیکھنے آیا تھا اس کے دروازے بند تھے۔ جہاں گیت سننے کی آرزو لے گئی تھی وہاں غلیظ صورتیں بھیانک آوازیں نکال رہی تھیں۔ سوچا چل کر پہلے سٹیشن سے اٹیچی کیس لے لوں۔ اس کے بعد پانسی اون میں آرام کروں اور پھر چار بجے کپڑے بدل کر مسجد دیکھنے آؤں۔ جس طرح شبنم کے نزول سے کلیوں کے منہ دھل جاتے ہیں اور سبزہ نکھرتا ہے اسی طرح چار بجے کے بعد قرطبہ میں جمال و جلال کے مظاہر آپ سے آپ جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ چار تو بجنے دو —

جب میں سٹیشن سے بکس لے کر پالسی اون لوٹا تو ایزا بیلا ڈیوڑھی میں آئینہ کے سامنے اپنے بالوں کو برش کر رہی تھی۔ میرا عکس دیکھ کر وہ تیزی سے پلٹی اور امریکن انداز میں بڑی بے تکلفی سے "ہیلو" کہہ کر میری طرف یوں دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو" جانِ تمنا صبح سے اب تک کہاں رہے ہیں خالص برطانوی طریق پر "ہیلو" کہہ کر وہیں دہلیز کے پاس ٹھٹھک گیا اور سوچنے لگا کہ اس لڑکی کو "قالو بلا" کے علاوہ اور کہاں دیکھا ہے! ساتھ کے کمرے سے لینڈ لیڈی برآمد ہوئی اور اس نے ہسپانوی میں لڑکی سے کچھ کہا۔ ایزا بیلا مسکرانے لگی اور گردن پر پڑے ہوئے سیاہ بالوں پر پلاسٹک کا برش پھیرتے ہوئے بولی" میری امی کہتی ہے کہ میں نے آپ سے اپنا پورا تعارف کیوں نہیں کرایا" —— میں نے کہا" آپ کیا کہتی ہیں "۔

ایزا بیلا نے ہنستے ہوئے کہا" کچھ بھی نہیں۔ میں تو کچھ بھی نہیں کہتی — میرا نام ایزا بیلا ہے اور ممی کی لڑکی ہوں۔ میڈرڈ کی ایک امریکن فرم میں ملازم ہوں اور ہر ویک اینڈ پر یہاں اپنے گھر آیا کرتی ہوں۔

میں نے کہا" یہ سب کچھ تو مجھے ایک نظر دیکھتے ہی معلوم ہو گیا تھا۔ کچھ اور بتائیے "۔

ایزا بیلا یوں ہنسی کہ اس کے گالوں میں دو ننھے ننھے گڑھے پیدا ہو گئے۔ ماں نے متجسس نگاہوں سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے اپنی زبان میں پوچھا" یوں ہنس کیوں رہی ہو ایزا بیل "۔

لیکن ایزا بیل نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہنستی رہی اور برش کرتی رہی!

ایزا بیلا نے سفید وائیل کی آدھی سے کم آستینوں والی قمیض پہن رکھی تھی اور کالر پر ایک چھوٹا سا لونگ برابر پھول لگایا ہوا تھا۔ اس کا قد چھوٹا تھا لیکن گردن کچھ اس طرح کی تھی کہ مجھے گرمیوں کے اس روزے کی یاد آ گئی جب میں نے پیاس سے مغلوب ہو کر ٹھنڈے پانی سے بھری ایک کوری صراحی پر ہونٹ رکھ دیئے تھے۔ قمیض کی آستینیں اس کے سفید ڈولوں میں اس طرح کھب گئی تھیں کہ نیلی نیلی رگیں پھڑکنے لگی تھیں۔ اگر اس کے بالوں سے تازہ شامپو

کی بو نہ آتی تو سارا کمرہ ایزا بیلا کی خوشبو سے بھر جاتا۔ یہ خوشبو بالکل ویسی تھی جیسے کار تو کس چلنے کے بعد شکاری کے ارد گرد سے آیا کرتی ہے۔ اس کے پاؤں میں قرطبہ کے چمڑے کی نازک سی چپلی تھی جس کے فیتے اس نے پنجوں پہ باندھنے کے بعد سفید سفید ٹخنوں کے گرد لپیٹ لیے تھے۔ تین چار روزہ باسی نیل پالش کی وجہ سے پاؤں کی انگلیاں پرانے ٹائپ رائٹر کے کی بورڈ طرح دکھائی دیتی تھیں جب وہ برش کرتے ہوئے سر جھٹکتی تو یوں لگتا جیسے کہہ رہی ہو۔

"تم چلو — چلونا — میں ابھی آتی ہوں" میں نے کچھ کہنا چاہا تو ایزا بیلا نے ہاتھ روک کر کہا "چاہو تو کپڑے بدل لو۔ ہم باہر جا رہے ہیں"۔

کون کون" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"میں اور تم —— اور کون" اس نے میری طرف حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں تو آج شام مسجد دیکھنے جا رہا ہوں۔ اس کے بعد اگر چاہو . . . . ."

مگر اس نے میری بات بیچ ہی میں کاٹ دی اور جاننے کے سے انداز میں کہا "واہ کوئی شام کو بھی مسجد دیکھتا ہے! اندر اتنا اندھیرا ہوتا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا اور پھر اس مسجد . . . ."

"لیکن میں جانا چاہتا ہوں نا ایزا بیلا" اب کے میں نے بات کاٹی۔

"پتا نہیں ٹورسٹوں کو کھنڈروں سے اتنا پیار کیوں ہوتا ہے"۔

ایزا بیلا نے حیران ہو کر کہا۔

میں نے کہا "میں صرف ٹورسٹ ہی نہیں ہوں کچھ اور بھی ہوں"۔

ایزا بیلا ہنس پڑی اور آنکھیں نچا کر بولی "اچھا تو آپ پادری بھی ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا"۔

پادری تو خیر نہیں" میں نے شرافت سے جواب دیا "خدا کا بندہ ضرور ہوں"۔

"خدا کے بندوں کو تو پھر ضرور اس کے بندوں کا ساتھ دینا چاہیئے"۔

میں نے کہا "بات یہ ہے ایزا بیلا کہ میں ہر حال میں آج ہی مسجد دیکھنی چاہتا ہوں"۔

اس نے اسی لہجہ میں جواب دیا "بات یہ ہے موسیو کہ میں ہر حال میں آج ہی بل فائیٹ

دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"لیکن میں نہیں چاہتا" میں نے ادب سے جواب دیا۔

"ڈرتے ہو" ایزا بیلا نے پوچھا۔

"مور ڈرا نہیں کرتے" میں نے فخر سے جواب دیا۔

"مور! وہ ہنس پڑی اور اپنی ہتھیلی میری طرف کر کے یقین دلاتے ہوئے بولی" ٹکٹ میں خرید رہی ہوں گھبراؤ نہیں۔"

"یہ موروں کی مہمان نوازی کو للکار رہے" میں نے تیزی سے کہا "میرے ہوتے ہوئے تمہیں ٹکٹ خریدنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔"

"تو چلو پھر" اس نے بے تاب ہو کر کہا۔

"ٹھہرو! میں کپڑے بدل کر آتا ہوں۔"

جب ہم ہوٹل ریجینا کے قریب ایک قہوہ خانے سے کافی پی کر نکلے ساڑھے چار بج چکے تھے اور لوگوں کے گروہ بل فائیٹ دیکھنے جا رہے تھے۔ سڑک عبور کرتے ہوئے میں نے اس گلی کو پہچان لیا جو مسجد کی طرف جاتی تھی (اس وقت جامعہ قرطبہ کے سارے دروازے کھل چکے ہوں گے" میں نے سوچا اور ایزا بیلا کی کہنی تھامے اس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

تماشا گاہ پرانی طرز کی تھی اور اس کے منتظمین کی وردیاں ایسی خوبصورت اور صاف ستھری نہ تھیں جیسے میڈرڈ کے پلازا دی تو روس" کی ہیں۔ بکنگ آفس پر بھی کچھ ایسی بھیڑ نہ تھی اور ہمیں ذرا سی بھی زحمت اٹھائے بغیر ٹکٹیں مل گئیں۔ گیٹ کیپر کے قریب ایزا بیلا نے تکیوں کے ڈھیر میں سے دو مقابلتہً صاف تکیے اٹھائے اور مجھے تھما کر آگے آگے چلنے لگی۔ اندر اور بھی بہت سی عورتیں اور لڑکیاں داخل ہو رہی تھیں لیکن نظر باز قسم کے قرطبی جس شوق اور خلوص سے ایزا بیلا کی پنڈلیاں دیکھ رہے تھے۔ وہ میرا سر فخر سے اونچا رکھنے کے لیے کافی تھا۔ گو میرے قدموں میں بجلی کی سی تیزی نہ تھی۔ لیکن تنی ہوئی گردن صاف بتا رہی تھی کہ کوئی بہادر بل کھائے

میں داخل ہو رہا ہے۔

ہم نے بینڈ بجانے والوں کے عین سامنے جگہ منتخب کی اور گیلری پر اپنے اپنے تکیے رکھ کر بیٹھ گئے۔ پانچ بجنے میں ابھی چند منٹ باقی تھے اور اکھاڑے کے اندر چھوٹے چھوٹے لڑکے نئے فلم کے اشتہار بورڈ گلے میں لٹکائے ادھر ادھر گھوم رہے تھے چوبی دیوار کے ساتھ ساتھ ایک بڑی سی بوتل جگہ جگہ لگا رہی تھی اور اس پر ہسپانوی اور فرانسیسی میں لکھا تھا "ہمیشہ پابلوش اور ریج سکوائش پیا کریں"۔

اچانک اس بوتل کی کھڑکی کا پٹ زمین پر گر گیا اور اس کے پیچھے سیاہ چست پتلون میں لپٹی ہوئی گھٹنوں سے نیچے دو ٹانگیں نظر آنے لگیں۔ سب لوگ قہقہہ مار کر ہنس پڑے، لیکن ان میں سب سے پیاری ہنسی ایزا بیلا کی تھی۔ جس کے بند ہونٹوں سے ایسی کومل سریں نکل گئیں تھیں۔ جیسے وائلن کے باریک تار پر گز نے اچٹتی سی رگڑ کھائی ہو۔ بوتل کا آدمی باہر نکلا اور زمین پر پڑا ہوا پٹ اٹھا کر پھر بوتل کے اندر داخل ہو گیا۔ کھڑکی اپنی جگہ پر جمی اور بوتل پھر گھومنے لگی۔

پورے پانچ بجے بگل بجا تماشا گاہ کا بڑا دروازہ کھلا اور دو گھڑ سوار اندر اکھاڑے میں داخل ہوئے۔ گھوڑوں کو ایک ساتھ قدم قدم چلاتے وہ صدر کی نشست کے سامنے آ کر رکے اور صدر سے سانڈوں کے طویلے کی چابیاں طلب کیں۔ صدر نے چابیوں کا گچھا ہوا میں اچھالا اور ایک گھڑ سوار نے اپنی ٹوپی آگے بڑھا کر چابیاں اس میں دبوچ لیں۔ دونوں واپس چلے گئے تو بینڈ ایک مرتبہ پھر بجا اور "ماتا دور" اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اکھاڑے میں داخل ہوئے سان کے دونوں جانب نائبوں اور امدادی گروہ کے چست و چالاک نوجوان تھے۔ سرخ سنہرے نارنجی لباس میں ملبوس ماتا دور اپنی سیاہ ٹوپیاں اٹھا اٹھا کر ہمیں سلام کر رہے تھے اور ہم جواب میں بڑے زور سے تالیاں پیٹ رہے تھے۔

مشکل سے یہ مختصر سا جلوس اکھاڑے سے واپس گیا ہو گا کہ بگل کی آواز پر سامنے

کا چوبی پھاٹک کھلا اور تیزی سے کالا سیاہ دل بادل سانڈ بجلی کی طرح اکھاڑے میں داخل ہوا۔ اس کوندے کی لپک کے سامنے اکھاڑے کے چست و چالاک نوجوان اپنے اپنے سرخ و نارنجی لبادے لے کر لکڑی کی مضبوط ٹٹیوں کی اوٹ میں دبک گئے۔ سانڈ نے اگلے کھر سے اکھاڑے کی سیلی مٹی کو کھدیڑا تھوتھنی گھٹنوں کے پاس لا کر ایک جھٹکے کے ساتھ نوکیلے سینگوں سے فضا کو چیرا اور تماشائیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک نوجوان بڑی صفائی سے ٹٹی کی آڑ سے برآمد ہوا چھاتی کے آگے لبادہ جھٹکا اور ایک مہیب آواز نکالی۔ سانڈ بگولے کی مانند اس کی طرف لپکا۔ ایزا بیلا نے گھٹنوں پر رکھے ہوئے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچیں اور نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔ نوجوان بائیں پاؤں پر گھوما اور سانڈ مومنٹم میں اس کے پہلو سے رگڑ کھاتا ہوا دور نکل گیا۔ دوسری کمین گاہ سے ایک اور جوان نکلا۔ ابھی اس نے ٹھیک سے لبادہ جھٹکا بھی نہ تھا کہ سانڈ پہاڑی سے لڑھکتے ہوئے ایک بے ہنگم پتھر کی تیزی سے اس پر آ چڑھا۔ خدا جانے اس نے کیا حرکت کی کہ سانڈ تو آگے نکل گیا لیکن وہ اس کی پچھل سے چاروں شانے چت زمین پر گرا۔ بل کے لوٹنے سے پیشتر تیسرے ساتھی نے ٹٹی کی اوٹ سے سرخ کپڑا ہلایا اور سانڈ نے آگے بڑھ کر لکڑی کے تختے میں اس زور سے ٹکر ماری جیسے کوئی فولادی گولا آ کر لگا ہو۔ سرخ جھنڈی دکھانے والا دو تختوں کے درمیان پچکتا پچکتا بچا۔

سانڈ کی ہر یورش پر تماشائی اپنی اپنی نشستوں سے تین چار انچ اوپر اٹھ آتے اور بے اختیار "اولے" پکارتے۔ ایزا بیلا کا برا حال تھا۔ کبھی دانت بھینچتی کبھی آنکھیں میچتی کبھی مٹھیاں کستی اور کبھی میری طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کرتی۔

کوئی پانچ منٹ تک یہ کھیل جاری رہا۔ اس کے بعد دو گھڑ سوار نیزے لے کر اکھاڑے میں داخل ہوئے۔ ان کے گھوڑے مریل سے تھے اور ران پر گھٹنوں تک کوئی پانچ چھ انچ موٹی مونج کی ٹاٹ جھول کی طرح لٹک رہی تھی۔ سواروں نے اپنی رانوں تک موٹے ڈل والی

لکڑی کا ایک خول چڑھا رکھا تھا اور سر پہ سولا ہیٹ کی وضع کے فلالین کے ٹوپ اوڑھے ہوئے تھے۔ جونہی یہ اندر آ کر اکھاڑے کی دیوار سے لگ کر کھڑے ہوئے۔ سانڈ ان کی طرف لپکا اور سر کو پورے زور سے گھما کر گھوڑے پر وار کیا، مونج کے دبیز ٹاٹ سے سینگوں کی انیاں دور گھوڑے کے جسم تک نہ پہنچ سکیں اور ٹوپی والے تلنگے نے موقع غنیمت جان کر سانڈ کی کوہان میں اپنا نیزہ گڑھ دیا۔ سانڈ اس زخم کی تاب نہ لا کر تلملایا۔ گھوڑے کو چھوڑ کر اور سر پھیرا کر زبان سے زخم چاٹنے کی کوشش کی مگر تھوتھنی کوہان تک نہ پہنچ سکی۔ پھر شاید اس خیال سے کہ اپنے زخم کا بدلہ دوسرے سوار سے لے سکے وہ دوسرے گھوڑے کی طرف لپکا۔ مگر وہاں بھی اس کے ساتھ یہی سلوک ہوا اور پہلے زخم میں ایک نیزہ اور لگنے کی وجہ سے کوہان کی چربی بھی دکھائی دینے لگی۔

بگل بجا گھوڑے واپس چلے گئے اور چست و چالاک نوجوان اپنے اپنے لبادے لے کر پھر زخمی سانڈ کے ساتھ کھیلنے لگے۔ لیکن اب سانڈ میں وہ پہلی سی تندی اور تیزی نہ رہی تھی۔ حملہ کرتا ضرور تھا لیکن لبادہ جھٹکنے والے کے پہلو سے گزر کر اپنے زخم کو چاٹنے کی کوشش کرتا اور ایک دو چکر کھا جاتا۔

بگل پھر بجا اور چھریرے بدن کے تین اور جوان لڑکے ہاتھوں میں کوئی گز بھر لمبی لوہے کی سلاخیں لے کر اندر اکھاڑے میں کود آئے۔ یہ سلاخیں رنگ برنگے پتنگی کاغذوں سے منڈھی ہوئی تھیں اور ان کی نوکیں ڈھلتے سورج کی روشنی میں شیشے کی نلکیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اکھاڑے کے بیچوں بیچ دونوں سلاخوں کو فضا میں بلند کیے لڑکے نے سانڈ کو للکارا اور سانڈ اس بظاہر نہتے آدمی کو دیکھ کر نتھنوں سے دھواں چھوڑتا پوری رفتار سے اس کی طرف دوڑا۔ سانڈ کو خود سے کوئی چھ فٹ کے فاصلے پہ دیکھ کر لڑکا پنجوں کے بل اچھلا اور تالاب میں ڈائیو لگانے والوں کی ہوا میں اپنی کمر کو ایک جھٹکا دیا اور دونوں سلاخیں سانڈ کی زخمی کوہان میں گھونپ دیں۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ سانڈ اس کی رانوں میں سینگ دے کر لڑکے کو باہر

گیلری کی طرف اچھال دے گا مگر نہ جانے اس نے کون سے سرکس میں نوکری کی تھی۔ دونوں ملی ہوئی ٹانگوں کو مچھلی کی طرح گھمایا اور سانڈ کی پچھلی ٹانگوں کے پاس آ کودا۔ سانڈ دیوانہ وار اکھاڑے میں گھوم رہا تھا اور اس کی کوہان میں گھسی ہوئی آہنی سلاخوں کی جھنڈیاں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ اس نے دو تین مرتبہ تھوتھنی سے اس بلا کو نکالنے کی کوشش کی مگر فربہ گردن میں ایسی لچک نہ پیدا ہو سکی۔ جھنڈیاں گڑنے سے سانڈ پھر تند ہو گیا تھا اور آگے بڑھ کر اکھاڑے کے ہر آدمی پر حملہ کر رہا تھا اور ہر آدمی اپنے اپنے لبادے سے اسے جھانسے دے رہا تھا۔ خون کی روانی اور پسینے کی یورش سے سانڈ کے کندھے اور گردن پوری طرح بھیگ چکے تھے اور ان پر اس کے سموں کی دھول خاکستری تہہ بن کر جمتی جا رہی تھی جب تینوں لڑکے باری باری اپنی جھنڈیاں گاڑ چکے تو سانڈ کو کھلانے والے اکھاڑے کی دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے اور ماتا دور اندر داخل ہوا۔ اس کا لباس سب سے خوبصورت خالص ریشم کا تھا۔ سر پر سیاہ رنگ کی ٹوپی تھی اور پنڈلیوں پر گھٹنوں سے نیچے اس نے تنگ مہری کی پتلون کے پائنچے کالے ربن سے باندھے ہوئے تھے۔ پاؤں میں ساٹن کی ٹائی والی گرگابی تھی اور کندھوں پر آج کل کی لڑکیوں کا پہناوا پیلے رنگ کی ابریشمی کرتی تھی جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ ماتا دور نے دونوں پنجے جوڑ کر ایڑیاں اٹھائیں اصیل مرغے کی طرح چھاتی پھلائی اور سرخ لبادے کو ہوا میں یوں پھرایا جیسے ماہی گیر دریا میں جال پھینکتے ہیں۔ چھ تیروں میں بندھا ہوا سانڈ غصے اور کرب سے اس پر جھپٹا اور ماتا دور نے جسم کی ہلکی سی جنبش سے اسے اپنے پہلو سے صاف گزار دیا۔ ہم سب نے "اولے" کے ساتھ تالیاں بجائیں اور ماتا دور نے سر جھکا کر ہمارا شکریہ ادا کیا۔ ایزا بیلا نے ایک چیخ مار کر اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔ سانڈ جو چند قدم پر رک کر پھر حملہ کرنے کے لیے ماتا دور کی طرف لپک چکا تھا۔ صرف ایزا بیلا کو دکھائی دیا تھا۔ ہم تو مزے سے ماتا دور کو سلام کرتے دیکھ رہے تھے۔ اس بے توجہی میں سانڈ کا ایک سینگ ماتا دور کے کولہے پر لگا اور

وہ اپنی ایڑی پر لٹو کی طرح گھوم گیا مگر گرا نہیں۔ میں نے ایزا بیلا کا کندھا تھپکا اور آہستہ سے کہا "سنیور ماتا دور صحیح سالم ہے تم دیکھو تو سہی" اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں تو ماتا دور سانڈ کو جک پھیریاں دے رہا تھا۔ بل اب اس کے بالکل قریب سے حملے کر رہا تھا اور وہ ہر مرتبہ اسے اپنے پہلو سے گزارتے ہوئے کبھی اس کی گردن سہلا دیتا کبھی اس کے سینگوں پر ہاتھ لگا دیتا تماشائی خوشی سے دیوانے ہو کر اس کی ہمت اور فن کی داد دے رہے تھے۔ جب لوگ اس کھیل سے محظوظ ہو چکے تو ماتا دور نے اوپر بالکونی میں صدر کی طرف دیکھا اور تیغ آزمائی کی اجازت چاہی۔ اذن مل گیا تو ماتا دور نے سرخ لبادے کے نیچے سے ایک چمکدار دو دھاری تلوار نکالی اور سانڈ کے عین سامنے کھڑا ہو گیا۔ سانڈ نے اپنے دونوں اگلے کھر ایک ساتھ زمین پر مارے تو ماتا دور نے ذرا ترچھے ہو کر آہنی تیروں کے عین درمیان پوری قوت کے ساتھ چمکتی ہوئی فولادی تلوار اس کی کوہان میں اتار دی جو اس کے کندھوں کی ہڈیوں میں سے ہوتی ہوئی دل میں اتر گئی۔ سانڈ نے ایک کربناک آواز نکالی اور اس کے نتھنوں سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ زبان باہر لٹک گئی اور گوبر سے اس کی دم اور پچھلی دونوں ٹانگیں لتھڑ گئیں۔ وہ تھوتھنی کے بل زمین پر گرا اور پشت کے بل سیلی مٹی پر تڑپا۔ تلوار دستے تک اس کے جسم میں دھنس گئی اور زندگی، طاقت اور حرکت سے بھرپور جسم دیکھتے دیکھتے مٹی کا تودا ہو کر رہ گیا۔ ہم نے منہ میں حلق تک انگلیاں گھسیڑ کر سیٹیاں بجائیں نعرے بلند کیے تالیاں پیٹیں۔ لیکن یہ سارا منظر دیکھ کر ایزا بیلا دکھی سی ہو گئی اور گھٹنوں میں کانوں تک سر دبا کر ساکت ہو گئی۔ لوگ اپنی ٹوپیاں، کوٹ، شراب کی چھاگلیں اندر اکھاڑے میں پھینک رہے تھے۔ عورتیں اپنے جوڑوں سے پھول اتار اتار کر ماتا دور پر گل پاشی کر رہی تھیں اور ایزا بیلا ویسے ہی بے حس و حرکت گٹھڑی بنی ہوئی تھی۔

جب گھنگھرو چھنکاتی تین خچریں سانڈ کی خون پسینے اور گوبر میں لتھڑی ہوئی لاش کھینچنے کے لیے اکھاڑے میں لائی گئیں تو میں نے آہستہ سے ایزا بیلا کی کمر پر ہاتھ رکھا اور ہولے سے کہا "دیکھو بہادر سانڈ کا دروازہ گھسٹنے لگا ہے" اس نے نیم خوابی کے عالم میں سر اوپر اٹھایا

اور بولی "چلو چلیں"۔

میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ اس نے اپنا چھوٹا سا رومال پرس میں بند کیا اور پھر کہا "چلو چلیں"۔

میں نے اس کا کندھا دباتے ہوئے کہا "مگر ابھی تو پانچ بل اور باقی ہیں"۔

اس نے سیٹ پر سے اٹھتے ہوئے جواب دیا "نہیں! ہم جا رہے ہیں"۔

میں اس کے فیصلے میں کوئی ترمیم نہ کر سکا اور چپ چاپ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تھیلا اٹھایا اور اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک دہقانی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تماشائیوں کے پاؤں میں راہ تلاش کرنے لگا۔ کچھ لوگوں نے جن میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی ہماری طرف نفرت اور طنز سے نگاہ کی اور بزدل بھوسڑ بے ذِلے کے الفاظ دہرا کر سرگوشی کرنے لگے۔ میں آگے آگے راہ بناتا جا رہا تھا اور ایزا بیلا میرے پیچھے لوگوں کے پاؤں روندتی ہوئی چلی آتی تھی۔

عمارت سے باہر نکل کر ہم کافی دور تک ایک دوسرے سے بات کئے بغیر چلتے رہے۔ میرا خیال ہے جس سڑک پر ہم چل رہے تھے۔ یہ اسی بڑی سڑک میں جا کر ملتی تھی۔ جہاں آج صبح چلتے چلتے میں نے ٹمیس کی جھنڈوں کو دور سے دریائے کبیر سمجھا تھا۔

ایک بڑے سے گھنے درخت تلے چند میز کرسیاں بے ترتیبی سے پڑی تھیں اور درخت کے تنے کے ساتھ لکڑی کا ایک چھوٹا سا قہوہ خانہ بنا ہوا تھا۔ ادھیڑ عمر کی ایک عورت اپنے اکلوتے گاہک کے لیے کافی تیار کر رہی تھی اور اس کا گاہک میز پر سر رکھے سو رہا تھا۔ چوبی قہوہ خانے کی عین لشت پر ہم دو کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے اور اپنے اپنے تھیلے میز پر ڈال دیے۔ ادھیڑ عمر کی عورت آئی اور آرڈر لے کر چلی گئی۔

ایزا بیلا نے درخت کی ڈالیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "جس طرح عیسیٰ مسیح ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے سولی پر چڑھ گیا تھا۔ اسی طرح سانڈھ ہسپانیہ سے ہر بلا دور رکھنے کے لیے اپنا خون بہاتا ہے اور جب ہمارے ملک پر کوئی بہت ہی بڑی آفت آنے

والی ہوتی ہے تو اکھاڑے میں کسی ماتادور کا خون بہتا ہے اور وہ اپنی قربانی سے ہم سب کی جانیں بچاتا ہے۔"

اس وقت دراصل نہ وہ مجھ سے بات کر رہی تھی نہ درخت کی ڈالیوں سے بلکہ وہ اپنے آپ کو سمجھا رہی تھی اپنے آپ کو یقین دلا رہی تھی کہ قربانی سے سب کچھ ہو سکتا ہے اور قربانی میں خون ضرور بہتا ہے۔

میں نے بڑے خلوص سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پشت دست کو تھپتھپاتے ہوئے بولا "ایزابیلا تم ایک دم اس طرح مغموم کیوں ہو گئی ہو۔"

اس نے شاید میری بات سنی نہیں اور اپنے آپ سے کہنے لگی "قرطبہ کے اسی اکھاڑے میں پالما کا بھورے رنگ کے وحشی بل سے مقابلہ تھا اور اس بل کی خصلتوں سے اصطبل کے نگہبانوں میں سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ ان دونوں پالما میری وجہ سے بہت ہی پریشان رہتا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ اکھاڑے میں اس کی یہ گم شدگی کہیں اس کی موت کی وجہ نہ بن جائے لیکن میری احتیاط سے کیا ہو سکتا تھا بھلا۔ کچھ ایسی طاقتیں بھی ہیں جن کی طرف سے اگر منظوری کا پروانہ نہ آئے تو انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ تم ان طاقتوں کو مانتے ہو نا" اس نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو ایزابیلا میرے ہاتھ کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی: "فائی ایستا کے دن بلا کی تیز ہوا چل رہی تھی اور لڑکوں کے سرخ رومال ان کے گرد لپٹ لپٹ جاتے تھے۔ میں گیلری میں پالما کے ساتھ لگی منہ ہی منہ میں دعائیں مانگ رہی تھی اور وہ مجھے تسلیاں دے رہا تھا۔ جب بھورا بل اندر اکھاڑے میں داخل ہوا کسی کو ٹٹی کی اوٹ سے نکل کر رومال جھٹکنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے اور نتھنوں سے دھوئیں کے بھبھاکے نکل رہے تھے۔ وہ اگلے اور پچھلے کھروں سے جمی ہوئی مٹی اکھاڑ رہا تھا اور ہوا کی تیزی سے سارے اکھاڑے پر ایک بگولا سا ناچنے لگا تھا۔ اس بگولے کے نیچے وہ دیوانگی کی حالت میں ناچتا ہوا بڑے زور سے ڈکرا رہا تھا اور پالما کے مددگار لکڑی کے

تختوں کے پیچھے دبکے ہوئے تھے۔ خدا جانے پوسادا کو کیا سوجھی۔ ہمت کر کے میدان میں آگیا اور مولیتا کو تیزی سے جھٹک کر بل کی طرف بڑھا، لیکن اس دن ہوا اس قدر تیز تھی کہ سانڈ کی موٹی گچھے دار دم بھی بار بار اس کی کمر پہ آگرتی تھی پھر مولیتا کی کیا بساط تھی جو قابو میں رہتا۔ تیزی میں جو اڑا تو پوسادا کے چہرے اور کندھوں سے لپٹ گیا۔ اس نے سانڈ کی چاپ پہ اپنا پہلو بدلا لیکن پھر بھی اس کی جھپٹ میں آگیا اور زمین پہ دور تک لڑھکنیاں کھاتا گیا۔ پالما نے جلدی سے آگے بڑھ کر لکڑی کی دیوار سے اپنا مولیتا اندر لٹکایا اور باہر کھڑے کھڑے سانڈ کو للکارا۔ میں اس کے بازو سے چمٹی ہوئی تھی اور سانڈ آگے بڑھ بڑھ کر دیوار کو ٹکریں مار رہا تھا۔ دیوار پر اس کی ٹکر لگتے سے میں اور پالما گز بھر پیچھے تماشائیوں کی طرف لڑھک جاتے۔ اس دوران میں مددگار دستہ پوسادا کو اکھاڑے سے اٹھا کر لے گیا۔ جب اکھاڑہ صاف ہو گیا اور بُل پھر اسی طرح کھروں سے خاک اڑانے لگا تو پالما نے آنکھ بچا کر اپنا مولیتا میرے سر پہ پھینکا اور خود آہنی تیر اٹھا کر بجلی کی طرح اندر اکھاڑے میں کود گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میں مایوس ہو کر وہیں زمین پہ بیٹھ گئی۔ میں نے دیکھا نہیں لیکن لوگ کہتے ہیں کہ جس صفائی سے پالما نے چھ کے چھ تیر سانڈ کی کوہان میں پروئے ہیں ویسے کوئی بیلی کا پیڑ میں بیٹھ کر بھی نہیں گاڑ سکتا —— پتا ہے یہ سب میری دعاؤں کا نتیجہ تھا۔ جب پالما مولیتا لینے کے لیے باہر نکلا تو وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ میں سرخ نارنجی مولیتا سینے سے لگائے ویسے ہی زمین پر بیٹھی تھی۔ پالما نے کپڑا میرے ہاتھ سے کھینچا تو میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور پاس کھڑے ہوئے خدمت گار کو پانی لانے کے لیے کہا۔ ایک تماشائی نے شراب سے بھری ہوئی چھاگل میرے پاؤں میں پھینک دی۔ میں نے تسمہ کھولا اور مولیتا کے دامن پہ ساری چھاگل انڈیل دی۔ پھر مٹی کی مٹھیاں بھر بھر کر دامن پہ ڈالیں۔ انگوری شراب کے کیچڑ سے دامن بھر گیا اور مولیتا کا نچلا حصہ کافی بھاری ہو گیا۔ پالما نے مجھے پوسادا کا صلیب کا نشان بنایا اور اکھاڑے میں کود گیا۔ اب کے میں بیٹھی نہیں بلکہ بڑے حوصلے کے ساتھ ہو لی

دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی رہی۔ تند ہوا مولیتا کو اڑاتی تھی مگر دامن بوجھل ہونے کے باعث وہ اتنا اونچا نہ اڑ سکتا تھا کہ پالما کے کندھوں پر لپیٹ جاتا۔ اس نے وحشی بل کو ایسے ایسے جھانسے دیئے کہ صدر اور اس کے ساتھی بھی چیخ چیخ کر داد دینے لگے۔ بل کو اپنی طرف بلا کر وہ اس خوبصورتی سے مولیتا اپنی کمر کے گرد لپیٹتا کہ آندلوسیا کی کوئی رقاصہ لہنگا اڑاتی ہوئی رقص کرتی دکھائی دیتی۔ بُل اس کے پہلو سے گھسٹتا ہوا گزر جاتا۔ تماشائی "اولے" پکارتے اور میں خوشی سے آنکھیں بند کر لیتی۔

بگل کی آواز پر پالما نے دونوں ہاتھ پھیلا کر صدر سے تلوار گھونپنے کی اجازت طلب کی۔ ابھی صدر نے اشارہ نہ کیا تھا کہ بل کنی کاٹ کر اس پر لوٹ پڑا اور تھوتھنی زمین سے لگا کر پالما کے پہلو میں اس زور سے ٹکر ماری کہ وہ ہوا میں دس بارہ فٹ اوپر اچھل گیا اور پھر جو گرا تو اٹھ نہ سکا۔ اس کے شاگرد اوٹ سے نکل کر بل کو جھانسے دینے لگے اور وہ ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پالما نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کا سر پھر زمین پر گر گیا۔

"مر گیا؟" میں نے سانس روک کر پوچھا۔

"تمہارے منہ میں خاک" ایزا بیلا نے ہاتھ کھینچ کر کہا۔

"خدا نہ کرے پالما کو کبھی بھی کچھ ہو!" ایزا بیلا کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے۔

"پھر کیا ہوا" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"میں لکڑی کی دیوار سے لگی پوری طاقت کے ساتھ چلائی اٹھو پالما — اٹھو — تمہیں اس بل کو ختم کرنا ہے۔ تمہارے سوا کوئی اسے مار نہ سکے گا۔ اٹھو پالما — اٹھو — تمہیں میں کہتی ہوں اٹھو — میری آواز سن کر پالما یوں اٹھ کھڑا ہوا جیسے اسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ جب اس نے اپنے دونوں قدم زمین پر جما کر تلوار ہوا میں لہرائی تو اس کی ران پر خون کی ایک تیز دھار بہہ نکلی۔ وہ لنگڑاتا ہوا بل کی طرف بڑھا اور

بھوکے درندے کی طرح تلوار سونت کر اس پر پل پڑا۔ بازو کی ایک ماہرانہ حرکت سے تلوار بھوڑا چھرا کاٹتی دستے تک بل کے اندر دھنس گئی۔ بل نے اچھلنے کی کوشش کی مگر اچھل نہ سکا۔ یالما نے ایک طرف ہٹنے کی کوشش کی مگر ہٹ نہ سکا اور قاتل و مقتول دونوں پہلو بہ پہلو خون سے رنگی ہوئی زمین پر لیٹ گئے۔

"پھر" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"پھر!" ایزابیلا نے بڑے تحمل سے کہا "یالما نے میڈرڈ کی ایک ڈاکٹر سے شادی کر لی اور قرطبہ چھوڑ کر میڈرڈ میں آباد ہو گیا۔"

"اور تم ......تم ....." میں نے رکتے ہوئے کہا "تم یالما سے نہ مل سکیں۔"

"نہیں"۔ ایزابیلا نے ناخن سے میز کو کھرچتے ہوئے کہا "پھر یالما مجھ سے ملا ہی نہیں اور میں میڈرڈ کے پلازا میں کبھی بُل فائیٹ دیکھنے گئی ہی نہیں۔ میری ممی نے کہا محبت کے سلسلے میں ہم سے کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ضرور ہو جاتی ہے جبھی تو ہم کسی دل کے سنگھاسن پر جگہ نہیں پا سکتیں۔ میرے پیدا ہونے میں تین ماہ باقی تھے کہ میرا باپ میری ماں کو چھوڑ کر ایک فرانسیسی عورت کے ساتھ پیرانیز کے پہاڑوں کے اس طرف جا کر آباد ہو گیا اور لوٹ کر نہ آیا۔"

میں نے ایزابیلا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف کھینچا اور اس نے اپنا گال میرے بازو پر رکھ دیا۔ میں نے کہا "محبت کے میدان میں کسی بھی کھلاڑی کا بس نہیں چلتا۔ جب اوپر سے ایک پروانہ دھر لگ کر آ جاتا ہے تو کھیل کا فیصلہ خود بخود ہو جاتا ہے۔ اور یہ ضروری نہیں ہوتا کہ فیصلہ اسی کے حق میں ہو جس نے زیادہ تپسیا کی تھی۔"

ایزابیلا نے جیسے نیند میں ڈوبے ہوئے پوچھا "مگر ایسا کیوں ہوتا ہے۔"

میں نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "میں تمہیں کیا بتاؤں مجھے تو بس اسی قدر معلوم ہے کہ:

"عین عشق دریا دی جدوں لہر و گے ہئی تر دیاں کرماں والڑیاں
کئی کو ہجیاں لنگھ لنگھ یار گیاں تے دب مویاں شرماں والڑیاں
اک سوہنیاں دے متھے بھاگ ناہیں باہر ڈس لال نے اندوں کالڑیاں
یار فرید جے جا کرم کرے عیباں والیاں دے متھے لالڑیاں"

ایزا بیلا سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور مجھ سے اس کا مطلب پوچھنے لگی۔ میں نے بمشکل تمام اس کا مفہوم سمجھایا تو شاعر کا پورا نام اور اس کی زندگی کے حالات پوچھنے لگی۔ میں نے بتایا کہ جو درجہ عیسائیوں کی نظر میں آسیسی کے سان فرنچیسکو کا ہے وہی غلام فرید کا ہمارے یہاں ہے۔

ایزا بیلا نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہمارے یہاں سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"ہمارے یہاں" ۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "ہمارے موروں کے یہاں ہمارے مسلمانوں کے یہاں"۔

ایزا بیلا کو ایک ثانیہ کے لیے دھکا سا لگا پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور آنکھیں نچاتے ہوئے بولی "سچ مچ تم شکل سے مور ہی دکھائی دیتے ہو"۔

"شکل ہی سے نہیں" میں نے حوصلہ کر کے کہا "دل سے بھی ہوں"۔

"نہیں" وہ زور سے چیخی۔

"سچ" میں نے دبی زبان سے کہا۔

"میری قسم کھاؤ" ایزا بیلا نے دردناک آواز میں کہا۔

"تمہاری قسم"۔

اس نے اپنی دونوں مٹھیاں بھینچ کر زور سے میرے کندھوں پہ ماریں اور اپنا سر میری چھاتی پہ رکھ دیا اور ہولے ہولے کراہنے لگی "نہیں ——— ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم مسلمان نہیں ہو ——— تمہاری باتوں میں اتنی مٹھاس ہے۔ تمہاری گرفت میں اتنا خلوص ہے۔ تمہاری

آنکھوں میں ایسی محبت جھلک رہی ہے کہ تم مسلمان ہو ہی نہیں سکتے ۔۔۔ مور کہلا ہی نہیں سکتے ۔۔۔" پھر اس نے میری گردن کے گرد بازو ڈال کر اپنے آپ سے کہا" کہیں نہ کہیں ضرور مجھ سے کوئی چوک ہوئی ہے ورنہ تم مسلمان نہ ہوتے۔"

ہوا سے اس کے بالوں کی تاریں میرے چہرے پر لگیں تو میں نے گرفت مضبوط کر کے کہا" میں تو مذہب وذہب میں ذرا بھی اعتقاد نہیں رکھتا۔ خواہ مخواہ خون بہانے کے لیے پناہیں بنا رکھی ہیں۔ میرے ماں باپ البتہ مسلمان ہیں۔"

" اور دادا دادی" اس نے ہولے سے پوچھا۔

" وہ بھی مسلمان تھے" میں نے خفیف ہو کر کہا۔

" تو پھر تم یہاں کیا لینے آئے ہو"۔ اینا بیلا نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

" تم سے ملنے۔ اپنے رشتہ داروں سے ملنے۔ اپنے عزیزوں ۔۔۔۔"

اینا بیلا پھر سنبھل گئی اور بات کاٹ کر بولی" ہم سے کیوں۔"

میں نے کہا" اس لیے کہ تم ہمارے ہی تو ہو ۔۔۔ ہم ہی سے تو ہو۔ ہمیں تو ہو۔ وہ ٹک ٹک میری طرف دیکھے جاتی تھی اور میں عین اسی کے انداز میں کہہ رہا تھا" اگر تم یہاں نہ ہوتیں۔ اگر یہ مسجد اس جگہ نہ ہوتی اور اگر تم اپنے آپ کو ہسپانوی کے بجائے فخر سے اندلسی نہ کہلواتے تو پھر میں یہاں کیوں آتا بھلا"! اینا بیلا نے ایک طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

" تو یہ مسجد تمہاری ہے۔"

میں نے کہا" ہم دونوں کی ہے۔ اس لیے کہ ہم ایک ہیں۔"

اینا بیلا نے پوچھا" تو قرطبہ میں تم صرف یہ مسجد دیکھنے آئے ہو۔"

میں نے کہا" میں خود نہیں آیا۔ بلوایا گیا ہوں۔ یہاں ہمارے شاہ عنایت صاحب رہتے ہیں اور مچھلی پکڑنے والوں کی طرح ہمارے دلوں پہ کنڈیاں ڈال کر بیٹھے

ہیں۔ جس کو چاہتے ہیں کھینچ کر پاس بلا لیتے ہیں اور کسی کو پتا بھی نہیں چلتا۔"

ایزابیلا حیران ہو کر میرا منہ تکنے لگی اور پھر میز سے اپنا پرس اٹھا کر اپنے آپ سے بولی "کہیں نہ کہیں پھر غلطی ہوئی ہے۔"

وہ اٹھ کر چل دی تو میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا اور بل فائیٹ کے پلازا سے لیکر یہاں تک ہم جس خاموشی کے ساتھ اکٹھے آئے تھے ویسے ہی واپس چلتے رہے۔ بڑے چوک پر اس نے رک کر پوچھا "سینما چلو گے۔"

میں نے انکساری کے ساتھ کہا "سخت تھکا ہوا ہوں" اور گزشتہ رات بھر کے رت جگے سے میری آنکھیں مچی جا رہی ہیں۔ پھر صبح سویرے مجھے مسجد دیکھنے بھی جانا ہے۔ آج نہیں کل چلیں گے۔"

ایزابیلا نے اطمینان سے کہا "جیسے تمہاری مرضی۔ لیکن میں تو فلم دیکھ کر گھر آؤں گی۔ تم سونا چاہتے ہو تو سیدھے یہیں سے گھر چلے جاؤ۔ راستہ معلوم ہے نا"

میں نے کہا "ہاں یہاں سے تو آسان ہی ہے۔"

ایزابیلا مسکرائی اور مجھے چوراہے کے بیچ چھوڑ کر دوسری طرف مڑ گئی۔

اس رات مجھے بس اس قدر یاد ہے کہ پانسی اادن پہنچ کر میں نے ایک کا بی شور بہ پیا۔ دانت صاف کیے اور بستر کے ساتھ لگتے ہی گہری نیند سو گیا۔ شاید میں دن چڑھے کب تک اسی طرح جوانی کی نیند سویا رہتا اگر پانسی اادن کی مالکہ مجھے جھنجھوڑ کر جگا نہ دیتی۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور بچوں کی طرح منہ سے میچا کے مارتے ہوئے تکیہ کے نیچے سے ٹٹول کر سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ میں نے ابھی سگریٹ سلگایا ہی تھا اور دیا سلائی کی روشنی میں گھڑی دیکھ رہا تھا کہ ترشی ہوئی مونچھوں والا ایک لمبا تڑنگا جوان میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے مسکرا کر مجھے خالص اندلسی انداز میں صبح بخیر کیا اور کرسی کھینچ کر میرے پاس بیٹھ گیا۔ جب اس نے میرے کمرے میں اس طرح داخل ہونے پر معذرت طلب کی تو مجھے پتا چلا کہ وہ ضرورت کے

مطابق تھوڑی بہت انگریزی بول سکتا ہے۔ میں نے سگریٹ پیش کی اس نے شکریہ کے ساتھ لوٹا دی اور پائپ نکال کر پینے لگا۔ بجھی ہوئی دیا سلائی کان میں پھیر کر بولا۔

"سینور آپ غرناطہ جائیں گے ۔"

میں نے کہا "ہاں! لیکن ابھی میں چند دن آپ کے قرطبہ میں اور قیام کروں گا کیونکہ مجھے مسجد اور مدینۃ الزہرا کی سیر کرنا ہے۔"

اس نے بڑی شائستگی سے جواب دیا "مجھے افسوس ہے سینور کہ آپ یہاں قیام نہ کر سکیں گے ۔"

ایک لمحہ کے لیے مجھے یوں لگا جیسے کمرے کی بتی بجھ گئی ہو۔

اس نے مسکرا کر مجبوری ظاہر کرتے ہوئے کہا "غرناطہ والی لاری چلنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی ہے اور مجھے حکم ملا ہے کہ آپ کو اس میں سوار کرا کے آؤں۔"

"کسی نے آپ کو ایسا احمقانہ حکم دیا ہے" میں چیخ کر پوچھا۔

"محکمہ نے" اس نے اپنے کوٹ کا کالر الٹا اور اس کے نیچے مجھے ہسپانیہ کا سرکاری نشان پیتل کے بیضوی ٹکڑے پر کھدا دکھائی دیا۔

اس نے اپنے پائپ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا "مجھے بے حد افسوس ہے کہ ہم آپ کی میزبانی نہ کر سکے۔ حکم کے آگے کس کا بس چلتا ہے بھلا۔"

"اور اگر میں آپ کا حکم نہ مانوں تو" میں نے پوچھا۔

"پھر آپ کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور میرا خیال نہیں کہ آپ ....." اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور مالکہ کو آواز دے کر پوچھا "کافی تیار ہو گئی کیا۔"

باورچی خانے سے مالکہ کی آواز سنائی دی اور وہ ناشتہ کی ٹرے لے کر میرے کمرے میں پہنچ گئی۔ کافی پیتے ہوئے میں نے یونہی اپنی نبض پر انگلی رکھی تو مجھے ایسا لگا جیسے زندگی حرکت اور امنگوں سے بھرپور تنومند سانڈ کو تیروں اور تلواروں سے ہٹھنڈا کر کے چست و چالاک نوجوان

اپنی اپنی کمیں گاہوں میں واپس چلے گئے ہوں اور اب گھنگھرو چھنکاتی خچر اس کی لاش گھسیٹنے آئی ہو۔ میں سفر کی تیاری کچھ اس خلوص اور دیانت داری سے کر رہا تھا جیسے میں نے ہی سی آئی ڈی کے اس ملازم کو اپنے نکالنے کے احکامات دیئے ہوں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے قرطبہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہو اس میں کھپریل والی ایک چھوٹی سی مسجد کے مٹتے ہوئے سے آثار ہوں یہاں ایک برساتی نالہ سا بہتا ہو اور پیرس یا روم کی طرح کی یہاں کوئی قابلِ دید چیز موجود نہ ہو۔

ٹائی بندھ چکی تو میں بالنسی ادن کا بل ادا کر کے چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اہل کار نے آگے بڑھ کر میرا تھیلا پکڑ لیا اور دروازے کا پٹ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

"خوش بختی! خوش وقتی! خیریت کا سفر" مالکہ نے دعا دی۔

"خوش بختی! خوش وقتی سلامتی اور سکون" میں نے جواب میں کہا اور ایزا بیلا کو دیکھے بغیر اہل کار کے ساتھ بالنسی ادن کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

جب ڈرائیور نے لاری کا سلف دبایا تو میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا پورے چوبیس گھنٹے پیشتر بالکل اسی وقت صبح کاذب کا سماں تھا اور ہماری گاڑی قرطبہ کے سٹیشن پر آ لگی تھی عین اسی وقت ہمارے ڈبے کے پادری اور دونوں عورتوں نے مجھے دُعا دی تھی۔ ایک قلی میرا سامان لے کر چلتا بنا تھا۔ باقی کے دو میرے بازو تھام کر زور آزمائی کرنے لگے تھے اور قرطبہ کے سٹیشن پر مختصر سی طاقت کے چھوٹے سے بلب کا فلامنٹ تمتما تمتما کر عاجز آ گیا تھا ——

جب ہماری لاری بڑی سڑک پر چڑھنے کے لیے مڑی تو فیردی ناندو چھپر کے پاس جھاڑو دے رہا تھا اور کوکلے تلنے والی لڑکی ابھی نہ آئی تھی۔ میں نے بڑی سڑک کے دونوں کناروں پہ کھجوروں کی ڈالیوں میں سے صبح کاذب کی دلکشی دیکھنے کو نظریں جمائیں تو جامع قرطبہ کے کلیسا سے گجر کی پکار بلند ہوئی مسجد کے مینارِ بلند میں کانسی کا ڈولتا ہوا گھڑیال جب ہماری لاری کی طرف منہ کرتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے اپنی طرف بلا رہا ہو اور جب آہنی رسّہ کی کھینچ اس کا منہ دوسری طرف موڑ دیتی تو ایسے لگتا جیسے گاؤں والے کسی ٹیلے پر چڑھ کر

قافلے والوں کو الوداع کہہ رہے ہوں۔

سورج طلوع ہونے سے ذرا پہلے قرمزی رنگ کی روشنی آسمان کے مشرقی کنارے پر پھیلنے لگی تھی اور عرشِ منور سے بانگ کی آواز بلند ہونے لگی تھی۔

لاری پہاڑی راستوں پر بل کھاتی ہوئی قرطبہ سے دور ہو رہی تھی ـــ کسی پادری کا ہاتھ آہنی رسہ نہیں کھینچ رہا تھا بلکہ شاہ عنایت نے بلھے شاہ کو اپنے حضور سے دھتکار کر پھر ڈور کھینچنا شروع کر دی تھی ـــ عشق کے سلسلے میں پھر کسی سے کہیں کوئی غلطی ہو گئی تھی۔

"ہے تورو"

جب لاری ڈھلان پر اترتی اور ڈرائیور بریکیں باندھتا تو دل یوں پھڑپھڑاتا جیسے جنگلی کبوتر بند کابک دان سے باہر نکلنے کو زور لگاتا ہے بھیڑیں دبی زبان سے ممیاتیں اور ان کا مالک سر کھجا کر ایک بڑا سا گلفا کھڑکی کے باہر تھوک دیتا۔ کھڑکی کھلنے سے بارش کے چھینٹے بھی اندر آتے۔ اس کے ساتھیوں نے اسے بار بار کھڑکی کھولنے سے منع کیا تو وہ اندر ہی تھوکنے لگا۔ شاید بل کھاتے پہاڑی راستے پر اس کا جی متلا رہا تھا۔

لاری میں کل چھبیس سواریاں تھیں، چوبیس آدمی اور دو بھیڑیں۔ کچھ آدمی سیٹوں پر تھے باقی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے آدمیوں کی گودوں میں۔ دو عورتیں تھیں ایک برتنوں کی بوری پر بیٹھی تھیں۔ دوسری بھیڑوں کے پاس فرش پر۔ وہ اپنے بھیگے ہوئے لہنگے کو بار بار نچوڑتی تھی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی تھی۔ لاری کی کھڑکیاں اور شیشے بند تھے۔ بارش کی پھوار سی اندر آتی تو تھی لیکن اس قدر نہیں کہ اس سے فرش بھیگ جاتا۔ شاید بھیڑیں بارش سے ڈر رہی تھیں۔ جونہی بادل گرجتا وہ اپنی اپنی جگہ پر لرزتیں ایک دوسری سے سرگوشی میں ممیاتیں اور وہ عورت پھر لہنگا نچوڑنے لگتی!

چاروں طرف چٹیل پہاڑوں کا ایک سلسلہ چل رہا تھا۔ نہ کہیں سبزی تھی نہ آبادی کا نشان، نہ کوئی مسافر نظر آتا تھا نہ راہزن۔ بس بل کھاتی ہوئی ایک نیم پختہ سی پگڈنڈی تھی جسے انسانی ہاتھوں نے بنایا تھا اور جب یہ پگڈنڈی نما سڑک بن رہی ہوگی تو یہاں انسانوں کی شکلیں ضرور دکھائی دیتی ہوں گی۔ کہیں کہیں کئی ایک میل کی مسافت طے کرنے کے بعد نیچے وادی میں اکا دکا کھجور کا درخت نظر آجاتا۔ اس کے اردگرد کی زمین یوں دکھائی دیتی جیسے کبھی یہاں کوئی بستی آباد رہی ہو۔ لوگوں نے حد بندیوں اور بٹواروں پر ایک دوسرے کو قتل کر دیا ہو اور ان کے مچھر، گدھے اور بھیڑ بکریاں چارہ نہ ہونے سے مر گئی ہوں۔

کلینر اپنی جھولی میں ادھ کٹی ٹکٹیں اور واؤچر ڈالے بیٹھا تھا۔ اس نے پنسل منہ میں ڈال کر کئی مرتبہ انگلیوں پر گنا تھا، لیکن جیب کی رقم حساب پر پوری نہ اترتی تھی۔ اب وہ ڈرائیور کی طرف منہ کئے شیشے پر سُرخ روغن سے لکھے ہوئے الفاظ دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں نہ لاری کے اندر تھیں نہ باہر، بلکہ حساب کے ہندسوں پر تھیں جو اس کے ذہن میں ریت پر قلابازیاں لگانے والے بچوں کی طرح شرارتیں کر رہے تھے۔ لاری کے اندر جگہ جگہ شعر اور مقولے لکھے تھے لیکن ڈرائیور کے سامنے ربڑ والے ہارن کے ساتھ بس ایک ہی جملہ لکھا تھا۔ و لا غالب الا اللہ۔

لاری قرطبہ سے غرناطہ جا رہی تھی!

بارش کے چھینٹے موٹر کے شیشوں اور کھڑکیوں سے سر پھوڑ رہے تھے اور بھیگی ہوئی ربڑ کے گھسے ہوئے ٹائر سڑک کا سینہ چاٹ رہے تھے۔ سوروں کے چھوٹے چھوٹے غول موسلا دھار بارش میں سڑک کے کنارے ڈھیروں پر تھوتھنیاں چلا رہے تھے اور ان کے چرواہے بڑے بڑے درختوں تلے دبکے ہوئے تھے۔ سارے درخت بارش سے شرابور ہو رہے تھے اور اب ان کے نیچے پناہ لینے والے جانے کس چیز سے اپنے آپ کو بچا رہے تھے!

جب ہم غرناطہ کے اڈے پر پہنچے تو دوپہر کا ایک بجا تھا اور اڈے کا مینیجر برآمدے میں کھڑا ایک بھدّے سے پائپ کو یوں پی رہا تھا جیسے کسی پلّے کو جلدی جلدی پچکار رہا ہو۔ میں نے بڑی ہمت کی جو اپنا اٹیچی کیس کھینچ کر سب سے پہلے دروازے کی طرف لپکا۔ کلینر نے دروازے پر میری کلائی پکڑ لی اور غصّے سے غرّایا۔ میں نے اطالوی میں پوچھا "یہ غرناطہ نہیں ہے؟" وہ میری بات سمجھ گیا اور سر ہلا کر بولا "یہی ہے لیکن ....." پھر اس نے بائیں ہاتھ کا پنجہ کھول کر انگلیاں ہلاتے ہوئے جیسے کہا "وہ کہاں ہے؟" میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا میرے ساتھ ایک لحیم شحیم ہسپانوی بوڑھا تماکو کی پوٹلی کھول کر اس میں سے ٹکٹ نکال رہا تھا مجھے معلوم ہو گیا کہ کلینر کیا چاہتا ہے۔ کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر میں نے مُسلا ہوا ٹکٹ نکالا اور اس کے حوالے کر دیا اور مجھے اسی طرح رکوع کی حالت میں دروازے سے باہر نکلنے کی اجازت مل گئی۔

لاریوں کا اڈہ عین سڑک کے کنارے واقع تھا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جیسے ہمارے یہاں چنگی خانہ

ہوتا ہے۔ اس کے دونوں جانب برآمدہ تھا جس کے ایک کونے میں لکڑی کا بنچ پڑا تھا اور دوسرے میں سامان تولنے کا کانٹا۔ بنچ پر سامان اٹھانے والے لڑکے بیٹھے تھے اور دیواروں کے ساتھ وہ سواریاں ٹیک لگائے کھڑی تھیں جو پہلی لاری سے پہنچی تھیں اور بارش تھمنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ جونہی میں نے برآمدے میں قدم رکھا بنچ پر بیٹھے ہوئے لڑکے بھیگی ہوئی چھچھوندروں کی طرح جھپٹے اور میرے اٹیچی کیس سے لپٹ گئے۔ کوئی پانسیوں پانسیوں پکار رہا تھا کوئی ہوتل ہوتل اور میرے کندھوں پر اور کمر پر بارش کی بوچھاڑ باڑھیں مار رہی تھی۔ ظالم برآمدے کے اندر گھسنے ہی نہ دیتے تھے؛

بارش کی شدت اور لاری کے پیچ پیچ سفر سے سر میں ایسا شدید درد ہو رہا تھا کہ میں اپنی زندگی اور غرناطہ دونوں سے بیزار تھا۔ میں نے جھلا کر اٹیچی کیس لڑکوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا۔ اور خود کوٹ کے کالر اٹھا کر باہر سڑک پر چلنے لگا۔ پتہ نہیں ان لڑکوں کے درمیان چھینا جھپٹی کب تک ہوتی رہی تھی کیونکہ جب کامیاب قلی میرا اٹیچی کیس لے کر میرے برابر پہنچا تو وہ بری طرح ہانپ رہا تھا اور اس کے چہرے پر بارش سے زیادہ پسینے کے قطرے تھے۔ میں نے بیزاری سے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا کر بولا "پانسیوں؟" میں نے کچھ انگریزوں کا سا چہرہ بنانے کی کوشش کی اور رعب کے ساتھ کہا "ہوتل!" وہ میرا مطلب سمجھ گیا اور مجھے کہنی سے پکڑ کر دائیں ہاتھ کی سڑک پر گھما دیا۔ بارش کی وجہ سے میرا لندن کا خریدا ہوا کوٹ بھیگی بلی بن چکا تھا اور اس میں سے وہی ہمک آنے لگی تھی جو اس دکان سے آتی تھی، جہاں سے میں نے یہ کوٹ خریدا تھا۔ لڑکا تھا سمجھ دار، مجھے ایک ایسے ہوٹل میں لے گیا جس کے اخراجات میری پہنچ سے زیادہ نہ تھے، لیکن اس کا لاؤنج اور کونٹر ایسا تھا کہ اگر آپ اس کا فوٹو دیکھ لیں تو آپ کو اس سچی بات کا یقین ہی نہ آئے۔

کونٹر پر ادھیڑ عمر کا ایک خوبصورت آدمی اپنی سیاہ مونچھیں مروڑ رہا تھا، مجھے دیکھ کر اپنی سیٹ سے اٹھا اور بڑے تپاک سے کندھے جھکا کر خوش آمدید کہا۔ اس کے ساتھ والی کرسی پر ایک گدگدی سی لڑکی ٹائپ رائیٹر پر سر رکھے سو رہی تھی۔ جب اس نے قلی کی آواز سنی اور ایک نئے گاہک کی آدم بو محسوس کی تو ٹائپ رائیٹر سے سر اٹھایا۔ دراز کھولا اور ایک پسیتا نکال کر قلی کی طرف بڑھا دیا: میں سمجھا

وہ میری طرف سے اُجرت دے رہی ہے لیکن جب قلی اسی طرح کھڑا رہا اور کونٹر کی دونوں ہستیاں میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگیں تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے جیب سے چند بھیگے ہوئے نوٹ نکال کر لڑکی کی طرف بڑھا دیئے۔ اس نے ہسپانوی میں کچھ پوچھا اور میری ہتھیلی سے ایک نوٹ اٹھا کر قلی کے حوالے کر دیا۔

مجھے پہلی منزل پر ایک چھوٹا سا کمرہ ملا۔ دروازے کے قریب لکڑی کے ایک لمبے سے سٹینڈ میں مٹی کا گملا رکھا تھا جس میں پام کا پودا لگا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کا تالا کھولتے ہوئے اس پودے کی طرف دیکھا اس کا چوڑا پتا جھیر ہو رہا تھا۔ جیسے دو اجنبی اس پودے کے پاس کھڑے باتیں کرتے رہے ہوں۔ آدمی کچھ پوچھتا رہا ہو اور عورت کسی بات کا جواب دیئے بغیر چپ چاپ اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے پام کا پتا چیرتی رہی ہو۔ پودے کی جڑ میں سگریٹ کی ایک خالی ڈبیا اور چوکولیٹ کا گچھا مچھا پیکنگ پیپر پڑا تھا۔

جب میں اپنے کمرے سے باہر نکلا تو بھیگا ہوا سوٹ میرے بازو پر تھا اور میں نے ملیشیا کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی کندھوں پر چھوٹی آپا کی دی ہوئی شال تھی اور پاؤں میں کاڑھی ہوئی پشاوری چپل۔ لکڑی کے ذرا سے جھومتے ہوئے زینے کا سہارا لے کر میں نیچے اترا اور پھر کونٹر پر جا کھڑا ہوا۔ مینجر نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بھیگا ہوا سوٹ میرے بازو سے اٹھا لیا۔ پھر اس نے گھنٹی بجا کر ملازمہ کو بلایا اور سوٹ اس کے حوالے کر دیا۔ کونٹر کی لڑکی ایک لمبا سا گلابی کاغذ ٹائپ کر رہی تھی اور اس کے پاس ایش ٹرے میں لمبے سے گل والا سگریٹ پڑا سلگ رہا تھا۔ میں نے کونٹر پر جھکے جھکے مینجر سے کہا۔ "کافی پیوں گا" اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا اور لرزتے کیل والی گھنٹی کھڑکائی۔ جب دوبارہ ملازمہ اندر داخل ہوئی تو میں نے کہا۔

"تین کافی!"

"تین؟" مینجر نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں تین" میں نے اطمینان سے کہا۔ "ہم تینوں کافی پئیں گے۔ کیوں سنو رہیتا؟"

"شکریہ" سینوریتا نے ایش ٹرے سے اپنا سگریٹ اٹھایا اور لمبا سا کش بھر کر پھر ٹائپ کرنے لگی۔

خادمہ چلی گئی تو منیجر نے پوچھا "آپ پہلے بھی کبھی غرناطہ آئے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ پہلا موقع ہے اور اگر پھر کبھی قسمت نے یاوری کی تو قرطبہ سے غرناطہ نہ آؤں گا۔ سیدھا میڈرڈ سے پہنچوں گا۔"

"بے شک بے شک" منیجر بولا۔ "لاری کا سفر بڑا تکلیف دہ ہے، میں ایک مرتبہ لاری سے گیا ہوں اور ساری عمر کے لیے کانوں کو ہاتھ لگا لیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "بڑے خوش قسمت ہیں آپ جو کانوں کو ہاتھ لگا لیا ہے یہاں تو سرے سے کان ہی غائب ہو گئے ہیں۔"

منیجر ہنسا اور بڑے تپاک سے ہاتھ پھیلا کر سامنے دیوار کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ جہاں بید کا ایک صوفہ سیٹ رکھا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ "پورے آٹھ گھنٹے ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے مٹی کی مورت بن گیا ہوں۔ اس وقت مجھے کھڑا ہی رہنے دیجئے۔"

وہ اپنی چھوٹی چھوٹی سیاہ آنکھیں بند کئے یونہی مربیانہ ہنسی ہنس رہا تھا کہ اچانک داخلے کے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں لپٹا ہوا ایک جوان آدمی لوہے کا ایک بینگا ٹیڑھا تسلا اٹھائے اندر داخل ہو رہا تھا۔

منیجر اسے دیکھتے ہی زور سے چلایا۔ "بے تور دہ!"

اور داخل ہونے والا یوں تڑپا جیسے کسی درندے نے اس پر حملہ کرنے کو جست بھری ہو۔ تسلا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا اور اس میں کی میٹھی گولیاں، مٹھائی کی ڈلیاں اور چنے کی دال کے لڈو اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ وہ رکوع کی حالت میں بجلی کی سی تیزی سے تڑپا اور میرے قریب کونٹر میں اس زور سے ٹکر ماری کہ سارا کمرہ گونج اٹھا۔

سینوریتا اور منیجر نے تالی بجائی۔ نوجوان نے اپنی میلی جیکٹ فلیٹ اتار کر پہلے ان دونوں کو

اور پھر مجھے جھک کر سلام کیا۔ اس کے بعد بڑے آرام سے فرش پر بیٹھ کر اپنی وہ چیزیں چننے لگا جو تسلے سے باہر گر گئی تھیں۔

کافی آ گئی اور ہم تینوں بید کے صوفے پر جا بیٹھے۔ میری نگاہیں ابھی تک اس آدمی پر جمی ہوئی تھیں جو دو زانو ہو کر سڑی بساندھی گولیاں اکھٹی کر رہا تھا۔ جتنی دیر میں کافی کے برتن میز پر لگے وہ اپنا سودا اسمیٹ کر تسلے میں ڈال چکا تھا۔ مینجر نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہوا میں لہرایا۔ وہ ٹوپی اتار کر ٹخنوں تک جھکا اور اپنا تسلا اٹھا کر ہوٹل سے باہر نکل گیا۔

سینورِیتا نے تینوں پیالے کافی سے لبالب بھر دیے، جب اس نے چوتھی مرتبہ شکر کی مقدار پوچھی تو میں چونکا۔ مینجر نے ایک اونچا سا قہقہہ لگایا اور بڑی بے تکلفی سے میرا کندھا تھپک کر کہا۔ "گھر کی یاد آ رہی ہوگی!"

میں نے اس کی بات اَن سنی کر کے پوچھا "یہ کون تھا؟"

"کون؟" مینجر نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی جو ابھی آیا تھا۔ میٹھی گولیاں بیچنے۔"

"اوہ — یہ ..... یہ ایک خوانچے والا ہے، بہت تنگ کرتے ہیں یہ لوگ۔ ہوٹلوں میں گھس آتے ہیں، غیر ملکیوں سے پیسے مانگتے ہیں۔ ان کے سامنا نہیں دھتکارا بھی نہیں جا سکتا۔"

"میں نے کہا " لیکن یہ تو کوئی دیوانہ دکھائی دیتا ہے۔"

مینجر ہنسا اور پائپ سلگاتے ہوئے بولا "سبھی اسی طرح کے دیوانے ہوتے ہیں۔ نہ انکے پاس کوئی کام کی چیز ہوتی ہے نہ کسی کی دلچسپی کی۔ بس یونہی ٹکے ٹکے کا سودا لیے پھرتے ہیں — لیجیے آپ کی کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

"میں نے انگلی سے پیالی کا کنارہ چھوا اور جیسے اپنے آپ سے کہا "کیا یہاں کے سارے خوانچے والے اسی طرح کرتے ہیں؟"

"سب" مینجر نے وثوق سے کہا۔

"سبھی اسی طرح تڑپ تڑپ کر کونٹروں میں ٹکریں مارتے ہیں ؟"

"او نہیں" مینجر ہنسا۔ "ٹکریں تو بس یہی ایک مارتا ہے ۔ عجیب خبط ہے ، اپنے آپ کو تورو سمجھتا ہے ۔"

"تورو!" میں نے حیرانی سے کہا۔ "تورو کیا ؟"

"سانڈ ، بُل !" مینجر نے ویسی حیرانی سے جواب دیا۔ "آپ نے کبھی بُل فائیٹ نہیں دیکھی ؟"

"دیکھی ہے ۔" میں نے پیالی منہ کو لگاتے ہوئے کہا ۔

"پھر بھی آپ کو تورو کا علم نہیں ! تورو یہاں ایسا لفظ ہے جسے غیر ملکی ہسپانیہ میں آنے سے پہلے اچھی طرح سے جاننے لگتا ہے ۔"

"لیکن یہ آدمی اپنے آپ کو تورو کیوں سمجھتا ہے ؟" میں پھر اپنے موضوع پر آگیا۔

"بس یونہی" مینجر نے بے توجہی سے کہا۔

"آج سے چند سال پہلے یہ بُل فائیٹر تھا ۔" سینوریتا اطمینان سے بولی۔

"بل فائیٹر ! یہ خوانچے والا !" میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی ۔

"کیوں یہ بل فائیٹر نہیں ہوسکتا کیا ؟" سینوریتا بھویں اٹھا کر بولی ۔

"بن تو سکتا ہے ، لیکن میرا مطلب ہے ..... یہ خوانچے والا .... بھک منگا سا ..... یہ کیسے بن سکتا ہے بُل فائیٹر ، شاید آپ لوگ مذاق کر رہے ہیں ۔"

"لعنت بھیجئے ۔ یہ بھی کیا قصہ لے بیٹھے ہیں ۔" مینجر نے لاتعلقی سے کہا ۔ "کوئی اور بات کیجئے ۔"

سینوریتا کو یہ تجویز بہت اچھی لگی اور اس نے میرے جوتوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا : "یہ آپ کے ملک میں بنتے ہیں کیا ؟"

"جی" میں نے بے دلی سے کہا ۔ "اگر وہ بُل فائیٹر تھا تو اس نے یہ کسب کیوں اختیار کیا ؟"

سینوریتا نے کہا : "ایسے ہی ہوتا ہے ۔ آپ کے یہاں یہ جوتے کتنے کے مل جاتے ہیں ؟"

"شاید کوئی چالیس پچاس پیستا میں ۔" میں نے ہولے سے کہا ۔ "اس نے بُل فائٹنگ چھوڑ

کیوں دی؟

منیجر نے کہا: "خود کہاں چھوڑی ہے، چھڑا دی اگلوں نے۔ یہ دراصل ذرا سا غبطی پہلے ہی سے تھا۔ مجاز کی چراگاہوں میں توروز چرانے کا کام کرتا تھا۔ وہاں اپنے ساتھی چرواہوں کی تفریح طبع کے لیے سر پہ عمامہ باندھ کر، گلے میں موتیوں کی مالا ڈال کر اور ہاتھ میں لمبی سی جریب اٹھائے اندلس کے خلیفہ کی نقل اتارا کرتا۔ جانے یہ اس تضحیک کا بدلہ تھا یا کچھ اور، یہ آہستہ آہستہ واقعی اپنے آپ کو مُور مسلمان سمجھنے لگا اور اردگرد کے پادریوں سے جھگڑنے لگا۔ گلہ بانی کا پیشہ ایسا تھا کہ کھلی فضا میں نیلے آسمان تلے کافی وقت مل جاتا۔ چنانچہ اس نے تاریخ و فلسفہ، مذاہب اور طب کی کتابیں پڑھنا شروع کر دیں۔ جوں جوں یہ اندلس کی تاریخ کا مطالعہ کرتا تھا اسے یقین ہوتا جاتا تھا کہ یہ مُور ہے اور اس کے باپ دادا ان بربر فوجوں کے سپاہی تھے جنہوں نے اندلس کی سرزمین پر حملہ کیا تھا۔"

منیجر اپنا پائپ سلگانے کو جھکا تو میں نے پوچھا: "مگر آپ کو یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟"

"لو یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات ہے، سارا زمانہ جانتا ہے۔" سینوریتا نے کہا: "ماتا دور کارد کے تو سوانحِ حیات بھی چھپ چکے ہیں۔"

"ماتا دور کارد کون؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"یہی جو ابھی آیا تھا۔ اس کا نام کاردہے نا۔"

"جی ہاں اس کا نام کاردہے۔" منیجر نے کہا: "لیکن یہ اپنے آپ کو ابو کارد کہا کرتا ہے۔ پرانے مور بادشاہوں کے ایسے ہی نام ہوا کرتے تھے۔ انہی بادشاہوں کے عہد میں ہسپانیہ میں بل فائیٹنگ کا کھیل مقبول ہوا۔ اس وقت عیسائی اور مسلمان بل فائیٹروں کے مقابلے ہوتے تھے اور سلطان اپنے ہاتھوں سے انہیں انعام دیا کرتے تھے۔ ان مقابلوں میں شرط یہ ہوتی تھی کہ جس تور سے مسلمان ماتا دور لڑے گا وہ عیسائیوں کا پالا ہوا ہوگا اور جس سے عیسائی بل فائیٹر لڑے گا وہ مسلمانوں کا۔ دونوں قومیں ضد میں آکر اپنے اپنے تورو کو عجیب و غریب دوائیاں اور جڑی بوٹیاں کھلایا کرتے تھے جس سے تورو آتش ناک ہو جاتا تھا اور باگھ بگھیرے پر حملہ کرنے سے بھی نہ چوکتا تھا۔

اس وقت یہ لڑائیاں دیکھنے کے قابل ہوتی تھیں اب تو بس نام ہی رہ گیا ہے۔ چراگاہوں کے پلے ہوئے تورد آجاتے ہیں اور اپنی جان گنوا جاتے ہیں۔ آگے جہاں تین چار تورد مرتے تھے وہاں ایک آدھ بُل فائیٹر بھی نوکیلے سینگوں کی نذر ہو جاتا تھا۔ اب تو سارے سیزن میں پورے ہسپانیہ میں ایک بُل فائیٹر بھی مشکل سے مرتا ہے۔"

"میں نے بے صبری سے کہا۔" آپ تو ماتا دور کارد کا قصہ سنا رہے تھے۔"

"اوہ" منیجر نے بجھا ہوا پائپ میز پر رکھ دیا اور اپنی سیاہ مونچھیں چٹکی میں لے کر بولا۔" سینور کارد پہلے چرواہا تھا۔ پھر عالم دین بنا، بعد میں علم الکیمیا پر وقت ضائع کرتا رہا اور جب قصبے کے لوگوں نے اسے اس کے مذہبی رجحانات کی بنا پر تنگ کرنا شروع کر دیا تو یہ سویلیا کی فائیٹنگ ایرینا میں وقت کے معروف ماتا دور کا نائب بن گیا۔ کہتے ہیں اکھاڑے میں تورد کو کھلاتے ہوئے اس نے اپنی قابلیت کے وہ جوہر دکھائے کہ ایک ہی سیزن میں اس کو جونیئر ماتا دور منتخب کر لیا گیا۔ سویلیا میں اس کا وہ شہرہ ہوا کہ ہسپانیہ کا ہر شہر اسے اپنی طرف کھینچنے لگا لیکن اگلے سیزن پر ہم غرناطوی اسے اپنے یہاں بلانے میں کامیاب ہو گئے۔"

"اوہ میں نے اس کی پہلی لڑائی دیکھی ہے۔" سینوریتا نے چٹخارہ بھر کر کہا۔" میرا ایک دوست یہاں تھانیدار تھا ورنہ اس دن تو بڑے بڑے سرداروں اور اہلکاروں کو ٹکٹ نہ مل سکا تھا۔ بجلیاں بھری تھیں اس آدمی کے جسم میں۔"

"پھر کیا ہوا" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا۔" منیجر نے کہا۔" وہی ہوا جو عام طور پر ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے۔ یہاں کے ڈیوک نے اس کی دعوت کی اور اسے اپنے محل میں رہنے کو جگہ دے دی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جب کارد اپنی فٹن میں نکلتا تو غرناطہ کی لڑکیاں گھوڑوں کے سموں تلے اپنے رومال بچھا دیتیں اور اس کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر ہوائی بوسوں سے ساری فضا معمور کر دیتیں۔ وہ مسکراتا ہوا اپنی ٹوپی ہلا ہلا کر ان کی محبت کا جواب دیا کرتا۔ ڈیوک کے چھوٹے چچا کی ایک لڑکی تھی۔ سیاہ بھنورا

سی آنکھیں، کالی گھٹا سے بال اور بوٹا سا قد۔ کہتے ہیں ڈیوک سے چچا نے ایک کارمن جیسی عورت کو گھر ڈال لیا تھا اور یہ لڑکی اسکے بطن سے تھی....

"کہتے کیا ہیں" سینوریتا نے بات کاٹی "سچی بات ہے اس کا قد دیکھا تھا؟ تھی تانیا کا پودا۔ ہم ہسپانوی عورتوں کا قد ایسا لمبا کہاں ہوتا ہے"

"میرا مطلب ہے، سبھی جانتے ہیں کہ تانیا جیسی عورت کی بیٹی تھی۔ اگلے ہفتے جب کارد تماشاگاہ میں آیا تو تانیا اس کے ساتھ فٹن میں سوار تھی اور جب اس نے اکھاڑے میں اتر کر پہلے تورو پر تلوار اٹھائی تو اسے تانیا ہی کے نام معنون کیا۔

ہسپانیہ کے جس کسی اخبار میں ماتادور کی تصویر چھپتی تانیا اس کے ساتھ ہوتی۔ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ نہ تو کارد تانیا کی غیر موجودگی میں بل فائیٹنگ کر سکتا ہے نہ تانیا اسے دیکھے بغیر زندہ رہ سکتی ہے۔

"اور یہ بات تھی بھی ٹھیک" سینوریتا نے لقمہ دیا۔

"خیر ٹھیک تھی یا نہیں، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اتنی بات ضرور تھی، جیسی عورتوں نے ان کی محبت کے گیت بازاروں میں گانے شروع کر دیے تھے۔ میں نے یہاں غرناطہ میں کارد کی صرف دو لڑائیاں دیکھی ہیں۔ اس کے بعد وہ میڈرڈ کے ایرینا میں چلا گیا اور ہم تک صرف اخباروں کے ذریعے اس کی خبریں پہنچتی رہیں۔

"اور تانیا یہیں رہ گئی" میں نے کہانی سننے والے بے صبر بچے کی طرح پوچھا۔

"واہ یہ کیسے ہو سکتا تھا بھلا" سینوریتا نے کہا "جیسی عورت کی محبت بڑی خوفناک ہوتی ہے۔ پیار کی خاطر وہ اپنی جان تک کی بازی لگا دیتی ہے"

"ڈیوک کے گھرانے کی عزت کا خیال کیے بغیر وہ اس کے ساتھ میڈرڈ چلی گئی اور دونوں ایک ہی ولا میں رہنے لگے۔ میں ہوٹل کا کچھ سامان خریدنے میڈرڈ گیا تھا اور اس زمانے میں بل فائیٹنگ کا سیزن کھلا تھا ———— مگر میری انتہائی کوشش کے باوجود مجھے ایک ٹکٹ بھی نہ مل سکا۔ میری بڑی آرزو تھی کہ میڈرڈ کے اکھاڑے میں کارد کے کمال کا نظارہ کروں۔

پورے دو سال اور آٹھ مہینے کارو میڈرڈ کے ایرینا میں اپنے فن کے جوہر دکھاتا رہا، اس سے لڑنے کے لیے میکسیکو اور جنوبی امریکہ تک کے خونخوار تور د منگوائے گئے لیکن وہ انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹتا رہا۔"

" انہی دنوں کیلی فورنیا کا ایک تاجر ہسپانیہ کی سیاحت کرنے میڈرڈ پہنچا" سینوریتا نے جلدی سے کہا۔

" بتا تو رہا ہوں" منیجر چھوٹے بچے کی طرح جھلا اٹھا اور رازدارانہ لہجے میں بولا "انہی دنوں کیلی فورنیا کا ایک تاجر ہسپانیہ کی سیر کرنے میڈرڈ پہنچا۔ یہ اتنا امیر تاجر تھا کہ اس کے پاس اس کا اپنا ہوائی جہاز اور اپنے تنخواہ دار پائلٹ تھے۔ اس نے میڈرڈ کے بیروں، بٹلروں اور قلیوں کو اتنی ٹپ دی، کہ وہاں کے سارے لوگ امریکن ایڈ کے حق میں ہو گئے۔ پہلے کچھ ......

" تمہیں بھی امریکن ایڈ ملتی ہے؟" سینوریتا نے بات کاٹی۔

میں نے بھولپنے سے کہا" جب میں اپنے وطن میں تھا اس وقت تو نہیں ملتی تھی، اب مجھے گھر سے نکلے ڈھائی سال ہو چکے ہیں بعد میں ملنے لگی ہو تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

منیجر نے کہا" اس امریکی تاجر کو بل فائیٹنگ بہت پسند تھی۔ وہ ہر روز پابندی کے ساتھ تماشا گاہ میں پہنچ جاتا اور اس کی سیٹ جج کے پہلو میں ریزرو ہوتی سنتے ہیں اس نے ہر اس تورو کے خون سے کارو کے آٹوگراف لیے جسے اس نے میڈرڈ کی تماشا گاہ میں ہلاک کیا۔ اس نے تانیا اور کارو کو ہر روز اپنے ہوٹل میں مدعو کرنا شروع کر دیا اور ان کے درمیان دوستی بڑھنے لگی۔ ایک دن ستمبر کی بات ہے شاید .....

" ہاں ہاں چوبیس ستمبر کی" سینوریتا نے کہا۔

" جب بھورے رنگ کا ایک ہسپانوی بل دھول اڑاتا نتھنوں سے دھواں چھوڑتا اکھاڑے میں داخل ہوا، کارو کے نائب ڈرے ڈرے سہمے سہمے اسے کھلاتے رہے۔ تماشائی سیٹیاں بجانے لگے تو کارو کود کر اکھاڑے میں اتر گیا اور خود بل کو کھلانے لگا۔ تماشائی خوشی سے دیوانے ہو گئے اور

کارو کا نام لے لے کر تالیاں بجانے لگے۔ جب بگل بجا اور جج نے بُل کی کوہان میں تلوار گھونپنے کی اجازت دی تو کارو نے فخر سے سر اوپر اٹھایا اور کہا "میں اس تورو کو ہسپانیہ کی خوبصورت ترین عورت...... اور جب اس نے تانیا کی سیٹ کی طرف دیکھا تو وہ وہاں موجود نہ تھی..... اس نے جھلا کر تلوار سونتی اور اس کی نوک کوہان میں گھسیڑ دی۔ تقریباً تین چار انچ تلوار گھسنے کے بعد آگے ہڈی آگئی اور اسے تلوار نکال لینا پڑی۔ جج نے اسے ایک وارننگ دے دی۔ کوئی آدھ منٹ تک اس نے مولیتا لہرا کر تورو کو چکر پھیریاں دیں اور پھر تلوار کو اپنی ناک کے سامنے سیدھا کر کے بُل پر پل پڑا۔ بُل نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن جو اٹھائی تو نشانہ چوک گیا اور تلوار لچکتی ہوئی کوہان کا چمڑا کاٹ گئی۔ کچھ لوگوں نے دبے دبے سے نفرین کے نعرے لگائے اور جج نے کارو کو دوسری وارننگ دیدی۔ کارو نے دردناک نگاہوں سے جج کی طرف دیکھا، تانیا کی سیٹ اب بھی خالی تھی۔ اس نے تلوار کے قبضے پر ہاتھ جمائے چہرے کے سامنے صلیب کا نشان بنایا اور "ہے تورو" پکار کر بل کیطرف جھپٹا۔ تلوار مشکل سے آدھ فٹ کوہان میں اتری ہوگی کہ آگے پھر ہڈی آگئی۔ لوگوں نے لعنت لعنت کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ کارو نے مایوسی کے عالم میں خالی سیٹ کی طرف دیکھا اور بھورے بُل نے اگلے پاؤں جوڑ کر زور کی ٹکر جو ماری تو ماتادور کی ران گھٹنے سے لے کر کولہے تک چر گئی۔ وہ سنبھلا اور خون کے بہتے ہوئے دھارے کی پروا کیے بغیر بل پر ٹوٹ پڑا۔ بگل بجا اور جج نے ہاتھ کے اشارے سے ماتادور کو روک دیا۔ تماشائی چلا رہے تھے، بل واپس جائے گا۔"

"مگر کیوں؟" میں نے بیتابی سے پوچھا۔

"شاید آپ کو معلوم نہیں" منیجر نے پائپ جھاڑتے ہوئے کہا۔ "ہر بل فائیٹر کو بس تین مرتبہ تلوار بھونکنے کی اجازت ملتی ہے۔ اگر تین باریوں میں وہ تلوار گھونپ کر بل کو مار نہ سکے تو جج اسے منع کر دیتا ہے اور بُل واپس طویلے میں بھیج دیا جاتا ہے۔ جہاں اس کی مرہم پٹی ہوتی ہے اور اسے "بہادر بل" کا خطاب مل جاتا ہے۔ ایسی بدقسمتی کے بعد ماتادور کی عظمت وہیں اکھاڑے میں دم توڑ دیتی ہے۔ اور اس کا پیشہ بل فائیٹنگ نہیں رہتا۔"

"ایسا کیوں ہوتا ہے۔" میں نے پوچھا۔ "وہ کسی اور شہر جا کر فائٹنگ شروع کیوں نہیں کر دیتے۔"

"اور شہر!" سینورِیتا نے حیرانی سے کہا۔ "وہ تو کسی اور ملک جا کر بھی پھر سے یہ پیشہ اختیار نہیں کر سکتے۔ ساری دنیا میں خبر پھیل جاتی ہے کہ فلاں کے ہاتھوں تورو زندہ بچ کر واپس طویلے میں پہنچ گیا۔"

مینجر نے کہا۔ سارے تماشائی ایک ایک کر کے تماشا گاہ سے نکل گئے اور شام کی پیلی روشنی میں کارو اکھاڑے میں اکیلا کھڑا رہ گیا۔ ایک اخباری نمائندہ دُور سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کارو بڑی دیر تک اسی طرح کھڑا رہا۔ پھر اس نے مشرق کی طرف رُخ کر کے اپنے دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھائے اور سیلی زمین پر سجدے میں گر گیا۔ اور پھر اٹھ نہ سکا۔ اتنے میں تانیا چیخیں مارتی دیوانہ وار اس کی طرف بھاگی اور نیم مردہ ماتا دور سے لپٹ گئی۔ ایمبولینس پہنچ چکی تھی، کارو کو ہسپتال لے گئے۔

"پورے چھ روز تک تانیا کارو کی پٹی سے لگی اس کی تیمارداری کرتی رہی اور اسے زندہ رہنے پر اکساتی رہی، اس نے کارو کو یقین دلا دیا کہ اس دنیا میں بل فائٹنگ کے ذریعے ہی عظمت حاصل نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ اور بہت سے ذرائع بھی ہیں۔ کارو زندہ رہنے اور دنیا سے آنکھیں چار کرنے پر مجبور ہو گیا اور جب اس میں زندہ رہنے کی تمنا اور ساری چیزوں پر حاوی ہو گئی تو تانیا کو گویا کھویا ہوا خزانہ مل گیا۔ ایک شام جب وہ کارو کے زخم پر دوائی لگا کر پٹی باندھنے والی تھی۔ وارڈ کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ وہ پٹی کو اسی طرح ہاتھ میں لے کر باہر نکلی اور دھندلے شیشوں کے ساتھ لگ کر دستک دینے والے سے باتیں کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد نرس وہی پٹی لیکر اندر داخل ہوئی اور کارو کی ڈریسنگ کرتے ہوئے بولی۔ "سینوریتا ابھی آتی ہیں۔"

"کارو پٹی بندھوا کر آرام سے لیٹ گیا اور تانیا ہسپتال سے نکل کر امریکی تاجر کے ساتھ کیلی فورنیا چلی گئی۔"

"اس کے پاس اپنا ہوائی جہاز جو تھا۔" سینوریتا نے کہا۔ "دو تنخواہ دار پائیلٹ چلاتے تھے اسے۔"

"پھر؟" میں نے پوچھا۔

"پھر کیا" مینجر نے کہا: "کارو تندرست ہو کر غرناطہ واپس آگیا اور زندہ رہنے کے لیے تسلے میں میٹھی گولیاں لگا کر بیچنے لگا۔ ٹورسٹوں کے پیچھے بھاگتا ہے سوہ جان چھڑانے کو ایک اَدھ پیسیتا دے دیتے ہیں:"

میں نے کہا: "لیکن ....."

لیکن اتنے میں چند مسافر ہوٹل میں داخل ہوئے اور مینجر اور سینورتیا کونٹر کی طرف بھاگ گئے۔ میں چپلی کا سٹریپ باندھنے کو جھکا تو چیونٹیوں کی جاتی ٹھہتی ایک سرخ گولی میری شال کا کونہ لگنے سے لڑھک کر پاؤں میں آگئی۔

چنگھو پاکستان

یہ بصیرت افروز واقعہ میرے ساتھ نہیں گزرا، میرے ایک دوست کے ساتھ گزرا ہے۔
جو آج سے کئی سال پہلے جموں کے ہائی سکول کا طالب علم تھا اور اس کے اُردو کورس میں غالب
کی تین غزلیں شامل تھیں۔ جو اُستاد انہیں اُردو فارسی پڑھانے پہ مامور تھے ان کا نام ہرنام
سنگھ تھا اور وہ گورداسپور کے رہنے والے تھے۔

ایک دن میرا یہ دوست جب کلاس میں اپنی غیر معمولی ذہانت کے باوجود غالب
کے اس شعر پہ رُک گیا۔

سادگی و پُرکاری بے خودی و ہشیاری
حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

تو ماسٹر ہرنام سنگھ کو بہت غصہ آیا۔ انہوں نے اس شعر کا مطلب کلاس کے ذہین
نمبر۲ سے پوچھا تو وہ بھی بُت کی طرح کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ پھر انہوں نے باری باری ہر
ایک سے اس شعر کا مطلب پوچھا اور ہر طالب علم بقدرِ ظرف اپنی گردن پیچھے کو کھینچ کر
چھت پہ نگاہیں جما کر بیٹھ گیا۔ جب ماسٹر ہرنام سنگھ صاحب نے اپنے طالب علموں کے
ذہنی دیوالیہ پن کی یہ حالت دیکھی تو کہا غالب صاحب فرماتے ہیں :

سادگی ہور پُرکاری، بے خودی ہور ہشیاری۔ حسن نوں تغافل وچ جرأت آزما
پایا۔ لو اینی گل سی اینویں بوتھے چک کے بہ گئے سارے اُگتے چلو۔

جب مجھے پیکنگ میں رہتے چار روز ہو گئے اور میں نے اپنے علم کے زور پر ،

مشاہدے کے زور پر اور اپنے ترجمان کی تقریری گفتگو کے زور پر چین کو سمجھ لیا تو ماسٹر ہرنام سنگھ کی شرح اور غالب کا یہ شعر میرے صبح و شام کا وظیفہ ہو گیا۔

پاکستان سے چلتے وقت میں نے چین کے بارے میں بڑے بڑے تصوّر باندھے تھے۔ کبھی اسے جنت ارضی سمجھا تھا اور کبھی سوشلزم کی معراج، کبھی غریبوں کا بہشت جانا تھا اور کبھی یوٹوپیا کا پایۂ تخت لیکن وہاں پہنچ کر میرے سارے سنہرے خواب ٹوٹ گئے اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ جو کچھ مجھے چین کے بارے میں بتایا گیا تھا وہ مبالغے اور دروغ بیانی پر مبنی تھا۔ چین ایسا ہی ہے جیسا کہ چین کو ہونا چاہئے، یعنی سیدھا سادا۔ مشرق زادہ، میرا آپ کا ہمارا ملک۔

اس بات کا احساس مجھے ۵ ؍جولائی ۱۹۶۶ء کو ہوا جب میں نے پیکنگ ہوٹل کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور کہا پاکستان اور چین میں کوئی فرق نہیں۔ اگر کہیں ان دونوں ملکوں کے درمیان زبان کا فرق ہٹ جائے تو سبحان اللہ! باقی پاکستان چین ہی کی طرح کا ایک ملک ہے چین کے سر کوئی سرخاب کا پر نہیں لگا ہے۔ اک ذرا پاکستان سے بے ایمانی اور بدمعاملگی دور ہو جائے۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام نکل جائے ریاکاری رشوت ستانی اور افسر شاہی ختم ہو جائے۔ اسلام آئے اور اسلام پرستی دور ہو جائے۔ کم سے کم سو روپیہ اور زیادہ سے زیادہ ۔/۵۰۰ روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہو جائے۔ بیماری، گندگی اور غیر ملکی خوراک ختم ہو جائے تو پاکستان بھی چین جیسا ہی ہے اپنی گل اے فرق کوئی نہیں۔

باقی وہ لوگ جو چین جانے کے لیے یا چین دیکھنے کے لیے تڑپتے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ چین ویسا نہیں ہے، جیسا وہ سمجھتے ہیں، شنگھائی کے ہوائی اڈے پر جب PIA کا پر تولتا ہوا طیارہ اُترے گا اور ٹیکسی کرتا ہوا ہوائی اڈے کی عمارت کی طرف جائے گا تو آپ کو سب سے پہلے رن وے کے اردگرد پھیلے ہوئے

سبزہ زاروں میں کام کرنے والے وہ لوگ دکھائی دیں گے جنہوں نے بیشتر نیلی پتلونیں اور سفید بشرٹیں پہن رکھی ہوں گی۔ نیلی پتلونیں دُھل دُھل کر پہلے سلیٹی اور پھر چوہے رنگی ہو چکی ہوں گی۔ ہر پتلون کے زانو پر گہرے نیلے رنگ کا نئے کپڑے کا ایک پیوند ہوگا۔ ایک پیوند کندھے پر، ایک پیوند کولھے پر اور ایک پیوند قمیص کی پشت پر۔

میں نے اپنے جہاز کی کھڑکی میں سے باہر نظر کی اور اپنے آپ سے کہا لو جی ملاحظہ ہو چین اور چینیوں کی حالت۔ پھر میں نے تھیلے سے کنگھی نکال کر بال ٹھیک کیے۔ اپنی ستر فی صد ٹری لین اور چالیس فی صد اجیشئن کاٹن کی قمیص کے بٹن بند کیے۔ یہ قمیص PL ۴۸۰ کے تحت پاکستان میں امپورٹ ہوتی تھی اور اس کے نیچے براؤن رنگ کی ڈیکرون پتلون شرق پور کی لمبی باسمتی کی دو بوریوں کے عوض جاپان سے آئی تھی اور دکان دار نے مجھے بتایا تھا، مجھے فوراً والیسی اور پتلونیں خرید لینی چاہئیں کیونکہ بونس کا بھاؤ: /۱۵۲ سے اوپر جانے والا تھا۔ میں تھیلے سے پاسپورٹ اور کاغذات نکال رہا تھا اور مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ اگر میری واپسی تک بونس کا بھاؤ ۱۵۲/ سے بڑھ گیا تو یہ میری زندگی کی کتنی بڑی حماقت ہوگی۔ میرے دوسرے دوست جو ملک میں موجود ہر روز اخبار کا مطالعہ کرتے ہوں گے۔ بونس کی ہل جل سے باخبر ہو کر تین تین پتلونیں خرید لیں گے اور جب میں چین سے واپس آؤں گا تو میرے گھٹنے پر ایک پیوند ہوگا۔ میرے کندھے پر ایک پیوند ہوگا اور میری عقل پر ایک پیوند ہوگا کہ اے احمق تُو نے مستقبل کی فکر کیوں نہ کی۔

ہوٹل سے باہر نکلتے ہوئے میں نے اپنے ترجمان مسٹر چانگ سے کہا تم اپنے مستقبل کی فکر کیوں نہیں کرتے ہو۔ تمہارے دو بچے ہیں۔ ایک بیوی ہے۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ پارٹی کی صحیح گائیڈنس اور چیئرمین ماؤ کی تعلیمات کی روشنی میں مستقبل کی فکر نہیں رہتی۔ میں نے کہا۔ یہ سوا دو سو روپے جو تم تنخواہ کے طور پر پاتے ہو۔ ان میں تمہاری گزر اوقات ہو جاتی ہے۔ اس نے کہا۔ گزر اوقات ہائیں نے اس میں سے۔ /۳۵۴ بچا کے بھی رکھے

ہیں اور یہ رقم میں نے ساڑھے چار سال کی مدت میں بہ آسانی جمع کر لی ہے۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ سوشلسٹ سٹیٹ میں کوئی شخص روپیہ نہیں جمع کر سکتا، لیکن میرے چانگ کے پاس ۴۳۵/- نقد موجود تھے۔

"یہ روپے کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

تو چانگ نے ہنس کر کہا۔ بنک میں اور کہاں۔ میں نے کہا۔ مجھے اپنی پاس بک دکھاؤ۔ وہ میری اس فرمائش پر بہت حیران ہوا۔ لیکن چونکہ یہ فرمائش ایک گہرے دوست ملک کے معزز باشندے کی طرف سے تھی۔ اس لیے وہ مجھے تھیٹر لے جانے سے پہلے اپنے فلیٹ لے گیا۔ میں اس کے ساتھ اوپر اس کے فلیٹ میں نہیں گیا بلکہ سڑک کے کنارے سرکاری موٹر میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ پاس بک چھوٹے سائز کی تھی۔ اس کے کاغذ بڑھیا نہیں تھے۔ نہ ہی اس پر جلد تھی۔ انٹریاں کسی حد تک میری پاس بک کی طرح تھیں۔ کوائف چینی زبان میں لکھے تھے۔ ہندسے انگریزی حروف میں درج تھے۔ واقعی چانگ کے پاس ۴۳۵/- روپے بنک میں جمع تھے۔ ایک نظر دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ اس نے ۳۰/- روپے ایک دفعہ نکلوائے ہیں۔ ۱۸/- ایک مرتبہ اور ۲۵/- ایک مرتبہ۔ جب میں نے اس سے یہ روپے نکلوانے کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا۔ "کبھی کبھی ایسی ضرورتیں بھی انسان کو آ پڑتی ہیں، دس روپے میں نے اپنی بہن کی بچی کی منگنی پر تحفتہً دیئے۔ اٹھارہ روپے کے نئے ٹائر اور ٹیوب خریدے۔ کچھ پیسے ایک مرتبہ یاروں، دوستوں کے ساتھ پک نک پر لگائے اور باقی کے . . . . .

لیکن ابھی وہ فقرہ مکمل نہ کر پایا تھا کہ میں نے کہا تم پک نک وغیرہ بھی مناتے ہو؟ اسے میرا سوال سمجھ نہ آیا۔ میں نے اس کی خود ہی وضاحت کر دی کہ تمہارے یہاں تو regimentation ہے ہر حرکت اور ہر فعل پر کڑا پہرہ ہے تم پک نک کیسے منا سکتے ہو؟ چانگ پھر مسکرایا اور ٹوٹیاں طوطے کی طرح سر ہلا کر بولا۔ Seeing is believing.

تم خود دیکھ لو گے۔

خود دیکھنے جو ہم دیوارِ چین گئے تو ہمارے ساتھ پانچ عرب ملکوں کے تیرہ مندوبین، دو نیپالی، پانچ تھائی لینڈ والے اور ایک میرا ہیڈ آف دی ڈیلی گیشن شوکت صدیقی بھی ساتھ تھا۔

وہی پیوند لگے مزدور سیمنٹ، بجری چھان کر مسالا تیار کر رہے تھے۔ دیوارِ چین کی شکست و ریخت کی نگہداشت ان لوگوں کے ذمہ تھی۔ ایک میٹ تھا جو کرسی ڈالے مزدوروں کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کے کوئی پیوند نہ لگا تھا۔ ان مزدوروں کے نکڑ دادا اور سکڑ دادا اسی مقام پر شاہان چین کے حکم سے دیوارِ چین اٹھاتے تھے اور اسی طرح ان کے سر پر میٹ ہیڈ میٹ اور شاہی گماشتوں کی ٹولیاں ہوا کرتی تھیں۔

میرے یار عراقی مندوب نے کہا ملاحظہ فرماؤ مزدوروں کی حالت میں نے ایک مزدور سے کہا یار سگریٹ سلگانے کو سگریٹ دینا۔ اس نے محبت، حیرت، مسرت اور فخر سے میری طرف دیکھا اور ٹوٹا میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور بڑے مربیانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "خوش ہو!" ترجمان نے ترجمہ کیا۔ مزدور نے کہا۔ "ہمیشہ خوش، اب خوش جب خوش، افریقی اور ایشیائی مہمانوں کو دیکھ کر اور بھی خوش۔"

مَیں نے کہا۔ "خوشی کی وجہ؟" کہنے لگا۔ پارٹی کی صحیح گائیڈنس اور چیئرمین ماؤ کی تعلیمات اور ان پر سب کا عمل۔"

عراقی یار نے کہا۔ "دیکھا پیارے کیا طوطے کے سے رٹے جملے بولتا ہے۔ جہاں جاؤ ہر کوئی یہی جملہ کہے گا۔ مجھے چین پسند نہیں آیا۔ میں تو ہانگ کانگ جاؤں گا، گڈ گرلز big busts.

شوکت صدیقی نے کہا۔ "یار واقعی بات تو ٹھیک ہے، جھاڑو دینے والے سے لے کر ملکۂ اعظم como-jo تک سے پوچھو یہی جواب دے گا۔ اس کے علاوہ انہیں کچھ اور سکھایا ہی نہیں گیا۔"

نیپالیوں کے ترجمان نے پوچھا۔ تمہارا دوست تمہیں اُردو میں کیا کہہ رہا ہے، میں نے اسے عراقی یار اور اپنے ہیڈ کی بات بتادی، وہ پہلے تو حیران ہوا پھر ذرا سوچ میں ڈوب گیا۔ یہی بات اس نے ترجمہ کر کے مزدور کو بھی بتادی۔ مزدور نے سگریٹ کا گُل جھاڑا اور ہنس کر کہا تو گویا مجھے اپنے خوش رہنے کی یہ وجہ بیان کرنی چاہیے تھی کہ سورج دیوتا کی مہربانی اور چیانگ کائی شیک کے مظالم اور کنفوشیش کے فلسفہ کی بدولت میں خوش ہوں!

مَیں نے کہا بالکل بالکل اسے ہم لوگ آزادیٔ اظہار کہتے ہیں اور اظہار پر ہم کسی قسم کی پابندی پسند نہیں کرتے۔ تم اور تمہاری قوم خواہ پارٹی کی صحیح گائیڈنس اور چیئرمین ماؤ کی مسلسل جدوجہد اس کے عمل اور اس کی تعلیمات کی بدولت اس مقام پر پہنچے ہو، لیکن نہیں ہم لوگوں کی خوشنودی کے لیے گاہے گاہے اس بیان کو تبدیل کر کے بھی دینا چاہیے۔ یہ نہیں کہ ہر بار جب تمہیں السلام وعلیکم کہیں تو تم اس کا جواب وعلیکم السلام ہی کہو۔ اسے موقع محل دیکھ کر بدل بھی دیا کرو نہیں تو تم پر regimentation کی دفعہ لگ جائے گی۔

شوکت نے کہا اس میٹ کو دیکھو کیا نائلون کی بُشرٹ پہنے بیٹھا ہے۔ میں نے ترجمان سے کہا، کیوں بے نائیلون کی بُشرٹ کیوں پہنے بیٹھا ہے۔ وہ مزدور کلاس چھوڑ کر یک زبان ہو کر بولے: "پہننے کا بڑا ٹھرکی ہے۔ ہفتہ ہفتہ ایک وقت کی روٹی کھاتا ہے۔ اور انیس روپے کی نائیلون بُشرٹ خریدتا ہے اور یوں بھی طبقاتی نزاع میں ہم سے بہت آگے ہے، ہم کو اسی روپے مہینہ ملتے ہیں۔ یہ سو روپیہ مہینہ لیتا ہے۔ یہ ڈاٹ باندھ لیتا ہے۔ ہم سیدھا سادا پلستر کر سکتے ہیں، یہ skilled ہے ہم unskilled ہیں۔

عراقی یار نے کہا کس مصیبت میں پڑے ہوئے ہیں سارے چینی، میں تو کانفرنس کے بعد ہانگ کانگ جاؤں گا big busts اشفاق verybig busts

پیکنگ میں لڑکے لڑکی میں شناخت کرنا مشکل ہے یا تو آپ اسے آواز سے پہچان سکتے ہیں یا پھر لڑکی کے کانوں کے پاس دو پتلی پتلی چوٹیاں دیکھ کر۔ لیکن چین کے دوسرے شہروں اور گاؤں میں یہ بات نہیں۔

گاؤں سے آنے والی سبزیوں اور پھلوں کے چھکڑے اور ریڑھے شام کے چار بجے سے پیکنگ میں داخل ہونا شروع ہو جاتے ہیں، ان ریڑھوں کے آگے گھوڑے، گدھے اور آدمی ہر طرح کی مخلوق جُتا کرتی ہے۔ آدمی دو طرح سے گاڑی کھینچتے ہیں یا تو سائیکل رکشا کے انداز میں یا پیدل زمین پر چل کر۔ ان ریڑھوں، یکوں اور چھکڑوں کے قریب سے بسیں اور اور کاریں گزرا کرتی ہیں۔ کبھی کبھی ڈیڑھ پونے دو گھنٹے بعد کوئی بابو آٹو سائیکل بھی گزر جاتا ہے یہ بسیں سرکاری ہیں، یہ کاریں سرکاری ہیں، ان میں بیٹھنے والے وہ لوگ ہیں جنہیں سرکار نے تیزی سے امورِ مملکت طے کرنے پر متعین کیا ہے اور سرکار معلوم ہے کون ہے؟ وہ پیوند لگا جھری سی آنکھوں والا ادھیڑ عمر کا آدمی جو لوار کا کرخت پٹہ کندھے پر ڈال کر سبزیوں کا ٹھیلہ کھینچ کے منڈی کی طرف لے جا رہا ہے۔ سرکار نہ چو، این، لائی ہے نہ ماؤ نہ تنگ ہے نہ لیو شاؤ چی نہ چوتے۔

جب یہ آدمی اپنے کمیون میں کہے گا کہ کاریں چلنی بند کر دو، مجھے یہ تکلیف دیتی ہیں۔ تو کاریں بند ہو جائیں گی، جب یہ کہے گا کاریں سُست رفتار ہیں ان کی جگہ ہیلی کوپٹر ہونے چاہئیں تاکہ اُمورِ مملکت اور تیزی سے طے ہوں تو اونچی عمارتوں کے کلسوں کے اوپر اوپر ہیلی کوپٹر پرواز کرنے لگیں گے۔ پیکنگ سے کوئی چار میل دور جب بانسوں کی ایک غریب بستی اور کسانوں کے ایک معمولی سے قصبے میں فوٹو اتارنے لگا تو میرے ترجمان نے مجھے روک دیا۔ میں نے کہا دیکھا بچو آ گئی ناں وہی بات جو لائف میگزین میں پڑھی تھی۔ یہ مجھے ادھ ننگے بچوں اور دُبلے پتلے مردوں، عورتوں کی تصویر کیسے اتارنے دے گا۔ بھلا! میں نے ڈر کے مارے اپنا کیمرہ فوراً کیس میں بند کر لیا۔ اس نے خشک لہجے میں پوچھا۔

اس علاقے کی تصویر کیوں اتارنا چاہتے تھے؟ میں نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ "تاکہ میں یہاں کے غریب علاقے کی تصویر کا ریکارڈ بھی رکھ سکوں؟"

اس نے کہا۔ "ہمارے slums کی تصویر بنانا چاہتے ہو؟"

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "ہاں۔"

چانگ نے میرا کندھا جھنجھوڑ کر کہا۔ "مجھے پہلے ہی معلوم تھا لیکن یہ slum ٹھیک نہیں ہے۔ یہاں سے ڈھائی میل کے فاصلے پر اس سے بھی زیادہ غریب بستی ہے۔ وہاں کے لوگ زیادہ غریب ہیں، وہ بہت ہی گرا پڑا علاقہ ہے۔ وہاں چلتے ہیں، وہ ٹھیک رہے گا۔ اس کی تصویریں اتارنا۔

یہ بات سن کر میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ تھوڑی دیر میں ہم اس بستی میں تھے۔ یہاں نہ بجلی تھی۔ نہ پانی کا خاطر خواہ انتظام۔ بانس کے جھونپڑے تھے۔ پرانے دھونے ہوئے اندر باہر خوب صفائی تھی۔ ایک عورت تسلے میں پانی ڈال ڈال کر اپنے بچے کو نہلا رہی تھی۔ کسان اپنے اپنے گھروں کے آگے لکڑی کی ڈگڈگیوں پہ بیٹھے تھے۔ مرغیاں دانہ دُنکا کرید رہی تھیں۔ بطخیں ایک چھوٹے سے جوہڑ میں غوطے لگا رہی تھیں۔ لڑکے نیکریں اور چڈیاں پہنے فٹبال کھیل رہے تھے۔ ایک گول پر انہوں نے دو چھوٹے چھوٹے پتھر رکھ چھوڑے تھے۔ دوسری طرف ایک بانس کی ٹوکری اور ایک لڑکے کی سرخ ٹوپی۔ بڑا ہلا گلا تھا فٹ بال دس بارہ بچوں کی ٹانگوں کے درمیان دبکا ہوا تھا۔ چودہ پندرہ سال کی ایک لڑکی اپنے گھر کے دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے چیئرمین ماؤ کے مضامین پڑھ رہی تھی۔ بہت غریب بستی تھی، لیکن بے حد صاف۔ جو عورت اپنے بچے کو تسلے میں نہلا رہی تھی۔ اس نے صابن کی ٹکیہ اخبار کے کاغذ پہ رکھی ہوئی تھی۔ تسلا بہت بڑا نا تھا، پانی بہت کم تھا۔ عورت بہت جوان تھی۔ شاید یہ اس کا پہلا بچہ تھا۔ ایک غیر ملکی کو اپنی طرف کیمرہ تانے دیکھ کر بستی کے لوگ کچھ ناخوش اور کچھ شرمسار سے تھے۔ میں نے کلک کلک چار پانچ سینپس (snaps) تیار کر لیے۔

چیئرمین ماؤ کی تعلیمات کا مطالعہ کرنے والی لڑکی اندر بھاگ گئی۔ جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک نوٹ بک تھی۔ وہ شرماتی لجاتی ترجمان تک آئی اور کہنے لگی یہ ڈیلی گیٹ کہاں کا رہنے والا ہے۔ ترجمان نے کہا۔ "پاکستان" لڑکی نے اپنا منا سا ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں نے ہاتھ ملایا اور دوسرا ہاتھ آگے بڑھا کر جلدی سے نوٹ بک لے لی تاکہ بے چاری بچی پاکستان کے ایک عظیم ادیب کے آٹو گراف سے محروم نہ رہ جائے۔ وہ نوٹ بک عجیب و غریب تھی۔ اس پر حروف بھی تھے اور ہندسے بھی۔ حساب کے سوال بھی اور چیئرمین ماؤ کے ارشادات بھی! لڑکی نے ترجمان کے ذریعے کہا۔ "اس پر چین کی اور چینی لوگوں کی وہ خامیاں لکھ دیجیے جو آپ نے اپنے دورے میں مشاہدہ کی ہوں۔"

میں ایک لمحہ بھر کے لیے چکرا سا گیا۔ یونیورسٹی جاؤ پروفیسروں سے ملو، آخر میں

Please let us know our short-comings which you might have noted during your stay in China.

پیکنگ ریڈیو جاؤ Please let us know our short-comings.

تھیٹر جاؤ، اوپرا جاؤ۔ ڈیپارٹمنٹ سٹور جاؤ۔ آخر میں مرغے کی وہی ایک ٹانگ۔ ان کی short-comings بتاتے ہوئے پارٹی سے لے کر نظام اشتراکیت تک اور ملک چین کی بے عزتی سے لے کر کمیونوں کا ٹھٹھا اڑانے تک چاہے جتنی مرضی چمڑی ادھیڑے جاؤ چینی سامعین بڑے سلوک، سبھاؤ اور نرم روی کے ساتھ آپ کی ساری باتیں سنتے جائیں گے۔ ہاں جب ماؤ زے تنگ پر تنقید کرو کہ وہ ڈکٹیٹر ہے، آمر ہے تو ان کے دلوں میں اک ہوک سی اٹھتی ہے، آنکھوں میں دکھ سا تیرنے لگتا ہے، پر وہ یہ سب کچھ بھی سہہ لیتے ہیں۔

لڑکی کی نوٹ بک میرے ہاتھ میں تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اس پر کیا لکھوں۔ آخر سوچ سوچ کر میں نے لکھ دیا۔ "چین کے سب بچے زیادہ تر فٹ بال کھیلتے ہیں معلوم

ہوتا ہے یہ کھیل ان پر لاگو کیا گیا ہے۔ ہم چین کے ہر گاؤں اور ہر شہر میں اس کھیل کے تکرار کو regimentation سمجھتے ہیں۔ اس کھیل کے علاوہ یہاں بیس بال اور کرکٹ بھی ہونی چاہیے۔ نہیں تو میں پاکستان جاکر بتا دوں گا کہ چین میں بچوں کے کھیل کود پر پابندی ہے اور انہیں فٹ بال کے علاوہ ہر کھیل سے منع کیا جاتا ہے۔

جب ترجمان نے اس کا ترجمہ کر دیا تو لڑکی بہت خوش ہوئی۔ سر جھکا کر دو مرتبہ کہا۔ شے شے! شے شے!! شکریہ اور پھر جاکر اپنی کتاب پڑھنے لگی۔

کتاب پڑھنے کا نرالا انداز چین میں دیکھا۔ ۱۹۴۹ء میں آزادی پانے کے بعد چیئرمین ماؤ نے کہا کہ ہمارے ملک کی سب سے بڑی طاقت کسان ہیں۔ کسان ساری آبادی کا اسی فیصد ہیں، لیکن سارے کے سارے اَن پڑھ ہیں، اگر کہیں یہ پڑھے لکھے ہوتے تو تعمیر نو کا کام بہت آسان ہو جاتا۔

چیئرمین ماؤ تو یہ آرزو بیان کر کے خاموش ہو رہے، لیکن اَن پڑھ کسانوں نے تہیہ کر لیا کہ فارغ وقت میں تعلیم حاصل کر کے رہیں گے۔ آپ کے ذہن میں تعلیم بالغاں کا تصور ہوگا، میرے ذہن میں یہی تھا۔ قاف شین سے شلشے ای کمیون کو جاتے ہوئے ہم نے راستے میں ہل چلاتے کسانوں کو دیکھا جو پرانی وضع کے ہلوں میں سیاہ بھینسے جوتے، بانس کی چھتری نما ٹوپیوں پیچھے دو چوٹیاں چھوڑے ٹھوڑی پر گیارہ گیارہ بال ڈاڑھی کے لٹکائے مکئی کے کھیتوں میں ناڑی سے بوائی کر رہے تھے۔ ہر کسان کی پشت پر پلائی وڈ کا پھٹا لٹک رہا تھا، ویسا ہی جیسے ٹورنگ ٹاکیز کے ٹلی کھڑکانے والے اٹھا کر پھرا کرتے ہیں۔ ان پر چینی زبان میں موٹے موٹے حروف میں کچھ لکھا تھا۔ میں نے چانگ سے پوچھا یہ کیا ہے؟ چانگ نے کہا ان پہ لکھا ہے۔ اب جا، کل آ، ہل پہ چل صنعت کر۔ آج کا کام آج کر لے۔ روٹی کھا لے، پانی پی لے۔

اگلے ہالی کا پھٹا پچھلا ہالی پڑھتا جاتا ہے اور اپنا آموختہ یاد کیے جاتا ہے، پچھلے ہالی

کا اس سے پچھلا کسان اور یوں کتاب عمل کے اوراق کھیتوں میں ہل پھالے کے ساتھ ساتھ گھومتے رہتے ہیں، چیئرمین ماؤ کے فرشتوں کو بھی علم نہیں کہ عمر رسیدہ کسانوں نے اپنے آپ کو ابتدائی پڑھائی سے روشناس کرانے کے لیے کیا طریق ایجاد کیا ہے۔

میں نے چانگ سے کہا ٹھہرو، مجھے ان کسانوں کا فوٹو اتارنے دو۔ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

ان کا فوٹو! وہ کس لیے؟ میں نے کہا میرے چار پیسے بن جائیں گے۔ کچھ ایکسچینج مل جائے گا۔

"ایکس چینج؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

میں نے کہا ہاں بھائی، یہ بہت کمال کی چیز ہاتھ آئی ہے۔ میں یہ تصویریں ایک چھوٹے سے مضمون کے ساتھ کسی امریکی رسالے کو بھیج دوں گا، عنوان ہوگا۔

چین کے عمر رسیدہ وضعدار کسانوں پر چینی ڈکٹیٹر شپ کے مظالم!

جو کسان پارٹی کا ساتھ دینے سے انکار کرتے ہیں، ان کے گلے میں ماؤزے تنگ کی تعلیمات کے پھٹے ڈال دیئے جاتے ہیں، وہ چینی آقا کے ان پھٹوں کو اپنے جسموں سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ انھیں انہی تختوں کے ساتھ سونا پڑتا ہے اور انہی کا بوجھ اٹھا کر ہل چلانا پڑتا ہے۔

چانگ ہنسا اور بولا کتنی رقم مل جائے گی؟

میں نے کہا تصویر کے ساتھ تین چار سو ڈالر مل جائیں گے۔

چانگ نے کہا تو پھر جلدی کرو، ایسا موقع بار بار ہاتھ نہیں آئے گا۔

میں نے کہا یار چانگ، بدنام ضرور ہوں پر ایسا بد نہیں ہوں!

شاشٹے ای کمیون کی کہانی بہت لمبی کہانی ہے اسے پھر کسی مناسب وقت پر اٹھا رکھتا ہوں۔ خلاصہ یہ ہے کہ شاشٹے پہاڑ سطح سمندر سے کوئی ساڑھے تین ہزار فٹ اونچا ہے۔ سارا پہاڑ چکنے پتھر کا ہے اور صدیوں کی آندھیوں اور تند ہواؤں نے ان پتھروں پر کوئی چھ چھ انچ مٹی ادھر اُدھر سے اٹھا کر ڈال دی ہے۔ شاشٹے ای بریگیڈ نے سوچا کہ ملک چین میں اگر

یہ پہاڑ چٹیل رہ گیا تو ستر کروڑ لوگوں کو چٹکی چٹکی بھر آٹا کم ملے گا۔ کیوں نہ لگے ہاتھوں یہاں بھی مکئی کی فصل بو دیں، کمیون نے فیصلہ کر لیا اور جیالے کسان بیج لے کر وہاں پہنچ گئے۔ بیج بو دیا گیا، لیکن پانی کے بغیر بیج اُگتا کہاں سے۔ بڑے بوڑھوں نے کہا، پانی تھوڑا بہت تو ہونا چاہیے، پھر شاید کہیں سے کوئی بدلی آ کر برس جائے۔ تین چار روز کے سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ نیچے دس میل پر جو ندی بہتی ہے۔ اس سے پانی کے کنستر بھر بھر کر لاتے ہیں اور اپنے کھیت سیراب کرتے ہیں، لڑکوں نے ڈنکے پر چوٹ لگا دی۔ لڑکیاں کمر کس کر سرخ جھنڈا لے کر جھونپڑیوں سے باہر نکل آئیں۔ چھ سو مرد عورتیں پانی کے خالی برتن کندھوں پر رکھ کر چلے اور دس میل نیچے ندی پر پہنچ گئے۔ وہاں سب نے اپنے اپنے برتن میں پانی بھرا اور پھر اوپر چڑھنے لگے۔ صبح سویرے چار بجے یہ قافلہ پانی لینے نکل جاتا۔ پانی چھڑک دیا جاتا اور رات کو کمیون کے کھپریل تلے ۔

مکئی اُگنے اور فصل پکنے پر نظمیں کہی جاتی ہیں، گیت گائے جاتے، مکئی کی فصل نے سر نکالا اور پودے کوئی اُنگل اُنگل بھر کے ہو گئے۔ جب قدرت نے کمال کیا، شام کے وقت بادل گھر کر آئے۔ سب لوگ کمیون کے طویلے میں جمع ہوئے، بارش برسی، وہ برسی۔۔۔۔۔
وہ برسی کہ صدیوں کی پڑی ہوئی مٹی مکئی کی فصل سمیت پتھروں سے چاٹ کر نالوں کے ذریعے ترائی میں اُتر گئی۔ کمیون کے دروازے پر کھڑی ہوئی عورتیں زور زور سے رونے لگیں۔ بوڑھے فلک ناہنجار کو بددعائیں دینے لگے، جوانوں کی کمریں ٹوٹ گئیں۔ بڑی بھیانک بارش تھی۔ بڑا خوفناک سماں تھا، کسی بیوقوف لڑکے نے ڈنکے پر چوٹ لگا دی۔ کمیون کے لوگ جلتی بجھتی لالٹین اور کاغذی قندیل لے کر پوچھنے لگے کیا ہوا کیا ہوا؟

لڑکے نے کہا "فصل کی کیا فکر کرتے ہو ہماری مٹی گئی۔"

بوڑھوں نے کہا "مٹی گئی۔"

جوانوں نے کہا "مٹی گئی۔"

پھر ڈنگے پر چوٹ پڑی، سب نے اپنے اپنے برتن سنبھالے اور بہتے ہوئے نالوں کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگے، عورتیں اپنے اپنے دروازوں پر لمبے سرخ رومال لیے روتی رہیں۔ بین کرتی رہیں۔ صبح سویرے بارہ میل کی دوری پر انہوں نے اپنی مٹی کو جا پکڑا، یہ مٹی ایک بڑے برساتی نالے کے بیڈ میں بیٹھ گئی اور اس پر بیل کے تالو ایسی لہریں اُبھر آئی تھیں، سب نے یک زبان ہو کر مٹی سے کہا چل ہم تجھے لینے آئے ہیں۔ سب نے پانی لے جانے والا برتن سیلی سیلی مٹی سے بھرا اور اسے کندھے پر رکھ کر پہاڑ کے پنجے پر پہلا قدم دھرا اور اوپر چڑھنے لگے۔ راستے میں انہیں اپنے کمیون کی عورتیں ملیں جو آنسوؤں سے بھیگے سرخ رومال اپنی کمروں سے باندھے خالی برتن لٹکائے اپنے کمیون کے کھیتوں کی مٹی ترائی سے واپس لینے آئی تھیں۔ اس ایک بارش کے بعد وہ تین سال مٹی ڈھوتے رہے۔ صبح چار بجے سے شام کے ساڑھے سات بجے تک ایک فرد ایک دن میں ایک کنستر مٹی لا سکتا تھا۔

اس مٹی والے کھیت کے سرخ ٹماٹر، سبز کھیرے اور خوشبودار پہاڑی سبز مرچیں کھاتے ہوئے میں نے اور شوکت صدیقی نے بڑے مربیانہ انداز میں کسانوں سے کہا۔ شاباش بھئی۔ بڑی اچھی کھیتی اگائی ہے تم نے، آئندہ بھی ایسے ہی محنت کرتے رہو گے تو اچھا پھل پاؤ گے۔ شاباش شاباش ..... ویری گڈ ..... ویری گڈ .....

میں نے اور عراقی یار اور سیلون کے منو ویرانے تالی بجا کر کہا، ویری گڈ، ویری گڈ۔ دریائے ینگ سی پر ہوپے پروانس کے پانچ ہزار لڑکے اور لڑکیاں ہم افرو ایشیائی ادیبوں کے اعزاز میں تیر کر دکھا رہے تھے۔ ہم ایک سو اکسٹھ ادیب اور دانش ور خوبصورت موٹر بوٹوں میں بیٹھے ان کا نظارہ کر رہے تھے۔ تیراکوں نے سرخ جھنڈے ایک ہاتھ میں اٹھا رکھے تھے اور دوسرے ہاتھ سے وہ پانی کی لہروں کو چیر رہے تھے۔ ہم بڑے مشفقانہ اور مربیانہ انداز میں تالی بجا رہے تھے۔ ایک دفعہ شیپ شنینک صاحب کمشنر جالندھر ڈویژن فیروز پور آئے تھے تو میں نے اور میرے چھوٹے بھائی نے بیرن

پارک ٹینک میں انہیں تیر کر دکھایا تھا تو کمشنر صاحب نے عین اسی انداز میں تالی بجائی تھی۔ جیسے ہم ہوپلے پر دانس کے جوانوں کو دیکھ کر بجا رہے تھے ـــــ اتنے میں شور مچا ــ ماؤزے شی۔ ماؤزے شی . . . ہم نے پلٹ کر دیکھا گہرے رنگ کے ایک چھوٹے سے اگن بوٹ پر بند بند آنکھوں والا پانچ فٹ گیارہ انچ کا دوہرے بدن کا ماؤزے تنگ کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ پھر ایک شور مچا، ہنگامہ ہوا۔ سرخ جھنڈے تیراکوں کے ہاتھ سے چھوٹ گئے، ماؤ اپنے بوٹ میں ہاتھ لہراتا، تالی بجاتا دور نکل گیا۔ اس کا بوٹ دریا کے ایک کنارے پر جا ٹھہرا۔ سب چینی ساکت و جامد ہو گئے، جو دریا میں تھے وہ بھی، جو ہمارے ساتھ موٹر بوٹوں پر تھے وہ بھی۔

چانگ نے کہا چیئرمین ماؤ ینگ سی میں تیرنے لگے ہیں۔ میں نے کہا۔ چانگ ایمانداری سے کہنا کیا یہ regimentation نہیں کہ چونکہ ماؤ کو تیراکی پسند ہے، اس لیے اس نے سارے چینیوں کو مجبور کر رکھا ہے کہ وہ تیر نا ضرور سیکھیں۔

چانگ نے ہنس کر کہا اس statement کے تمہیں کتنے پیسے مل جائیں گے؟ میں نے کہا۔ پچیس تیس پونڈ سے زیادہ نہیں ـــــ "پچیس تیس پونڈ سے زیادہ نہیں . . . تیس پونڈ ہوگا، آپ تول کے دیکھ لیجیے۔ یہ بات میں نے شنگھائی ایئرپورٹ پر PIA کے سٹال میں اپنا سوٹ کیس تلواتے ہوئے کہی۔

نوجوان نے کہا۔ "کوئی بات نہیں، آپ چاہے دس بیس سیر وزن اور لے جائیے۔" جب میں گینگ وے پر چڑھ کر جہاز میں داخل ہوا تو سٹوارڈ نے کہا welcome sir گڈ ایوننگ۔

میں نے کہا السلام علیکم۔ بولا آپ بھی ان افریقی بھائیوں کے ساتھ ہیں؟ میں نے ماتھے پر تیوری ڈال کر کہا۔ "بھئی کانفرنس میں شریک ہونے آئے تھے۔" کہنے لگا۔ "سر چین کیسا لگا آپ کو۔"

میں نے کہا۔ کچھ نہیں یار سٹوارڈ۔

سادگی و پُرکاری، بے خودی و ہشیاری

حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

لے اپنی گل اے اور ساری دنیا بو تھا اٹھا کر خواہ مخواہ چین کی طرف دیکھ رہی ہے مجھے تو چین اور پاکستان میں کوئی خاص فرق دکھائی نہیں دیا۔ سٹوارڈ نے مسکرا کر کہا۔ "یس سر۔ یو آر رائٹ "۔ فاسن یوئر سیٹ بیلٹ ۔ پلیز!

چچا سام کے ساتھ

میں نے ان کو بڑی دور سے "بوربون" کی بوتل منہ سے لگائے باری باری چسکیاں لگاتے دیکھا تھا اور مجھے یقین تھا کہ بوتل ختم کر چکنے پر وہ ساتھ کے کھیت میں جائیں گے اور ناف ڈباؤ گھاس کے سمندر میں لیٹ جائیں گے۔ لیکن میرا قیافہ غلط نکلا ـــــ وہ بوتل ختم کرنے سے پہلے ہی کھیت کی طرف چل دیئے اور راستے میں رُک رُک کر بوتل کے اور ایک دوسرے کے بوسے لینے لگے۔ میں نے چارپائی تلے سے باٹا کے کینوس شو نکالے اور ان کی طرف شست باندھے جوتے پہننے لگا۔ اب وہ گھاس کے سمندر میں داخل ہو چکے تھے اور مجھے صرف ان کے کندھے اور سر نظر آ رہے تھے۔ جب کھیت کا یہ نشیب ختم ہوا اور مجھے ان کے کندھے پھر کمر اور لڑکے کا دبلا سا لک دکھائی دیا تو میں پی ٹی شو پہن کر تیار ہو چکا تھا۔

کمرے کا دروازہ بھیڑ کر میں کاٹھ کی سیڑھی سے نیچے اترا اور تیز تیز قدم اٹھاتا اس سمت جانے لگا جدھر وہ گئے تھے ـــــ مجھے یقین تھا کہ انہوں نے اپنی بوتل ختم کر لی ہے اور اب وہ دل لگی بازی کے لیے بیٹھنے والے ہیں ـــــ اپنی نظروں سے اوجھل پا کر میں چھ سات گز اونٹ کی طرح بھاگا بھی لیکن خوش قسمتی سے مجھے لڑکے کا ہاتھ نظر آ گیا جو نیلے آسمان کے پس منظر میں مشعل کی طرح اٹھا ہوا تھا ـــــ اس کے ہاتھ میں اب بھی بوربون کی گردن تھی۔ پھر انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا لڑکے نے زور سے ہاتھ گھما کر بوتل گھاس کے سمندر میں پھینک دی اور وہ ہریاول کے گرداب میں ڈوب گئے۔

مجھے ان کے بیٹھنے کی جگہ اور بوتل کے گرنے کا مقام دونوں معلوم تھے۔ ان دونوں کے درمیان کچھ اتنا بہت فاصلہ نہ تھا لیکن میرے فطری تقاضے نے خوف کی ناکہ بندی مجھ سے بہت دور کر رکھی تھی اور میں کچھ سیٹی بجانے کے موڈ میں چلا جا رہا تھا ــــــ جب میں نے گھاس کے کھیت میں پہلا قدم رکھا تو ماچس کی تیلی جتنا ٹڈا پھدک کر میری گردن سے ٹکرایا۔ خوف کے باعث میرا سارا بدن پسینے میں ڈوب گیا اور ٹڈا میری گردن سے چمٹ کر رہ گیا۔ جب میں تین چار قدم گھاس کے اندر پہنچا تو مجھے گھاس سے تشتالے کی سی جانی پہچانی خوشبو آئی اور میں نے ایک ہی ہاتھ میں ٹڈا گردن سے نوچ کر پرے پھینک دیا ــــــ اس منزل مقصود تک اپنے آپ کو پہنچانے کے لیے مجھے خفیہ طریق استعمال کرنا چاہیے اور جونہی یہ خیال میرے ذہن میں آیا میں زمین پر بیٹھ گیا۔ پھر اس جوڑے کی بلی کی طرح ہڑ ہڑ کرتی آوازیں قریب آنے لگیں۔ اور میں سفر مینا کے سپاہی کی طرح پیٹ کے بل لیٹ کر آگے رینگنے لگا ــــــ ایک مرتبہ دل میں خیال آیا بھی کہ چھوڑو اس ساری بک بک کو جو روشن کرتے ہیں وہی کرو۔ لیکن پھر رہ نہ سکا۔ پاکستان میں اتنی زندگی گزاری تھی۔ یہیں بڑھا پلا تھا ــــــ اسی جگہ تعلیم حاصل کی تھی اور یہیں کے طور طریقے جانتا تھا۔ پھر میں کس طرح سے اتنی پرانی ریت کو چھوڑ دیتا ــــــ دل نے کہا۔ میاں اب تو جو ہو سو ہو پیچھے مڑنا مردوں کا شیوہ نہیں واپس وطن جا کر کیا منہ دکھلاؤ گے۔ تھوڑی سی ہمت اور کرو ــــــ ذرا آگے بڑھو اور پھر دیکھو کہ نظارہ کیا دیتا ہے ــــــ بسم اللہ کر کے آگے بڑھا اور بڑھا اور پھر اور بڑھا لیکن کچھ بھی نظر نہ آیا۔ ایک نے کہا تم سمت بھول گئے ہو ــــــ دوسری نے کہا۔ "رخ بدل گئے ہو" ــــــ تیسری نے کہا۔ اب نظر کو پرانی دید سے ملا کر موازنہ کرو اور تیسری کا یہ کہنا تھا کہ میں اٹھ کر پھر کھڑا ہو گیا پیپل کا جو درخت میرے دائیں تھا اب بالکل بائیں گھوم چکا تھا اور پہاڑی پیچھے سے دائیں کو سرک آئی تھی ــــــ میں نے پھر ان دونوں چیزوں کو ایک نقطہ فرض کر کے

وہاں سے ایک خط مماس کھینچا اور اپنی اقلیدس پر بھروسہ کرکے پھر پیٹ کے بل رینگنے لگا ــــ جوں جوں جانی اَن جانی آوازیں قریب آ رہی تھیں میرا سانس خود بخود رُک رہا تھا۔

چھ سات گز کی مسلسل تگ و دو کے بعد مجھے گھاس میں ایک آبی چمک سی دکھائی دی اور میں نے ایک ہی لپک میں آگے بڑھ کر بوربون کی خالی بوتل کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور جس طرح آیا تھا۔ اسی طرح رینگتا گھسٹتا رپٹتا بڑھتا گھاس کے سمندر سے باہر نکل گیا ــــ سورج ابھی پہاڑی کی چوٹی پر چمک رہا تھا۔ لیکن اس میں وہ دوپہر کا سا دم خم نہیں تھا۔

ورمونٹ کی سرسبز پہاڑیوں کے دامن میں چیل ٹریز چھاؤنیاں چھائے کھڑے تھے۔ اور ان کے نیچے اِکا دُکا خزاں رسیدہ پتے گرنے لگے تھے۔

ہاسٹل کے پہلو میں باروں سے ادیبوں اور ادیب نوازوں کے گروہ باہر نکل رہے تھے ــــ بھگویں انگ کی دھوپ سرسبز میدانوں پر پھیلی ہوئی تھی اور نیلسن آنگرن اپنی نئی دوست کے ساتھ بے ادبی کی باتیں کرتے ہوئے چہل قدمی کر رہا تھا ــــ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے رُکا پھر ٹھٹھکا اور پھر سر ہلا کر کہنے لگا۔ "خوب بوربون ــــ اشفاق تم کو بھی خدا نے توفیق دی لیکن یوں اکیلے اکیلے گھاس کے کھیتوں میں چھپ کر لوشے لینے سے فائدہ۔"

میں نے کہا "سر پہلے پہلے یوں ہی ہوا کرتا ہے ــــ اِک ذرا ہاتھ تک جانے دو" پھر دیکھنا۔"

کہنے لگا۔" ہے کچھ بیچ میں۔"

میں نے کہا۔ "جی ہے تو سہی لیکن یہ شام کا بارود ہے۔ یہ پاس نہ رہا تو تقویٰ پھر محاصرہ کر لے گا اور بندہ پھر قلعہ بند ہو جائے گا۔"

شارلٹ بولی "جاؤ جاؤ —— یہ تو یونہی بکواس کر رہا ہے —— پردیسیوں سے بھی کبھی کسی نے شراب مانگی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں جی ہیجڑوں سے بھی کبھی کسی کو مرادیں ملی ہیں۔ یہ تو یونہی میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔"

نیلسن نے کہا۔ "اچھا یار کبھی ہم بھی لائیں گے ایک مہر بند بوتل۔"

شارلٹ بولی۔ "شاباش۔"

میں نے کہا۔ "سر وہ آپ نے کہا تھا کہ اپنی کتاب آٹوگراف کر کے دیں گے۔ لیکن آپ نے ابھی تک دی نہیں۔ دو دن بیت گئے ہیں اس کانفرنس میں آئے۔"

نیلسن نے کہا۔ "ایسی کون سی جلدی ہے۔ ابھی تو ہم اس کانفرنس میں پندرہ دن تک بندھے رہیں گے۔ کسی دن لے لینا۔"

میں نے کہا۔ "جناب میں نے آپ کی کتاب "دا مین ود دی گولڈن آرم" کانفرنس کے سٹال سے خرید لی ہے اور اس کو آٹوگراف کرانا چاہتا ہوں۔"

"صرف اس ایک کتاب کو کیوں" شارلٹ نے پوچھا۔

"وہ اس لیے" میں نے جواب دیا۔ "کہ ان کی یہی کتاب پاکستان میں معروف ہے اور فلم بننے کی وجہ سے یہ اور بھی مشہور ہو گئی ہے۔"

"لیکن تم اس گاؤدی کے آٹوگراف لے کر کیا کرو گے۔" شارلٹ نے پوچھا۔ "تم تو خود ادیب ہو۔"

کل شام تک شارلٹ بھی اس کو میری طرح "سر" کہتی تھی لیکن ایک رات گزرنے پر اس نے اس کی صفت تبدیل کر دی۔

میں نے کہا۔ "جی بات یہ ہے مجھے ان کے آٹوگراف کی سخت ضرورت ہے۔ میرے وطن کا جو بھی ادیب امریکہ سے ہو کر آتا ہے تو وہ کسی امریکی مصنف کی آٹوگراف کتاب

ضرور لے کر آتا ہے ـــــ کسی کے پاس کچھ خط بھی ہوتے ہیں جو امریکی مصنف نے بڑی بے تکلفی کے انداز میں پاکستانی مکتوب الیہ کو لکھے ہوتے ہیں۔"

نیلسن آلگرن نے کہا۔" لیکن میں تو تمہیں اپنی کتاب نہیں دے رہا ہوں۔ میری کتاب تو تم نے سٹال سے خریدی ہے۔"

میں نے کہا۔" سر مجھے اس سے سروکار نہیں کہ کتاب آپ نے دی ہے یا میں نے خریدی ہے۔ مجھے تو اس بات کی آرزو ہے کہ آپ اپنے دست مبارک سے ایک سطر لکھ دیں۔"

نیلسن نے مسکرا کر کہا۔" اگر میں نہ لکھوں تو۔"

"تو" میں نے سر جھکا کر کہا۔" میں اس کانفرنس کے خاتمے پر واشنگٹن واپس جا کر اپنے ہوٹل کے مینجر سے اس پر آٹوگراف لے لوں گا۔"

"اور وہ میرے نام کے آٹوگراف دیدے گا۔" نیلسن نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں کیوں نہیں ـــــ یہ امریکہ ہے ـــــ یہاں سب کچھ چلتا ہے۔" میں نے منہ پکا کر کے کہا۔

نیلسن نے کہا۔" جاؤ برخوردار اس وقت اپنے تلعے کی حفاظت کرو پھر یہ باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔"

میں بوربون کی بوتل ہاتھ میں گھماتا کاٹھ کی سیڑھی چڑھ کر اپنے کمرے میں آ بیٹھا اور آہستہ آہستہ کینوس شو اتارنے لگا۔

جگراؤں کے حکیم نے ابا جان کی موجودگی میں ایک بات کہی تھی کہ بیٹا بی۔اے کا امتحان دینے لاہور جا رہا ہے ہو قبض سے بچنا ـــــ یہ سو بیماریوں کی ایک بیماری ہے۔

اس وقت مجھے رہ رہ کر جگر الواں کے حکیم صاحب یاد آرہے تھے اور ان کا پُر نور چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا ــــ جب سے میں واشنگٹن کا ہوٹل چھوڑ کر ادیبوں کی اس کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے بریڈ لاف آیا تھا، میں اس سو بیماریوں کی ایک بیماری میں مبتلا تھا ــــ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ واشنگٹن کے ہوٹل میں میرے پاس ایک بوتل تھی جو لوٹے کا کام دیتی تھی۔ یہ کانفرنس ریاست ورمانٹ میں مڈل بیری قصبے سے کوئی بارہ میل دور ایک پرانی سرائے میں منعقد ہوئی تھی اور یہاں زندگی کی تمام سہولتیں میسر تھیں ماسوائے ایک آفتابے کے۔

میں جس ہاسٹل میں مقیم تھا وہ دو منزلہ تھا ــــ اوپر آٹھ کمرے تھے اور سب کے دروازے ایک دوسرے کے ساتھ کھلتے تھے ــــ کونے میں ایک غسل خانہ تھا جس میں شاور بھی تھا اور ٹب بھی ــــ ہم نیچے اور اوپر کے رہنے والے اسی غسل خانے کو استعمال کرتے تھے۔ ایک چھوٹا سا غسل خانہ نیچے بھی تھا ــــ لیکن اس میں صرف ایک بیسن تھا جو ہاتھ منہ دھونے کے کام آسکتا تھا۔ لیکن اس کو بہت کم لوگ استعمال کرتے تھے۔

میرے کمرے کے سامنے بوڑھا سیلر رہتا تھا جس نے چھپن برس ڈاڑھی رکھنے کے بعد پچھلے سال اس کا صفایا کرا دیا تھا۔ اور اب بقول اس کے وہ ایک نوخیز چھوکرے کی طرح اُڑا اُڑا پھرتا تھا ــــ اس کے دونوں کانوں میں ہیرنگ ایڈ کے ڈاٹ لگے تھے جن کی ڈوری ہر وقت اس کی ٹھوڑی کے نیچے جھولتی رہتی تھی ــــ گلے میں وہ کاؤ بوائے والی چرمی ڈور کی ٹائی پہنتا تھا اور بڑا خوش مزاج انسان تھا ــــ اکثر وہ میرے کمرے میں آ بیٹھتا اور مجھے اردو لکھوا کر دیکھا کرتا ــــ اسے حیرانی اس بات کی ہوتی تھی کہ اردو لکھتے ہوئے ہاتھ کو جو غیر قدرتی حرکت دائیں سے بائیں کرنا پڑتی ہے اس سے ہاتھ تھکتا کیوں نہیں اور اگر تھکتا ہے تو لکھنے والا اس کا اظہار کیوں نہیں کرتا ــــ اس نے مجھے کھڑکی کے سامنے دھوپ میں بٹھا کر میری مُووی بھی اتاری تھی تاکہ وہ اپنے عزیزوں کو اس

بات کا دستاویزی ثبوت دے سکے کہ ایک زبان الٹ بھی لکھی جاتی ہے اور الٹا لکھنے سے آدمی گھبراتا نہیں ہے۔

واشنگٹن سے چلتے ہوئے میں نے جس چیز پر اپنا ایک دن کا پورا بھتہ لگا دیا تھا وہ ایک ڈریسنگ گاؤن تھا جو میں نے ایک اعلےٰ درجہ کی دکان سے محض اس لیے خریدا تھا۔ کہ کانفرنس میں اگر کبھی اپنے کمرے سے باہر نکلنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو کیا پہنوں گا۔ اس گاؤن پر کوئی پچھتر روپے خرچ ہوئے تھے اور اگر اس کی ڈوری بھی تبدیل کر لی جاتی، تو اس پر کوئی پندرہ روپے کا مزید خرچہ اٹھتا ——— اس گاؤن کو نہایت ادب اور عقیدت کے ساتھ اٹیچی میں بند کر کے جب میں نیو یارک کے ہوائی اڈے پر پہنچا تھا تو میرے قدم زمین پر نہ پڑتے تھے۔ بریڈلاف پہنچ کر میری سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ جلد شام ہو پھر رات آئے، رات کٹے اور پو پھٹے اور میں ڈریسنگ گاؤن پہن کر اپنے کمرے سے سگریٹ پیتا ہوا غسل خانے جاؤں ——— وہاں شیو کروں پھر واپس آؤں تولیہ کندھے پر ڈال کر بالکنی میں سے جھانکوں اور پھر منہ ہاتھ دھونے کو غسل خانے کا رُخ کروں۔

رات آئی اور بڑی مشکل سے گزری ——— صبح میں نے جوتے پالش کیے ——— سگریٹ سلگایا دو چار کش لیے کھڑکی کا پردہ سرکایا اور گاؤن پہن کر غسل خانے کی طرف چل دیا۔ اندر سے دروازہ بند تھا۔

میں آکر کرسی پر بیٹھ گیا اور کھڑکی میں سے باہر پہاڑوں کا نظارہ کرنے لگا ——— اتنے میں میرے دروازے پر ٹک ٹک ننھی سی دستک ہوئی اور بوڑھا سیلر اندر داخل ہوا۔ اس کی چھاتی پر اب بھی گیارہ بارہ سفید بال تھے ——— جسم گو جھریوں کی لپیٹ میں آ گیا تھا لیکن بدن ستواں اور کمایا ہوا تھا ——— اس نے اپنی کمر کے گرد ایک چھوٹا سا

تولیہ لپیٹ رکھا تھا اور تولیے کے شگاف میں سے سب کچھ نظر آرہا تھا۔ بڈھے نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر پوچھا۔ "تمہارے دیس میں بھی رواج ہے کہ مرد اندر سے غسل خانے کا دروازہ بند کر لیتے ہیں۔"

مَیں ابھی اس بات کا کوئی مناسب سا جواب ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ اس نے کہا۔ "بھلا مردوں کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ غسل خانے کے دروازے بند کرتے پھریں۔ یہ تو عورتوں کے کام ہیں اور آج کل عورتیں بھی کہاں بند کرتی ہیں۔"

میں نے دل میں کہا۔ "تمہارے منہ میں گھی شکر۔"

اس نے کہا۔ "اب میں دو دفعہ دروازہ دھڑ دھڑا آیا ہوں لیکن کوئی ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ کیا عجیب لوگ ہیں ورمانٹ کے۔"

میں نے کہا۔ "یہ ریاست ہی عجیب سی لگتی ہے مجھے۔ دیکھو ناں کیا موسم ہے نہ سرد نہ گرم۔ مَیں تو بیمار ہو جاؤں گا۔"

وہ کرسی کھینچ کر ناگا سرداری کی طرح اس پہ بیٹھ گیا اور دایاں پاؤں اٹھا کر اور اسے بائیں زانو پر رکھ کر میری طرف جھک گیا ــــــ پھر ایک آنکھ میچ کر بولا۔ "کیا عمر ہو گی تمہاری۔"

میں نے جواب دیا۔ "اگلے ہفتے چالیسواں برس شروع ہو جائے گا۔"

اس نے قہقہہ مار کر میرا کندھا ٹھونکا اور کہا۔ "ابھی سے بیمار ہونے کی سوچ لیے ہو۔ ابھی تو بہت سال پڑے ہیں۔"

پھر غسل خانے کی چٹخنی کھلنے کی صدا آئی ــــــ وہ جلدی سے اٹھ کر بھاگا اور جلدی میں اپنا چھوٹا سا تولیہ میری کرسی پر ہی چھوڑ گیا ــــــ میرے کمرے سے پورے تین قدم باہر نکل کر اسے اپنے تولیے کا خیال آیا اور وہ پھر میرے کمرے میں داخل ہو کر اپنا تولیہ اٹھا کر چلتا بنا ــــــ میں نے اپنا ڈریسنگ گاؤن اتار کر احتیاط سے تہہ کیا اور اسے

کمال حفاظت سے اٹیچی کے نیچے ڈال کر اس پر دوسرے کپڑوں کے ردے لگا دیئے۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد میں غسل خانے میں داخل ہوا تو وہ پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اور ایک اور نوجوان تولیے سے اپنا بدن پونچھ رہا تھا ــــ مجھے دیکھ کر بوڑھے نے اس نوجوان سے میرا تعارف کرایا اور کہا۔"یہ میرا پڑوسی ہے اور یہ نوجوان پیچھے چھتیس نمبر میں رہتا ہے۔"

"چھیالیس" نوجوان نے کہا اور باہر نکل گیا۔

بوڑھے نے کہا۔"کمال ہے ــــ اس وقت تمہیں چٹخنی گرنے کی آواز آئی تھی ناں۔"

"بالکل۔" میں نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

"لیکن۔" بوڑھا بولا۔"جب میں نے آکر دروازہ دھکیلا تو یہ اندر سے بدستور بند تھا۔"

"شاید اس نے باہر نکلنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہو۔" میں نے اندازہ لگایا۔

"کچھ یہی معلوم ہوتا ہے۔" بوڑھے نے تولیہ اتار کر ٹانگتے ہوئے کہا۔"عجیب ڈھلمل یقین نسل پیدا ہو رہی ہے آجکل۔"

میں نے شیو کرتے ہوئے بیسن کے شیشے میں سے اسے دیکھا ــــ وہ اپنی گردن اپنی چھاتی اور بغلوں کو لسٹر بین سے لتھڑ رہا تھا اور کوئی پرانی دھن ضعیف سی سیٹی میں بجا رہا تھا ــــ میں نے آئینے میں دیکھا ــــ اس نے بوتل بند کی طاق میں رکھ دی اور پھر اسی طرح سیٹی بجاتا ہوا کموڈ پر بیٹھ گیا ــــ اس کا پیٹ کچھ خراب تھا اور "چولستان" کے سامنے کی طرح گردن ہلا رہا تھا ــــ اس نے چقندر سا سرخ منہ اوپر اٹھا کر کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے تیسری عالمگیر جنگ ہو گی یا نہیں۔"

"اب تو مشکل ہی ہے۔" میں نے شیشے میں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے کہا۔ "اپنا علاقہ چھوڑ کر کسی اور علاقے کا سفر اختیار کرو تو قبض ہو جاتی ہے۔"

"اور قبض" میں نے کہا۔ "سو بیماریوں کی ایک بیماری ہے۔"

اس نے کہا۔ "تمہارے پاکستان میں بھی قبض ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "خوب۔"

"اور کینسر۔" اس نے پوچھا۔

"کم کم" میں نے جواب دیا۔

پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور تولیہ کمر کے گرد لپیٹ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

جب سے میں نے گھاس کے سمندر سے بوربون کا آفتابہ اٹھایا تھا، میری تمام کلفتیں دور ہو گئیں تھیں اور میں بہت خوش تھا۔ اس بات کو کوئی تین دن گزر گئے۔ گھر سے خیر خیریت کا خط بھی آ گیا تھا اور ملیسن آلگرن نے اپنی کتاب میرے لیے آٹوگراف بھی کر دی تھیں۔ حالات بڑے خوشگوار تھے کہ ایک دن غسل خانے میں پرچہ لگ گیا۔

گھروں کے اندر غسل خانوں میں تو یہ ہر حال میں ننگے پاؤں ہی جاتے ہیں۔ خاص طور پر رات کے وقت۔ اس وقت کون جوتا ڈھونڈے کون بتی جلائے۔ چونکہ ان کے غسل خانوں میں پانی کا استعمال فرش پر نہیں ہوتا۔ اس لیے ربڑ شیٹ سے منڈھے فرش ہمیشہ خشک رہتے ہیں۔ آفتابہ چونکہ بھرا آفتابہ ہے اس لیے کمال احتیاط کے باوجود گملے کے اردگرد پانی کے چھپاکے پڑھی جاتے تھے جو ننگے پاؤں غسل خانے میں آنے والوں کو ناگوار گزرتے تھے۔

ایک دن غسل خانے میں پرچہ لگ گیا۔ یہ ایک بے ڈھنگے سے گتے پر بھدی سی پنسل کی تحریر میں تھا۔ لکھا تھا:

"کمزوری، لاغری اور کجی والے اصحاب مہربانی فرما کر کموڈ کے عین اوپر ہو کے فارغ ہوا کریں۔ شکریہ!"

اس کے بعد میں بوربون کی بوتل لے کر گھاس کے سمندر میں اندر دور تک چلا گیا اور اسے گوپھیے کی طرح گھما کر ذخیرے کی طرف پھینک دیا۔

ماؤزے تنگ ــــ ایک یاد

چیئرمین ماؤزے تنگ سے میری ملاقات ۱۹۶۶ء میں ہوئی ہم ایشیا اور افریقہ کے تقریباً ساٹھ ستر ادیب پیکنگ میں جمع تھے اور ایک ہفتے سے ایفروایشین رائٹرز کانفرنس کی مختلف نشستوں میں شریک ہو رہے تھے۔ تقریریں چونکہ بہت لمبی اور تقریباً ایک ہی موضوع کی تھیں اس لئے ان میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ میزبان چونکہ بے حد شریف، نہایت متواضع اور حلیم شخصیت کے تھے اس لئے ان سے ملتے ہوئے شدید شرمندگی کا احساس ہوتا تھا۔ میری تربیت چونکہ ایک خاص وضع کی اور ایک خاص علم کی بنیاد پر ہوئی تھی اس لئے ان کے ساتھ مکالمہ کرنے میں لطف نہیں آتا تھا۔ کانفرنس ہال میں موجود ہونے کے باوصف میں اکثر غائب رہتا اور تاسف کیا کرتا کہ اتنی دور آنے کے باوجود میں چیئرمین ماؤ سے نہ مل سکوں گا۔ اس لئے نہیں کہ وہ ایک مصروف آدمی تھا یا ایک عظیم نظام کا سربراہ تھا بلکہ صرف اس وجہ سے کہ وہ اس جہانِ فانی میں موجود نہ تھا اور اس کو فوت ہوئے دو مہینے ہو چکے تھے۔

پاکستان سے روانگی سے قبل میں "ٹائم میگزین" میں پڑھ چکا تھا کہ مشہور چینی راہنما ماؤزے تنگ فوت ہو چکا ہے اور چینی لوگ اور چینی حکام اس خبر کو دنیا سے چھپا رہے ہیں۔ اس مضمون میں اس ڈاکٹر کا انٹرویو بھی تھا جو ماؤ کے آخری سانس کے وقت اس کے سرہانے موجود تھا۔ چند ایسے لوگوں کی خفیہ سرگوشیاں بھی تھیں جو چین کی سرحدیں عبور کر کے آہوں اور کراہوں کی صورت میں "ٹائم سکوٹر" میں پہنچ گئی تھیں

ایسے عظیم انسان کی موت کا دُکھ مجھے دنیا کے ہر شخص سے زیادہ تھا کیونکہ میں شخصیتوں سے بہت مرعوب ہوتا ہوں اور جتنا کوئی بقدر بڑا ہوتا ہے اس کے سامنے میری گھگھی سی بندھ جاتی ہے۔ بوڑھا ہو گیا لیکن میرے اندر سے آٹو گراف لینے والے بچّے کی عقیدت نہیں نکلی۔ کوئی بڑا آدمی فوت ہو جائے تو میرے اندر کئی سال تک چالیسواں ہوتا رہتا ہے۔ چھوٹے آدمیوں کے مرنے کا مجھے احساس بھی نہیں ہوتا، کیونکہ وہ اپنی زندگی میں بھی مرے مرے سے نظر آیا کرتے ہیں۔

میں ماؤ کی موت کا دکھ اپنے سینے میں چھپا کر پیکنگ کے کوچہ و بازار میں گھومتا رہا۔ بے یار و مددگار، بغیر کسی ڈھارس بندھانے والے کے، بغیر انٹرپریٹر کے۔ کبھی کبھی خلیل بخاری کے ساتھ جو وہاں چینی زبان و ادب کا طالب علم تھا اور جو کبھی شام کو مجھے گھمانے کے لئے ہوٹل میں آجاتا تھا۔

کانفرنس ختم ہوئی اور ہمارا قافلہ چین یاترا کے لئے شہر بہ شہر گھومنے لگا۔ ان شہروں میں کیا کیا دیکھا اور کن کن لوگوں سے ملے، یہ ایک اور قصّہ ہے اور اسے پھر کبھی سناؤں گا۔ فی الحال اوہان کی بات سُن لیجئے۔ اوہان چین کا ایک بہت بڑا شہر ہے اور دریائے ینگ سی کیانگ کے کنارے واقع ہے۔ دو پہاڑیوں کے درمیان خوبصورت، وسیع، صاف ستھرا اور پُرباش قسم کا شہر۔ جس وقت ہم وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ گرمی کس کو کہتے ہیں اور اس کے اصل معنی کیا ہیں۔ اوہان کا موسم گرم تھا یعنی اگر آپ جیکب آباد کی حدت اور تمازت میں ملتان کی گرمی، بار کی لُو اور چھانگا مانگا کا حبس ملائیں تو ایک اوہان بنتا ہے۔ اس اوہان میں ہم کوئی تین دن تک مقیم رہے حالانکہ ہم میں سے کوئی بھی ایک گھنٹے سے زیادہ رہنے پر مائل نہ تھا اور العطش العطش پکار رہا تھا۔ ہمارے میزبان اور انٹرپریٹر اور ہمارے خصوصی ناز بردار اور خانہ زاد ہمارے آگے پیچھے بھاگے پھرتے تھے اور ہم کو ہر گھڑی pamper کیا کرتے تھے اور اوہان ہمیں ہر گھڑی دھکے دے رہا تھا۔ میں نے اپنے انٹرپریٹر سے کہا،

کو میں نے اپنے لطیفوں کا چسکا لگا دیا تھا، خفیہ طریق سے پوچھا کہ ہماری مومیائی نکال کر آپ کیا لیں گے۔ ہم تو پہلے ہی under fed قسم کے لوگ ہیں، تو وہ ہنسا اور ہنس کر کہنے لگا "شاید تم کو کوئی اچھی خبر ملے اور شاید یہاں کوئی ایسا واقعہ گزرے جو تمہیں ساری زندگی یاد رہے۔" میں نے بند پنکھے کی طرف اشارہ کر کے کہا "گزر رہا ہے یار جانی اس سے بڑا سانحہ اور کہاں گزرے گا۔" وہ لجاجت اور شرافت سے مسکرایا اور پھر سر ہلانے لگا۔

شام کو ہوٹل کے سامنے بسیں آکر کھڑی ہو گئیں کہ جلد تیار ہو جائیے، ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ ہم جلدی جلدی تیار ہوئے، بسوں میں بیٹھے اور قافلہ خراماں خراماں بڑے بازار سے گزرنے لگا۔ بڑے بازار میں منیاری کی، کپڑے کی اور اشیائے خورد و نوش کی دکانیں اور قہوہ خانے تھے۔ ان کے خوبصورت اور رنگدار بورڈوں پر چینی کے دلآویز حروف میں خطاطی کی گئی تھی۔ دکانیں صاف ستھری تھیں اور غیر ضروری سامان سے پاک تھیں۔ لوگ دھوتے دھاتے بے حد سادہ لباس پہنے دکانوں کے باہر اور سڑک کے دونوں کناروں پر جمع تھے اور تالیاں بجا بجا کر ہمارا استقبال کر رہے تھے۔ اچانک ان رنگدار اور خوبصورت بورڈوں کے درمیان مجھے ایک بہت ہی سادہ اور سیدھا سا بورڈ نظر آیا، جیسے ایک تختے کو کھریا مٹی سے پوت کر تیار کیا گیا ہو۔ اس بورڈ پر کسی پرانی مسواک کو سُرخ رنگ میں ڈبو کر جھاڑے جھٹکے بغیر برش کے طور پر استعمال کیا گیا تھا اور اس سے لکھا تھا "طعام المسلمین"۔ طعام کا میم بہت لمبا تھا لیکن مسلمین کا نون بہت خوبصورت تھا۔ اس دائرہ بانٹ اعتبار سے بالکل درست تھا۔ نقطے باقاعدہ نہیں تھے، گول گول دائرے سے تھے۔ دکان کے اندر ایک ملا قسم کا چینی دیگچے میں کفگیر چلا رہا تھا۔ میں نے کھڑکی سے آدھا دھڑ اور دونوں بازو آگے نکال کر زور سے تالی بجائی لیکن ملا جی نے میری طرف یا ہمارے قافلے کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور مزے سے سری پائے پکاتے رہے۔

ہمارا قافلہ شہر سے کوئی پانچ سات میل باہر نکل آیا۔ ایک بڑے سے باغ کے قریب بسیں روک دی گئیں اور پھر انتظار ہونے لگا۔ دس منٹ، پندرہ منٹ، آدھ گھنٹہ، گھنٹہ ––– اور پورے ڈیڑھ گھنٹے بعد بسوں کا رُخ پھر شہر کی طرف موڑ دیا گیا اور ہم جس طرح لے جائے گئے تھے اسی طرح واپس ہوٹل پہنچا دیئے گئے۔ اس زبردستی کی سیر پر ہمارے افریقی ساتھی بہت جز بز ہوئے اور اپنے اپنے کمروں کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے اپنی اپنی زبان میں کچھ گرم گفتاری بھی کی لیکن ہمارے میزبانوں کی مسکراہٹ اور شرافت اور برداشت کے سامنے اُن کی دھواں دھاریاں پہلے تھمیں اور پھر خود ہی چھٹ گئیں۔

اگلے دن کوئی صبح نو بجے ہمیں پھر بسوں کے سامنے لائن حاضر کر دیا گیا، لیکن اس مرتبہ روانہ ہونے میں کوئی دیر نہ لگی۔ ہم پھر اسی روٹ پر رواں تھے اور اب کی بار بسوں کی رفتار کل کے مقابلے میں تیز تھی۔ اب بسیں باغ کے قریب نہیں رکیں بلکہ اُس کے اندر داخل ہو گئیں۔ باغ کیا تھا پورا جنگل تھا۔ میرا خیال ہے کہ ہم کوئی دو ڈھائی فرلانگ اندر اس طرح داخل ہوتے گئے۔ پھر ایک پرانی وضع کی نہایت خوبصورت اور بہت ہی وسیع عمارت نظر آئی۔ اس کے ارد گرد کے احاطے میں بسیں ایک قوس کی صورت میں رُک گئیں اور ہمارے میزبان نے بڑے تپاک کے ساتھ ایک ایک بس کا دروازہ کھولا اور ہمیں بڑی محبت کے ساتھ باہر آنے کا اشارہ کیا۔ افریقی اور ایشیائی ادیبوں کا یہ گروہ بسوں کے ہلال کے سامنے جمع ہو گیا۔ ہیڈ میزبان مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور کسی تمہید کے بغیر بولا: "خواتین و حضرات! اب آپ چیئرمین ماؤ سے ملاقات کریں گے"۔ اس نے شاید اس کے بعد بھی دو چار جملے بولے لیکن ہم نے "ماؤ زے تنگ زندہ باد" کے نعروں سے آسمان سر پہ اٹھا لیا اور سارا باغ ہماری للکاروں سے گونجنے لگا۔ ہمارے ساتھ ہمارے میزبان بھی شریک ہو گئے اور ہم تالیاں بجاتے ہوئے اس بڑی بلڈنگ کی

طرف بڑھنے لگے جہاں چیئرمین سے ہماری ملاقات ہونے والی تھی ۔

اس بلڈنگ کے وسیع ہال میں سامنے کی دیوار کے پاس فرش پر لکڑی کی پیڑھیوں کا ایک سٹیج بنا تھا۔ ہر سیڑھی پر چاک کے ساتھ خانے بنے ہوئے تھے جن کے اندر نمائندوں کے ملکوں کے نام لکھے تھے دوسری یا تیسری سیڑھی پر ایک جگہ "پاکستان" لکھا تھا۔ میں چونکہ بچپن میں ٹیاٹاپو بڑی مہارت اور شوق سے کھیلا کرتا تھا اس لئے میں نے بڑی آسانی کے ساتھ جاکر اپنا خانہ ڈھونڈ لیا۔ میرے دوسرے ساتھی بار بار ایک دوسرے کو دھکے دیتے رہے اور بار بار ہر ایک سے بیرا اٹھوا اٹھوا کر اس کا خانہ دیکھتے رہے۔ ہمارے چینی میزبانوں کے لئے یہ بدنظمی حیرت کا موجب بنی ہوئی تھی ۔ وہ بڑی متانت کے ساتھ اپنے مہمانوں کو جھل کھلارتے دیکھ رہے تھے لیکن خاموش تھے ۔کوئی بیس منٹ تک لکڑی کے تختوں پر یہ جولاہا نانی جاری رہی اور پھر سکون ہو گیا۔ اس سکون کے پورے ایک منٹ بعد ہمارے میزبانوں نے جو ہال کی دیواروں سے لگے کھڑے تھے، زور زور سے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ ہم نے سامنے دروازے کی طرف نظر کی تو چیئرمین ماؤ، اُن کی بیگم اور چواین لائی اندر داخل ہو رہے تھے۔ وہ بھی اپنے مخصوص انداز میں تالیاں بجا رہے تھے۔ ماؤ کا قد لمبا، ڈگ بڑے بڑے اور انگلیٹ سیدھی اور بھری ہوئی تھی ۔ ہم لوگ بھی انہیں دیکھ کر زور زور سے تالیاں بجا رہے تھے ۔ میرا تعلق چونکہ ڈرامے سے ہے اس لئے میری تالی سب سے ڈھیلی تھی ۔میں حیران تھا اور دل ہی دل میں چینی میک اَپ مین کو داد دے رہا تھا جس نے ایک خاص قد وقامت کے آدمی کا ایسا میک اَپ کیا تھا جو بالکل ماؤزے تنگ نظر آ رہا تھا۔ ویسی ہی بند بند آنکھیں، وہی مسکراتا ہوا چہرہ اور وہی ٹھوڑی پر ایک موٹا سا مسّا۔ جوں جوں وہ آدمی قریب آ رہا تھا میری حیرت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ زیادہ قریب آنے پر وہ اور بھی ماؤزے تنگ ہو گیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تالیاں بجاتے رہے، نعرے لگاتے رہے، ہاتھ ہلاتے رہے ۔

اتنے میں فوٹو گرافر اپنا پرانا بڑا سا کیمرہ اور لکڑی کی گھوڑی لے کر آگے بڑھا۔ چیئرمین ماؤزے تنگ جیسا آدمی آکر ہمارے گروہ میں شامل ہوگیا۔ اسکے ارد گرد کھڑے وفود نے گرمجوشی کے ساتھ اُس سے ہاتھ ملایا۔ پھر فوٹو گرافر نے سر اوپر اٹھایا اور ماؤ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ سب نے اپنے اپنے کپڑے دیکھے۔ ذرا ذرا نیچے کو کھینچ کر سلوٹیں دور کیں اور باچھیں کھول کر فوٹو اتروانے کے لئے تیار ہو گئے۔

جب فوٹو کھینچ چکا تو ماؤ پھر ہمارے سامنے کھڑے ہو کر تالیاں بجانے لگا۔ اب ہم لوگ اپنی سیڑھی والی سٹیج سے نیچے اترے اور باری باری اس سے ہاتھ ملانے لگے۔ جب میری باری آئی تو میں نے اُس کے کلچے سے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور اسے آہستہ آہستہ ہلانے لگا۔ پھر میں نے قریبی انٹرپریٹر سے کہا "ان سے کہو کہ مجھے کوئی نصیحت کریں۔"

"نصیحت!" ماؤ نے حیران ہو کر پوچھا "کیسی نصیحت؟" اس کے چہرے پر ناخوشی کے آثار تھے۔

میں نے کہا "نصیحت جو ایک بڑا بزرگ، ایک تجربہ کار صاحبِ فراست اپنے چھوٹوں کو کیا کرتا ہے۔"

چیئرمین ماؤ ذرا مسکرایا، پھر اپنی آدھی بند آنکھوں کو اور بند کر لیا۔ ذرا توقف کیا جیسے آٹوگراف دینے والے لمحہ بھر کے لئے سوچا کرتے ہیں۔ پھر بڑی صاف اور کھنک دار آواز میں بولا: "اس سے کہو کہ اپنی بقا اور سالمیت کیلئے اپنے ملک کی سرحدیں غیر ملکی اور سامراجی ثقافت پر سر بمہر کر دیں — یہی میری نصیحت ہے۔"

مجھے اتنے بڑے عظیم اور عالمی راہنما کی یہ چھوٹی سی بات پسند نہ آئی۔ اتنے بڑے ماؤ نے اتنی ہلکی سی بات کی تھی کہ مجھے حوصلہ ہو گیا۔ میں نے کہا "سر ثقافتیں تو ہمیشہ تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ ان کو تازہ پانیوں کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے اور دوسری ثقافتوں

کے میل جول اور تال میل سے ہی توانا ہوتی ہیں۔"

ماؤ نے ہنس کر کہا "جہاں اندر کے پشتے مضبوط ہوتے ہیں وہاں تازہ پانیوں کی ایک آدھ دھار آجانے سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ لیکن جہاں پشتے کمزور ہوتے ہیں وہاں تازہ پانی طغیانی کی صورت میں آتے ہیں اور جگہ جگہ سے پشتہ بندیاں توڑ کر سارے علاقے کو دلدل بنا دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "سر! ہم تازہ تازہ آزاد ہوئے ہیں اور ابھی تک اپنی ثقافت کا تعین نہیں کر سکے۔"

اس نے ایک جہاں دیدہ کامریڈ کی طرح ہاتھ اوپر اُٹھا کر کہا "اپنی ثقافت کا تعین کرنے کے لئے اور اس کے خدوخال سے روشناس ہونے کے لئے کھیتوں میں جاؤ اور کسانوں اور دہقانوں سے پوچھو۔ وہ تمہیں سب کچھ بتا دیں گے۔"

مجھے ماؤ کی یہ بات پہلے سے بھی کمزور معلوم ہوئی۔ بیچارے کسان اور دہقان اَن پڑھ بابے اور جاہل پینڈو مجھے اس بارے میں کیا بتا سکیں گے۔ ان کو تو یہ بھی پتا نہیں کہ زمین گول ہے اور سورج کے گرد گھومتی ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ اگر یہ اصل ماؤ زے تنگ ہوتا تو ایسی بات نہ کرتا۔ آخر impostor ہے نا اسی لئے اونچی بات نہیں کر سکا۔ میرے اردگرد افریقہ کے جو مندوبین کھڑے تھے انہوں نے اس کی اس بات پر زور سے تالی بجائی اور میں مایوس ہو کر ہال کی آخری دیوار کے ساتھ جا لگا۔

جب ہم واپس لوٹے تو وہاں کے بازار میں گویا سارا شہر امڈ آیا تھا۔ لوگوں کو پتا چل گیا تھا کہ یہ لوگ ماؤ سے مل کر آرہے ہیں اور انہوں نے ہمارے پیر بابا کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اس کے جسم کو ہاتھ لگایا ہے۔ ہماری بسیں اس جم غفیر میں سے بڑی مشکل سے گزر رہی تھیں اور لوگ دیوانہ وار ماؤ زے تنگ، ماؤ زے تنگ کے نعرے لگا رہے تھے۔

اس واقعے کے چند مہینے بعد جب میرے مذہبی خیالات میں انقلاب آیا اور میں

نے اس افیون سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی تو میرے ماموں مجھے پکڑ کر اپنے ایک پیر کے پاس ماموں کانجن لے گئے۔ پیر صاحب نے میری باتیں سُن کر بڑی خوشی کا اظہار کیا اور کہا "ماشاء اللہ صاحبزادے میں منافقت نہیں ہے، کُفر ہے اور کُفر بڑی خوبصورت اور صحت مند چیز ہے۔ کچی ترکاری سے پھر بھی کچھ بن جاتا ہے۔ سڑی ہوئی سبزی سے کچھ نہیں بنتا۔ منافقت سڑی ہوئی سبزی ہوتی ہے۔" پھر انہوں نے کہا "برخوردار لوگ ایک دوسرے سے میل جول اپنے فائدے کے لئے رکھتے ہیں لیکن بزرگانِ دین مخلوق سے میل جول ان کے فائدے اور بھلائی کے لئے رکھتے ہیں۔" ان کی یہ بات سُن کر میرے سامنے اوہان کے بڑے پیر کا چہرہ گھومنے لگا۔

چلتے وقت انہوں نے کہا "مومن کی نشانی کیا ہے؟" میں نے کہا: "جو پابندِ صوم وصلوٰۃ ہو اور خدائے واحد کو مانے۔" ہنس کر کہنے لگے:

"ناں بھائی! مومن کا ٹریڈ مارک ہے: اپنی ذات کے لیے صبر اور مخلوق اللہ کے لیے بھلائی۔" پھر میرے سامنے لانگ مارچ کا نقشہ گھوم گیا۔ ماؤ کے دو چھوٹے بچے جو اس نے لانگ مارچ کے دوران ایک گاؤں میں چھوڑ دیئے تھے، کومنتانگ آرمی نے بھون دیئے۔ اس کا ایک چھوٹا بھائی جنگِ آزادی میں کام آیا۔ ماؤ کی بیوی گولی کا نشانہ بنی۔ لیکن وہ صبر کر کے اور ہر طرح کی ذاتی رنجش اور ذاتی غم کو بھلا کر خلقِ خدا کی بھلائی میں اسی طرح مصروف رہا جیسے اپنے اُن پیاروں کی زندگی میں مصروف تھا۔

چند روز پیشتر جب نیو چائنا نیوز ایجنسی نے چیئرمین ماؤ کی موت کی خبر سنائی تو مجھے آہستہ آہستہ یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ شخص واقعی اصلی چیئرمین ماؤزے تنگ تھا جس سے میں اوہان میں ملا تھا۔ اب مجھے ڈر لگنے لگا ہے کہ جس پینڈو سے میں ماموں کانجن میں ملا تھا کہیں اپنے گزر جانے کے بعد وہ بھی مجھے اصلی پیر نہ لگنے لگ جائے۔ اس نے مجھ سے چلتے وقت کہا

تھا " برخوردار جماعت عملاً ایک دوسرے کے کام آنے سے بنتی ہے ورنہ محض قول کے ایک ہونے سے یا مشترک ہونے سے حق ادا نہیں ہوتا۔" مجھے پچھلے دو سال سے اس پینڈو بابے کا یہ فقرہ ہانٹ کر رہا ہے۔ واقعی قول تو روس اور چین کا ایک ہی ہے۔ ایک کتاب، ایک مارکس، ایک قول۔ پھر یہ آپس میں بولتے کیوں نہیں۔ ملتے کیوں نہیں۔ ایک دوسرے کی شادی غمی میں شریک کیوں نہیں ہوتے؟ العلم حجاب الاکبر۔

اٹوٹ مان

جس طرح پرانے کوٹوں کے بیوپاریوں کے لیے نادر موقع آیا کرتا ہے. عین اسی طرح بنی سلود کی ایک عفت مآب لڑکی کو بھی بھاگ جانے کا ایک نادر موقع ملا اور وہ قبیلہ شرتید کے ایک نوجوان کے ساتھ اپنا آبائی ملک چھوڑ کر غائب ہو گئی۔

گھر کی رونق والا ہنگامہ سونے لگا تھا اور وہ اغوا ہوئی جارہی تھی. کہیں قریب ہی چند ادھیڑ عمر کی عورتیں گانے کی کوشش میں مصروف تھیں لیکن نیند ان پر اپنی کمندیں پھینک رہی تھی اور ان کے سہاگ گیت تھکے ہوئے مسافروں کی طرح اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے. بنی سلود کی عفت مآب لڑکی اپنے ٹھکانے پر بیٹھی شرتیدی جوان کا انتظار کر رہی تھی جو ساتھ کے پہاڑ پر آگ لینے گیا تھا اور جس نے وہاں باتیں کرنے میں بڑی دیر لگا دی تھی. ساری دنیا پر اندھیرا چھا گیا تھا یعنی سارے سمندر پر تاریکی پھیل گئی تھی لیکن ٹھکانے کی چوٹی پر مدھم سی روشنی سنبھالے لے رہی تھی. اور وہ لڑکی ابھی تک اپنی نئی انگوٹھیاں اور ان میں جڑے ہوئے الماس ریزے دیکھ سکتی تھی. اس کے ناخنوں کا کیوٹیکس قرمزی ہو رہا تھا اور وہ لڑکے کا انتظار کر رہی تھی۔

جس نے باتیں کرنے میں کافی دیر لگا دی تھی. یہ انتظار تو خیر اتنا صبر آزما نہیں تھا لیکن اسے اس خیال نے الجھن میں ڈال رکھا تھا کہ اگر وہ لڑکا چھڑی گھماتا ہوا یونہی واپس آگیا اور اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے پہلے جیسا ہی ہاتھ باہر نکالا تو یہ اندھیرا مجھے نگل جائے گا۔

دراصل وہ تاریکی سے ڈر رہی تھی اور چوٹی کی مدھم روشنی میں بڑے سکون کے ساتھ انتظار کیے جارہی تھی. اس کے ہم سفر جانور آرام سے اس کے گرد خواب خرگوش کے مزے لے

رہے تھے، صرف ایک میلی دم والی خرگوشنی جاگ رہی تھی جس کا ننھا سا وجود سفر کی صعوبتوں سے ٹیمپکس کا تکیہ بن گیا تھا۔ بنت السلود نے ایک ثانیے کے لیے اس کی طرف غور سے دیکھا، اور پھر نفرت سے منہ پھیر لیا۔ راستہ بھر وہ خرگوشنی اسی طرح لیٹی رہی تھی اور اس نے کشتی کی فضا کو مکدر کر رکھا تھا۔ بنت السلود کا جی چاہا کہ وہ اس کمینی بچی کو دم سے پکڑ کر سمندر میں پھینک دے اور مشک ناف آہو کو جگا کر اس کی جگہ سلا دے۔ لیکن جلد ہی اسے اپنی حنائی انگلیوں کا خیال آ گیا جنہیں ذرا سی بو لگ جانے سے اسے اُبکائی ہونے لگتی تھی۔ سفر سے چند دن پہلے جب وہ رات کو سوئٹزرلینڈ کے طرزِ حکومت پر ایک مضمون لکھ رہی تھی تو ایک کیڑا اس کے گریبان میں گھس گیا تھا اور جب اس نے جلدی سے قلم چھوڑ کر کیڑا چٹکی میں پکڑ کر باہر نکالا تھا تو اس کی انگلیوں سے ویسی بُو آنے لگی تھی جس دن ابن شرتید نے کسٹرڈ آئیل پی کر اس کا منہ چوما تھا۔ اس نے خرگوشنی کو دم سے پکڑ کر سمندر میں پھینکنے کا ارادہ ترک کر دیا اور روشنی کا انتظار کرنے لگی۔ ایسی روشنی جو اس کے پاؤں میں سوتے ہوئے جانوروں کو زیورات کی طرح جگمگا دے لیکن ایسی روشنی اتنی جلدی کب میسر آتی ہے اس کے لیے تو انتظار کرنا پڑتا ہے اور وہ انتظار کر رہی تھی۔ اس راہ پر بڑے تحمل سے آنکھیں لگائے بیٹھی تھی، جدھر سے اس لڑکے کو آنا تھا۔
اس نے وقت کاٹنے کے لیے اپنے ہلکے سبز رنگ کے لچکا لگے دوپٹے کو انگلی کے گرد لپیٹ کر پانی نچوڑنا چاہا لیکن اس میں اتنا پانی نہ تھا کہ نچڑ سکتا۔ بس دوپٹہ کابل آبدیدہ سا ہو کر رہ گیا۔

لوگ کہتے تھے، سلوتج کا پوتا دیوانہ ہو گیا ہے۔ لمک کا بیٹا باولا ہو گیا ہے اور وہ بھی انہی لوگوں میں سے تھی لیکن جب لمک کے بیٹے کی کشتی تیار ہو گئی اور ہر قسم کے جانوروں کا جوڑا جوڑا گم بھاگ اس میں پناہ لینے لگا تو وہ بھی رات کے اندھیرے میں چپکے سے اٹھی۔

اور اپنا اٹیچی کیس لے کر کشتی کے ایک کونے میں جا دبکی۔ پتہ نہیں کیوں اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ ابن شترتید وہاں ضرور آئے گا حالانکہ سلوتح کے پوتے کا وہ کوئی ایسا عقیدت مند نہ تھا پر بنت السلود کو اپنے دل پر مان تھا اس نے کئی مرتبہ اس کو آزمایا تھا اور ہر بار اس کا دل آزمائش میں پورا اُترا تھا۔ کبھی کبھار جب کوئی چڑیا چھت کی منڈیر پر آ کر بیٹھتی تو اس کا دل کہتا کہ چودہ گننے تک وہ چڑیا وہاں سے اُڑ جائے گی اور جونہی وہ جی ہی جی میں تیرہ کے بعد چودہ کہتی چڑیا پھُر سے اُڑ جاتی! اس رات بھی وہ اپنے اسی دل پر تکیہ کیے بیٹھی رہی۔ ایک بلی جو بڑی دیر سے اس کا منہ تک رہی تھی خاموش نہ رہ سکی بلے کی گلابی ناک پر اس نے اپنی کرخت مونچھیں پھیر کر پوچھا۔ "اس کا ساتھی کہاں ہے؟" نیند کے غلبے سے بلے کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں اس نے دیدے کھولے بغیر جھنجھلا کر جواب دیا۔ "تو سوئی رہ تجھے ان لوگوں سے کیا"، لیکن بلی کے تجسّس میں کمی واقع نہ ہوئی اور وہ بلے کو بدستور جگاتی رہی۔ بلے نے ایک دم تنگ آ کے دیدے کھول کر کہا۔

"سن! تو جنگل کی بلی ہے تیری سمجھ میں ان کی باتیں نہ آئیں گی۔ انسان اپنے جوڑے کی اتنی پروا نہیں کرتا جتنی ہم جانور لوگ کرتے ہیں۔"

بلی نے حیران ہو کر پوچھا۔ "اگر یہ ایک دوسرے کی پروا نہیں کرتے تو ان کے بچے کون پالتا ہے؟"

بلے نے کہا۔ "ان کے بچے نوکروں کے سر پر پلتے ہیں۔"

"نوکر!" بلی نے پوچھا۔ "تو کیا ان کے بچے ان کی مادہ نہیں پالتی۔"

اس پر بلے کو ہنسی آ گئی اور اس نے آہستہ سے کہا۔ "اگر ان کی مادہ بچے پالنے کے قابل ہو تو اس کے بچے ہی نہیں ہوتے۔"

"بچے ہی نہیں ہوتے!" بلی نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں! پھر ان کی مادہ نوکری کرتی ہے شادی نہیں۔"

"شادی!"

"ہاں جب ان کا جوڑا بنتا ہے تو دونوں ایک کاغذ پر دستخط کرتے ہیں۔"

"دستخط!"

"ہاں! اور جب ان میں ناچاقی ہو جاتی ہے تو دستخط کاٹ کر وہاں طلاق کی مہر لگا دیتے ہیں۔"

"طلاق!"

بلے نے جھلا کر کہا۔ "کوڑھ مغز آرام سے سوئی رہ تجھے یہ سب کچھ پوچھ کر کیا لینا ہے۔"

اور بلی آرام سے سو گئی۔

اچانک کشتی ایک طرف جھک گئی اور اس کی پتوار پانی میں ڈوب گئی۔ جانوروں میں ہلڑ مچ گیا۔ لنگور اپنی دُم میں اُٹھی ہوئی پتوار کے حلقوں سے لپیٹ کر باہر لٹک گئے۔ اونٹ زور زور سے بلبلانے لگے اور مور اونچے اونچے کوکنے لگے۔ ہُدہُد نے پکار کر کہا۔ "ارے کیوں جاتے ہو ہاتھی سوار ہو رہے ہیں۔" جب شور تھما تو گھبرائے ہوئے ہاتھی کے جوڑے نے اندر قدم رکھا، ہتھنی نے سونڈ سے ہاتھی کا پسینہ صاف کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہا: "آپ بیٹھ جائیں تھوڑی سی جگہ ہے۔" سانپوں کا جوڑا کھسک کر آگے ہو گیا۔ اور ہاتھی ہو ہو ہو کرتا بیٹھ سا گیا۔

ابن رشید نے کشتی میں قدم رکھتے ہوئے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "معاف کیجیے گا میں اکیلا ہی ہوں، میرے ساتھ میری مادہ نہیں ہے۔"

اس پر قریب بیٹھے ہوئے سارے جانور کھلکھلا کر ہنس پڑے اور اُلو نے اپنی مادہ سے کہا۔ "ذرا اس کی شکل دیکھو، کیسا بھولا بنتا ہے!" مستول سے لٹکے ہوئے شپر نے کہا۔ "ذرا اپنا یہ بی اے۔ او۔ سی کا سفری تھیلا کھولیے مجھے چیک کرنا ہے۔"

ابن شرتید نے تھیلا کھولا۔ شپرا مڑ کر اس کے اندر چلا گیا اور ایک پمفلٹ "شکار کے طریقے" باہر نکال کر بولا۔ "اس پمفلٹ کی برآمد منع ہے ہم اسے ساتھ نہیں لے جانے دیں گے۔"

اور ابن شرتید نے مسکرا کر اپنی یادداشت پر بھروسہ کرتے ہوئے وہ پمفلٹ دریا برد کر دیا۔

اندھیرے کمرے میں داخل ہوتے وقت اُلو اس کی رہبری کر رہا تھا۔ سارا عرشہ رنگ برنگے جانداروں سے پٹا پڑا تھا اور اُلو قدم قدم پر اسے روک رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُلو نے اسے بنت السلود کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیا۔ جب ابن شرتید نے اس سے پوچھا کہ بیٹھ جاؤں یا کھڑا رہوں تو بنت السلود اچھل کر اس کے گلے سے لپٹ گئی اس نے اگر ڈبر گلین کی طرح اس کے کانوں اس کی گردن اور اس کے کندھوں پر بوسوں کا بخیہ کرتے ہوئے سرگوشی کی: "مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گے، میرے ساتھ چلو گے اور میرے ساتھ رہو گے۔"

ابن شرتید نے حیران ہو کر پوچھا۔ "تم یہاں کب سے بیٹھی ہو اور تمہیں کس نے بتایا کہ میں شہر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

بنت السلود نے اسے زور سے بھینچتے ہوئے کہا۔ "کسی نے بھی نہیں، کسی نے نہیں بتایا۔ میرا دل کہہ رہا تھا۔ میرا اپنا دل اور مجھے اپنے دل پر بڑا مان ہے یہ کبھی غلط نہیں کہتا۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔"

ابن شرتید نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کیا خیال ہے بیٹھ نہ جائیں؟"

بنت السلود نے اپنے پاس بیٹھی ہوئی ایک مادہ کنگرو سے کہا۔ "اگر تکلیف نہ ہو تو آپ ذرا اور کھسک جائیں۔ یہ آ گئے ہیں اب میں ان کے ساتھ بیٹھوں گی۔" اور کنگرو اپنے بچے کو تھپکتے ہوئے ایک طرف ہو گئی۔

لنگر اٹھا دیا گیا۔ بادبان کھولے جانے لگے۔ اس نشیب میں جہاں کشتی پڑی تھی پانی کی سطح اونچی ہونے لگی اور کشتی زمین سے کئی ہاتھ اونچی ہو گئی اندر سارے جاندار خوف سے دبکے پڑے تھے اور باہر جگہ جگہ پھوٹتے ہوئے سوتے شور مچا رہے تھے۔ بوڑھا ملاح اپنے نافرمان بیٹے کا انتظار کر رہا تھا اور اسے زور زور سے آوازیں دیئے جا رہا تھا۔

روانگی میں ابھی تھوڑی دیر باقی تھی کہ لونگ دم بھاگتی ہوئی شیرنی جست لگا کر کشتی میں آ گری اور ملاح کے پاؤں میں لوٹ کر کہنے لگی "خدا کے لیے شیر کو بلوا بھیجیے۔ میں صبح سے اس کی منتیں کر کر کے عاجز آ گئی ہوں۔ بپھرا بیٹھا ہے اور چلنے پر رضامند نہیں ہوتا۔"

"کیوں" ملاح نے پوچھا۔ "کیا اسے طوفان کا ڈر نہیں ہے۔"

شیرنی نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "ڈر کیوں نہیں اسے اپنا انجام بخوبی معلوم ہے لیکن ضد پر اڑا بیٹھا ہے کہتا ہے میں شیر ہوں اور وقتِ رفتن آب میں سیدھا نیر لوں گا۔"

ملاح نے کہا تو اسے تیرنے دے تو کیوں بے چین ہوئی جاتی ہے۔"

شیرنی آہ بھر کر بولی۔ "جس کے ساتھ زندگی کی اتنی بہاریں لوٹیں۔ جس کے ساتھ رہ کر ایک جگ تک اکٹھے شکار کیا اب اسے اکیلا کیسے چھوڑ دوں۔"

ملاح نے کہا۔ "جب وہ تیرے کہے سے نہیں مانا تو میرے کہنے پر کیونکر عمل کرے گا۔ وہ نافرمان ہے اور نافرمان ڈوب کر ہی مرے تو اچھا ہے۔"

لیکن شیرنی رضامند نہ ہوئی۔ اس نے گڑگڑا کر کہا۔ "میری بات سنیے وہ کاغذ سے بہت ڈرتا ہے۔ ایک خالی سے کاغذ پر اُلٹی سیدھی لکیریں کھینچ کر کوئی یونہی سی مہر لگا دیجیے اور ہُدہُد کو یہ سمجھا کر اس کے پاس بھیج دیجیے کہ تیرے پاس وارنٹ

بلا ضمانت آیا ہے وہ ڈر جائے گا اور بھاگ جائے گا۔"

ملاح نے بنت السلود سے ایک کاغذ منگوایا جس پہ دھوبی کا حساب لکھا تھا۔ اس کے نیچے اپنے دستخط کیے اور شیرنی سے کہا۔ "اُلو سے جا کر اس پہ مہر لگوا لو۔"

شیرنی مہر لگوانے گئی تو اُلو نے کہا۔ "اب وقت نہیں رہا مہر کل لگے گی۔" شیرنی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اس نے منت خوشامد کی اس کے بیوی بچوں کا واسطہ دیا۔ اپنی بے چارگی اور کوتاہ آستینی کا رونا رویا لیکن اُلو کا دل نہ پسیجا۔ اُلو ایک چونی مانگ رہا تھا اور شیرنی کے پاس چونی نہ تھی اور جب کشتی وقتِ رفتن آب میں تیرنے لگی تو شیرنی اسی طرح جست بھر کر باہر کود گئی اور اُلو جلدی سے اڑ کر قریبی جنگل سے شیروں کے ایسے جوڑے کو جگا لایا جو دراصل شیر نہیں تھے۔ جنگلی بلے کے ایک مسخ شدہ فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن انھوں نے ابھی ابھی ایک یہودی تاجر کو پھاڑ کھایا تھا۔ جس کے کوٹ سے کتنی ساری چونیاں نکلی تھیں۔

سارے بادبان کھل گئے اپنے بیٹے کو بلاتے بلاتے بوڑھے ملاح کا حلق سوکھ گیا اور وہ ایک مستول کے ساتھ ٹیک لگا کر بے ہوش سا ہو گیا۔

جب مرغے نے اذان دی تو پو پھٹ رہی تھی۔ اور روئے زمین پہ پانی ہی پانی تھا اور موسلا دھار بارش کی وجہ سے بادبان بھاری ہو کر جگہ جگہ سے رسیاں تڑا کر مستولوں کے ساتھ لپٹ گئے تھے۔ صبح خیز پرند ذکرِ حق میں مصروف ہو گئے.... درندوں نے انگڑائیاں لے کر پرندوں کو گھورا اور پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے۔

ابن شرتید بنت السلود کی گود میں سر رکھے گہری نیند سو رہا تھا اور وہ اس کے بالوں میں بڑی دیر تک کنگھی کرتے کرتے نیند کی لپیٹ میں آ چکی تھی اور ایک تختے کے ساتھ نیم دراز تھی اس کی انگلیاں ابھی تک ابن شرتید کے بالوں میں تھیں اور اس کے چہرے پر مسرت کی لو دمک رہی تھی۔ شربتی رنگ کی کتیا جاگ اٹھی تھی اور انسانوں کی سی آواز

نکال کر انگڑائیاں لے رہی تھی۔ تختہ جہاز کو اپنے پنجے سے ایک دو مرتبہ کھدیڑ کر اس نے اپنی تھوتھنی سے کتے کو جگایا اور وہ بیدار ہو کر زبان باہر لٹکا کر ہانپنے لگا۔

شپر اپنے پر لپیٹ کر چھت کے ساتھ الٹا لٹک گیا۔ اُلو اور اس کی مادہ نے آنکھیں بند کر لیں اور جب اُفق کے پاس سورج نے اپنی صورت دکھائی تو اُلو گہری نیند سو گئے۔ شہباز اور اس کی مادہ اُڑ کر مستولوں کی چوٹیوں پر جا بیٹھے اور تیز نگاہوں سے دور تک پھیلے ہوئے پانی کو دیکھنے لگے۔ اندھیرا بڑی تیزی کے ساتھ رخصت ہو رہا تھا اور اس کی جگہ روشنی اپنے اڈے بنا رہی تھی۔ ابن شرتید نے نیم وا آنکھوں سے سارے کمرے کا جائزہ لیا۔ آخری دیوار کے پاس زرافہ اور اس کی مادہ کی گردنیں بجھی ہوئی مشعلوں کی طرح ایستادہ تھیں۔ ان کے پاؤں میں بیٹھا ہوا ایک بندر سب جانوروں کی طرف پیٹھ کیے سنگر مشین چلا رہا تھا۔ ابن شرتید نے سر پیچھے موڑ کر بنت السلود کو دیکھا اور اس کی ستواں ناک کو ہولے سے چھو کر اُسے جگا دیا۔ بنت السلود نے اپنا ہاتھ شرتیدی نوجوان کے بالوں سے نکال لیا اور نیندوں بھری مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔ ابن شرتید سنبھل کر بیٹھ گیا اور بنت السلود کا زانو ہلا کر کہنے لگا۔

"جان من ذرا اس بندر کو دیکھنا۔"

بنت السلود نے ادھر دیکھا اور پھر مسکرا کر اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔ ابن شرتید زور زور سے اس کا زانو ہلانے لگا تو بنت السلود نے اس کا ہاتھ آہستہ سے دھکیل کر اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہٹو! بے شرم کہیں کے۔"

اس پر ابن شرتید دیر تک ہنستا رہا اور بنت السلود چور نگاہوں سے بجھی ہوئی مشعلوں کے پاؤں دیکھتی رہی۔

مور اور پیرد بڑے فلسفیانہ انداز میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ پیرد کہہ رہا تھا۔ "میں تمہاری نفاست، تمہارے رکھ رکھاؤ اور تمہاری شخصیت

میں جمال وجلال کی مناسب آمیزش کا پوری طرح سے قائل ہوں لیکن جہاں تک میرے ناقص علم کا تعلق ہے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تم ذہنی مریض ہو اور اس کی وجہ خود پسندی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی جس نے تمہیں نرگسیت کے چکر میں ڈال رکھا ہے۔"

مور نے اپنی ذرا سی اٹھی ہوئی دُم کو مرجھا کر زمین پر ڈال دیا اور آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا۔ پیرو نے اپنا گلا صاف کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک ہلکی سی زفیل دے کر کہا۔"اور میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ تم مورنی کو بارآور کرنے کے لیے آنسو بہاتے ہو۔"

مور نے سر جھکا کر کہا۔"ہاں کچھ ایسے ہی ہے۔"

"چچ چچ" پیرو نے کہا۔"یہ کیسی غیر قدرتی بات ہے۔ کیسا مصنوعی فعل ہے۔ افسوس کہ یہ سب نرگسیت کا کیا دھرا ہے ورنہ تمہارے جیسا نرجانور یوں سکرٹ نہ پہنے پھرتا۔"

مور غمناک لہجے میں بولا۔"بس بزرگوں کے وقت سے یہی ریت چلی آئی ہے میں تو خود اس کے خلاف ہوں لیکن کیا کیا جائے بوڑھے مور نہیں مانتے اور کم بخت بزرگوں کے سامنے دال نہیں گلتی۔"

پیرو نے کہا۔"اب تو سب بوڑھے دفن ہو گئے اب تو تمہارا اپنا اختیار ہے۔"

مور نے خوش ہو کر کہا۔"یہیجے یہ بات تو میرے دھیان ہی میں نہ آئی تھی۔ اچھا کیا آپ نے یاد دلا دیا۔"

پیرو نے کہا۔"دیکھ لو کیسی کیسی پتے کی باتیں تمہیں بتلاتے ہیں ہائے!۔ پیدا کہاں ہیں ہم سے پراگندہ طبع لوگ —— بھلا پچیس دسمبر تک کی زندگی میں کوئی کسی کو کتنا کچھ سکھا دے!"

منار کو چھوٹی بطخ سے باتیں کر کے واپس آ رہی تھی کہ مرغے نے اپنا دایاں پر پنجے کے نیچے لے کر تیزی سے دھنکنا شروع کر دیا۔ بوڑھا دوربین ہٹا کر جلدی سے چیخا۔ "خبردار!"

سارے جانور دم بخود ہو کر اوپر دیکھنے لگے اور چڑا چڑیا کو اوپر لے اڑا جہاں چھت کے قریب ایک لکڑی سی لٹکی ہوئی تھی اور اس کے پیچھے بسیرا لینے کی کافی جگہ تھی۔ ابن شر تید نے اپنا سفری بیگ کھول کر کہا۔ "ادھو میں اپنا ٹوتھ برش تو ساتھ لانا بھول گیا!"

بنت السلود نے کہا۔ "یہ تو بہت بُری بات ہوئی اب آپ دانت کیسے صاف کریں گے؟"

"کوئی بات نہیں۔" ابن شر تید نے کہا۔ "میں تمہارا برش لے لوں گا۔"

"ناں۔" بنت السلود بڑے پیار سے بولی۔ "میرا برش گندا ہے۔"

ابن شر تید ہنس پڑا اور بنت السلود کی ٹھوڑی پکڑ کر کہنے لگا۔ "جانِ من یہ برش جو اس منہ میں چند سیکنڈ چلتا ہے یہ تو گندا ہو گیا اور . . . .

بنت السلود نے اپنی ٹھوڑی چھڑوا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ "چپ بابا مارے گا۔" اور بات ٹالنے کی غرض سے کہنے لگی۔ "اگر میں اس سمندر میں کود کر ڈوب جاؤں تو تم کیا کرو؟"

"کچھ بھی نہیں۔" ابن شر تید نے جواب دیا۔ "تمہارے سمندر میں ڈوب کر مرنے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"اور خشکی پر مرنے میں تھا؟" اس نے پوچھا۔

"بے شک۔ وہاں تو ہر لمحہ مجھے یہی کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کہیں تم مر نہ جاؤ۔"

"کھٹکا!" بنت السلود نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیوں آخر؟"

یہی کہ جب تمہاری لاش نہلائی جائے گی تو عورتیں یہ تو نہ سمجھیں گی کہ تم نے اپنے جسم پر نیلے نیلے پھول ٹانک رکھے ہیں۔"

بنت السلود شرما کر خاموش ہو گئی۔

شربتی رنگ کا کتا پنجے سے کان کھجا رہا تھا۔

کم کوش اور بے ذوق راہیوں کا یہ قافلہ کئی دنوں کے بعد کتنی ساری مصیبتیں برداشت کرتا اپنے ٹھکانے پہنچا اور ابن شرتید ٹھکانے پہ پہنچنے سے چند لمحے پہلے پتہ نہیں کہاں رہ گیا۔ بنت السلود ٹھکانے پہ بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ابن شرتید ساتھ کے پہاڑ سے روشنی لینے گیا ہے۔ ایسی روشنی جو ساری فضا کو چاند کی سرزمین بنا دے گی اور جس کی چمک میں زمین کا ہر ذرہ سانس لیتا ہوا دکھائی دینے لگے گا۔ اس کے اردگرد کی مدھم روشنی اسے مائے ڈالتی تھی۔ بنت السلود کا دل چاہ رہا تھا کہ ابن شرتید ابھی آ جائے اور اس کے یہاں قدم رکھتے ہی یہ جگہ دن کی طرح روشن اور سورج کی طرح چمکدار ہو جائے اور پھر اسے کسی بات کا ڈر نہ رہے اور اس کا دل کہہ رہا تھا کہ ابنِ شرتید آنے ہی والا ہے۔ چاندنی نکلنے ہی والی ہے اور ہاتھ سے شعاعیں پھوٹنے ہی والی ہیں اسے اپنے دل پر بڑا مان تھا اور اس کا مان کبھی نہ ٹوٹا تھا۔

سہاگ گانے والی ادھیڑ عمر کی عورتیں تھک کر سو چکی تھیں۔ شادیانے بجنے بند ہو گئے تھے۔ سارے ماحول پر خاموشی نے اپنے پیر پھیلا دیئے تھے صرف چند چمگادڑیں چھوٹی چھوٹی سرگوشیوں کی طرح اڑ کر کبھی کبھار ادھر آ جاتیں۔

دروازے پر آہٹ ہوئی اور پھر بنت السلود نے پٹ بھڑنے اور چٹخنی چڑھنے کی آواز سنی۔ خوشبو کے بھبکے، ابہت سے ہار، وسٹڈ کا نیا سوٹ، —— اور ایک اجنبی نوجوان! بنت السلود کا طویل خواب ٹوٹ گیا اس نے چیخنا چاہا لیکن آواز اس کے اٹوٹ مان کی طرح حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ پتلون کی جیب سے ایک ہاتھ نکلا اور ٹچ کر کے کمرے کی بتی بجھ گئی۔ پتہ نہیں ابنِ شرتید کہاں رہ گیا تھا!

قاتل

یہ دوسری بار تھی جب اس نے عدالت کا منہ دیکھا۔

محمد سلیم صحت مند اور شریف نوجوان تھا اور اس نے ایف اے کا امتحان ہائی سیکنڈ ڈویژن میں کیا تھا۔ وہ یقیناً بی۔اے بھی پاس کر لیتا اگر اس کی ماں بیوہ نہ ہوتی اور اُن کی دس کلّے زمین چوہنگ میں اور مکانوں کی ایک کٹڑی اچھرے میں نہ ہوتی۔

ایف۔اے کے بعد محمد سلیم نے کٹڑی کے بڑے دروازے میں بیٹھ کر اپنے کرایہ داروں کے ساتھ لُوڈو کھیلنا شروع کر دی۔ پھر محلے کے لڑکوں کے ساتھ دوپہر کو کوٹھڑی میں سونے لگا اور آہستہ آہستہ قبرستان کی مسجد میں جا کر نہانے اور عصر کی نماز پڑھنے لگا۔

اپنے ساتھ چوسر کھیلنے والے ہر شخص سے اس کی ایک ہی شرط ہوا کرتی کہ وہ اذان ہوتے ہی کھیل بند کر دے گا اور اس کے ساتھ مسجد میں جا کر چار رکعت فرض ادا کرے گا۔ بہت سے کھلاڑی بھاگ گئے تھے اور جو کچھ باقی رہ گئے تھے وہ کپڑے ناپاک ہونے کا بہانہ کر کے اسے غچّہ دے جایا کرتے تھے۔

محمد سلیم کی والدہ اپنے اکلوتے بچے کے لیے بیویاں تلاش کر رہی تھی۔ اب تک اس نے تین لڑکیاں چنی تھیں۔ ایک دولت مند تھی اور اس کے باپ کی خرادیں اور چکیاں چلتی تھیں۔ دوسری خوبصورت تھی اور اس سے کسی کی نظریں نہ ہٹتی تھیں تیسری صحت مند چوبر مٹیار تھی جو نسل کشی کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتی تھی۔ اسکی گردن چھوٹی تھی اور کندھے چوڑے کمر تنگ تھی اور سُرین بڑے اور ایک اچھا دزنی جوان

اس کے کوٹھے پہ پاؤں جما کر موکھے میں سے جنگلی کبوتروں کے بچے نکال سکتا تھا۔ لیکن اس سے محمد سلیم کی شادی نہ ہو سکی۔ وجہ اس کی صرف اس قدر تھی کہ محمد سلیم کی بیوہ ماں یکے بعد دیگرے ان تینوں سے اپنے بچے کی شادی کرنا چاہتی تھی اور اپنی کم اولادی کی کمی پوری کرنے کی خواہش مند تھی لیکن محمد سلیم اس بات پر رضامند نہیں ہوتا تھا اور لڑکیاں ایک ایک کر کے لگنے کے قریب تھیں۔

ان کا جدی رہائشی گھر گوکنڈی سے بالکل باہر تھا لیکن اس کے ماتھے کی دیوار کنڈی کی فصیل کے ساتھ ملحق تھی۔ ملحقہ دیوار کے ساتھ والی کوٹھڑی میں شاموں رہتی تھی جو عورتوں کے اندرونی امراض کا علاج کرتی تھی اور جس کے پاس ڈیوٹی سے فارغ ہو کر سپاہی لوگ سویا کرتے تھے۔ شاموں چونکہ ذات کی مذہبی تھی۔ اس لیے ہاتھ میں کڑا پہنتی تھی۔ سر پہ پنلا دوپٹہ لیتی تھی اور پیروں میں لال رنگ کی نری کی جوتی ڈال کے رکھتی تھی۔ چونکہ اکتیس سال کی تھی اس لیے آنکھوں میں سُرمہ اور ہونٹوں پر دنداسہ رکھتی تھی۔ تمبا کو اس پر حرام تھا۔ اس لیے وہ سُوٹے میں مردے کے بیج عقر قرحا کے سوکھے ڈنٹھل پودینے کے پتے اور اُبلی ہوئی چائے کی پھینکی ہوئی پتی شیرے میں کوٹ کر پیتی تھی اور سپاہیوں کو بھی دو گھونٹ مرواتی تھی۔

تین سال کے مسلسل تقاضے کے بعد جب شاموں نے محمد سلیم کو کرایے کا ایک پیسہ بھی نہ دیا تو سلیم نے تاؤ میں آ کر اس کی کوٹھڑی کے باہر اُسے چوٹی سے پکڑ لیا اور تین جھٹکے دے کر ایک دھتا اس زور کا اس کے کندھے پہ مارا کہ اس کی آنکھوں کا کبلا سنپولیوں کی طرح باہر نکل کر سفید ٹھنڈے اور خوشبودار گالوں پہ سو گیا۔

تیسرے دن محمد سلیم پہ استغاثہ زیر دفعہ ۵۰۴/۵۰۹ ہو گیا۔ وارنٹ جاری ہوا۔ تو بیوہ ماں پچھاڑ کر گر پڑی۔ ماموں مسلم ٹاؤن سے بھاگا آیا۔ جگری دوست ڈاکٹر عزیز نے ضمانت بھری۔ کالے کوٹ والے سلطان خان نے عدالت سے استغاثے کی نقل حاصل

کی تو محمد سلیم کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ مرقوم تھا۔

جناب عالی۔ مستغیثہ حسب ذیل عرض پرداز ہے۔

مکان ہر دو فریقین ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں بلکہ ایک دیوار مشترکہ رکھتے ہیں۔ بوجہ موسم گرما فریقین اپنے اپنے کوٹھوں پر رات کو سوتے ہیں۔ مستغیثہ باعزت بیوہ ہے۔ ملزم صبح اُٹھ کر اپنے کوٹھے پر مستغیثہ کی جانب منہ کر کے ہر روز بہ نیت توہین شرمسار کی مستغیثہ برہنہ ہو کر پیشاب کرتا ہے جس سے شرمساری کی توہین ہوتی ہے۔ چنانچہ کل صبح کو ملزم مذکورہ اسی طرح پیشاب کر رہا تھا۔ مستغیثہ کے منع کرنے پر فحش گالیاں بہ نیت توہین بالقصد دینی شروع کر دیں۔ لہٰذا استدعا ہے کہ ملزم کو سزائے قانونی دی جائے۔

فدویہ : شاموں بیوہ ہرپال مذہبی
ساکن کٹڑی گٹیاں پیر غازی روڈ
اچھرہ لاہور

جب محمد سلیم حاضر عدالت ہوا تو اس کا سارا وجود پتے کی طرح کانپ رہا تھا اور اُس کے حلق میں ٹھنڈی قلعی کا ٹانکا لگا ہوا تھا۔

لیکن اس سارے واقعے کا محمد سلیم کی کہانی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ محمد سلیم کی اصل کہانی نہیں۔ یہ تو اس واقعے کا مذکور ہے جب اس نے پہلی بار عدالت کا منہ دیکھا۔

محمد سلیم صحت مند اور شریف نوجوان تھا اور متوسط درجے کی امیر بیوہ کا پوت ہونے ہوئے بھی اس کے صرف ایک عورت سے تعلقات تھے اور ان تعلقات سے دونوں فریق خوش تھے۔ محمد سلیم کو تھوڑی سی آسودگی میسر آجاتی اور دوسرے فریق کو تھوڑی سی مالی فراغت۔ اس بات کا علم ارد گرد کے کچھ لوگوں کو تھا لیکن کسی نے

اس معاملے پر خصوصی توجہ نہ دی تھی۔

ایک رات کوئی ڈیڑھ بجے کا عمل ہوگا کہ اچانک محمد سلیم کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے بائیں بازو میں کچھ عجیب طرح کا درد ہو رہا تھا۔ اس نے رات کی خاموشی میں پوری توجہ بازو کی طرف دے کر ایک لمحے کے لیے رگ پٹھوں میں دھڑکن سی سُنی اور پھر یہ دھڑکن معدوم ہو گئی۔ پھر اچانک اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی تیز دھار آلہ اس کے بائی سپ کو کاٹتا ہوا کہنی کے راستے نکل گیا ہے۔ محمد سلیم نے خوفزدہ ہو کر چیخ ماری اور بانہہ اس کے سر تلے سے کھینچ لی۔ وہ لڑکی ہڑبڑا کر اُٹھی اور پھر محمد سلیم سے چمٹ گئی۔

سلیم نے کہا۔" میرے بازو میں درد ہو رہا ہے۔"

لڑکی نے بازو کی مٹھیاں بھرتے ہوئے کہا۔"میں مُنہ کالی جو اس پر سو رہی ہوں من بھر کی۔"

"نہیں۔" محمد سلیم نے کہا۔"تم آج کوئی نئی تھوڑی سوئی ہو۔ یہ تو کوئی اور شے لگتی ہے کوئی خطرناک سی شے۔"

خطرناک شے کا نام سن کر لڑکی زور سے ہنسی اور اس کے خاوند نے برآمدے سے آواز دے کر کہا۔" مجھے بُلایا ہے جی۔"

"نہیں" لڑکی نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا۔" تو سویا رہ۔"

جب وہ سو گیا تو سلیم نے تھوڑی دیر بعد کہا۔" اگر میرا ہاتھ بیکار ہو گیا تو میں کیا کروں گا؟"

لڑکی پھر ہنسی اور کہنے لگی۔" دیکھا تیرے دماغ سے گرمی نہیں نکلی ناں اس لیے تجھے بُرے بُرے خیال آتے ہیں۔" پھر اس نے جھک کر سلیم کے بازو میں پولے پولے دانت گڑو دیئے اور سلیم اس کا سر تھپتھپانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد محمد سلیم کے دماغ کی گرمی نکل گئی اور رات ذرا سی اور خنک ہوئی

تو لڑکی نے پوچھا۔" بتاؤ اب بھی درد ہو رہا ہے۔"

"اُوں ہوں۔" سلیم نے سر ہلا کر کہا۔

"پھر؟"

"پھر کیا؟" سلیم نے کہا۔" اس میں تمہارا کیا کمال ہے درد کو ختم ہونا تھا ہو گیا۔"

"واہ جی! ہمارا کوئی کمال ہی نہیں۔" لڑکی چمکی اور پھر جیسے رُوٹھ کر خاموش ہو گئی۔

صبح جب وہ تینوں چائے پینے لگے تو لڑکی نے کہا۔" اشرف پتہ ہے رات سلیم کے بازو میں کتنا درد اُٹھا۔"

اشرف نے توس کھاتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"وہ تو میں نے کوئی گھنٹہ بھر اس کی مالش کی ورنہ یہ تو کسی اور ہی وہم میں ڈوب رہے تھے۔"

اشرف ہنسا اور محبت بھری نظروں سے سلیم کو دیکھ کر بولا۔" بازوؤں میں تو درد اُٹھتا ہی رہتا ہے۔ اس میں وہم بے وہم کی کیا بات تھی۔"

سلیم نے کہا۔" کچھ نہیں بس یونہی خوف سا طاری ہو گیا تھا۔"

"اور اب۔" لڑکی نے پوچھا۔" اب تو کوئی خوف نہیں کسی قسم کا۔"

"اب تو مجھے یاد بھی نہیں کہ میرے بازو میں درد اُٹھا بھی تھا یا نہیں۔"

وہ چائے پیتے رہے، صحن میں گھومتے رہے اور ایک ایک کر کے کپڑے بدلتے رہے۔ لڑکی نے اشرف کے جوتے پالش کیے سلیم نے اپنے چپلوں پر برش پھیرا۔ لڑکی نے اپنے پاؤں کے ناخن کیوٹکس سے رنگے۔

پھر اشرف دفتر چلا گیا اور سلیم اپنے گھر روانہ ہو گیا، اور لڑکی پلاسٹک کا تھیلا لے کر سبزی، پھل، چائے اور گوشت خریدنے کے لیے ٹولنٹن مارکیٹ روانہ ہو گئی۔

لیکن اس بات کا بھی محمد سلیم کی کہانی سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر ہے تو صرف اسی قدر کہ

اس کے بازو میں پہلی مرتبہ درد اُٹھا تھا۔

ایک شام محمد سلیم قبرستان کی چھوٹی مسجد میں عصر کی نماز پڑھ رہا تھا کہ پہلے سجدے سے اٹھتے ہوئے اُسے ذرا سی تکلیف محسوس ہوئی اور دوسرے سجدے پر وہ لاکھ کوشش کے باوجود اُٹھ نہ سکا۔ بائیں پھیپھڑے میں کچھ عجب طرح کی ٹیسیں اُٹھی اور وہ اوندھے منہ صف پر لیٹ گیا۔

جب دل کی دھڑکن ذرا نارمل ہوئی اور ماتھے پر زور کا ٹھنڈا پسینہ آیا تو سلیم نے آخری مرتبہ اُٹھنے کی کوشش کی، یہ کوشش کامیاب رہی اور وہ آہستہ آہستہ چل کر سقاوے کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے جسم کو ٹٹولا۔ سب ٹھیک تھا۔ اس نے دو مرتبہ اپنی انگلیوں کو گنا اور چپل پہن کر مسجد سے باہر نکل گیا۔

اس کے جگری دوست ڈاکٹر عزیز نے کچھ گولیاں وٹامن کی ایک بوتل دودھیا تیل کی اور بلا ناغہ سات ٹیکے دیئے۔ ان سے کچھ افاقہ ضرور ہوا لیکن نہ اس قدر کہ بیماری کا خوف اس کے دل سے دور ہو جاتا۔

محمد سلیم کو ہسپتال میں داخل ہوئے پورے پندرہ دن ہو چکے تھے اور اس کا ہر طرح کا ٹیسٹ ہو رہا تھا لیکن بازو میں درد کے اسباب نہ ملتے تھے۔ ایک شام جب تکلیف میں بے حد اضافہ ہو گیا اور ہاؤس سرجن نے درد روکنے کو pathedene کا ٹیکہ دیا تو سلیم نومولود بچے کی طرح سفید تکیے پر سر رکھ کر گھوک سو گیا۔ ہاؤس سرجن بڑی دیر تک اس کی پائینتی پر بیٹھا اس کے تنفس کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کی چھاتی چھاج کی طرح اوپر اٹھتی تھی اور پھر اسی طرح نیچے بیٹھتی تھی۔ کوئی تین ساڑھے تین انچ کا پھیلاؤ ہو گا۔ ہاؤس سرجن کو اس صحت مند نوجوان پر بہت ہی ترس آیا۔ وہ بڑی دیر تک اس کے چہرے کے خدوخال اور اس کی شکل و شباہت کو بغور دیکھتا رہا۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ سلیم کے سرہانے گیا۔ اس کے بازو کو چھو کر اپنے آپ سے کہنے لگا یہیں ہے

یقیناً اسی جگہ پر ہے۔

دوسرے دن ڈاکٹر شفیع نے ڈاکٹر عزیز کو ہسپتال بلایا اور اپنے پیارے شاگرد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا "عزیز یہ تمہارا دوست ہے۔"

عزیز کا چہرہ خوف سے بے رنگ ہو گیا اور اس کی آواز حلق کے اندر ہی رہ گئی۔

"لیکن خیر" ڈاکٹر شفیع نے کہا۔ "اس سے کیا ہوتا ہے اگر یہ تمہارا دوست نہ بھی ہوتا تو بھی میری تشخیص یہی ہوتی۔"

عزیز نے کہا "سر ڈُو یُو سسپیکٹ . . . ."

" maliggnant growth " ڈاکٹر شفیع نے ہولے سے کہا اور مسکرانے لگا۔

اس کی مسکراہٹ میں دُکھ اور حقیقت کی تلخی جڑواں بچوں کی طرح کلکاریاں مار رہے تھے۔

ڈاکٹر عزیز نے کہا۔ "تو پھر سر . . . میرا مطلب ہے . . . . اب کچھ نہیں ہو سکتا . . . . لیکن یہ اس کو ہوا کیسے ؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" ڈاکٹر شفیع نے کہا۔ "بس ہو گیا اور جو ہو گیا سو ہو گیا اب کوئی کر بھی کیا سکتا ہے کیوں عزیز۔ ایں ہم اندر عاشقی۔"

"جی۔" ڈاکٹر عزیز نے سر جھکا کر کہا۔ "ہم کیا کریں جی کیا یہ زندہ نہیں رہ سکتا ؟"

"اوہ۔" ڈاکٹر شفیع گھبرا کر بولے۔ "اوہ . . . . عزیز تمہاری ڈسپنسری پہ کتنے مریض آتے ہیں ہر روز ؟"

ڈاکٹر عزیز نے کہا۔ "یہ اپنی ماں کا اکلوتا لڑکا ہے اور پھر یہ میرا اکلوتا دوست ہے اور ڈاکٹر صاحب . . . . ممکن ہے آپ کی تشخیص غلط ہو۔"

"خدا کرے . . . . خدا کرے . . . . خدا کرے !" ڈاکٹر شفیع نے یوں کہا جیسے کسی نے عجائب گھر میں ٹہلتے ہوئے کانسی کے گھڑیال پہ ہاتھ مارا ہو۔

"اب یہ کیسا ہے ؟" ڈاکٹر عزیز نے پوچھا۔

"کچھ نہیں مارفیے پر ہے patheden کا ٹیکہ دے کر سلا دیتے ہیں۔" ڈاکٹر غنیغ نے کہا اور جب ٹیکے کا اثر کم ہوتا ہے تو۔۔۔۔"

اتنے میں ایک چیخ بلند ہوئی اور کچھ گلاس فرش پر گرے اور بستر کے سپرنگ تڑپے۔ ٹیکے کا اثر کم ہو گیا تھا اور محمد سلیم تڑپ رہا تھا۔۔۔

جب اس شریف نوجوان کو اس طرح تڑپتے ایک مہینہ اور دس دن گزر گئے تو اس نے اپنے مسلم ٹاؤن والے ماموں کو کسی طرح منا لیا۔ وہ اس کے لیے چالیس گولیاں خواب آور دوا کی پیس کر اور پڑیا میں باندھ کر ہسپتال لے گئے اور جب سلیم نے ان کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وہ پڑیا لی تو وہ دیر تک ان کے دونوں ہاتھ ایک عقیدت مند مرید کی طرح چومتا اور ان کی انگلیاں نومولود بدھیا کی طرح سے چوستا رہا اور جب اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو اس کے ماموں دھاروں روتے وارڈ سے باہر نکل گئے۔

اگلی صبح جب ربڑ کی نلکیاں ڈال کر اس کا معدہ دھویا گیا اور اسے طمانچے مار مار کر کافی پلائی گئی تو اس نے آنکھیں کھول کر عزیز کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تم بھی عزیز!" اور ڈاکٹر عزیز جو واقعی اچھا خاصا ڈاکٹر تھا رو پڑا۔

ڈاکٹروں کے بورڈ نے اس کے بستر کے گرد گھیرا ڈال کر یکے بعد دیگرے یہی بات کہی کہ ہم جانتے ہیں تم تکلیف میں مبتلا ہو اور ایسی باتیں اس مرض کے مریضوں سے اکثر سرزد ہوتی ہیں لیکن ڈاکٹر جان دینے والے ہوتے ہیں لینے والے نہیں۔

محمد سلیم نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب کاش آپ نے اس بیماری کی تکلیف کو کتابوں میں نہ پڑھا ہوتا بلکہ ایک ثانیے کے لیے اس میں سے گزرے ہوتے تب آپ کو اندازہ ہوتا۔"

ڈاکٹر گھوش نے کہا۔ "بابا ہم ڈاکٹر ہے قاتل نہیں ہے آخری دم تک کوشش کریں گا۔"

"کیا آپ کے پاس اس کا کوئی علاج ہے؟" ڈاکٹر عزیز نے ہولے سے پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔" سلیم نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے مجھے کیا ہے اور جو کچھ مجھے ہے اس کا کوئی علاج ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔"

پھر اشرف اور اس کی بیوی وارڈ میں آ گئے اور ڈاکٹر لوگ اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر وہاں سے چل دیئے۔

نرس نے دور پرے آئینے میں سے اشرف کی بیوی کو دیکھا جس نے اپنے بیگ سے ایک شیشی کانپتے ہوئے ہاتھ سے نکالی اور اسے سلیم کی طرف بڑھایا۔ نرس نے چیل کی طرح وہیں سے ایک جھپٹا مارا اور جیسے سکیٹنگ کرتی ہوئی وہ شیشی لے کر دوسرے کونے میں چلی گئی۔

اس کے بعد اشرف اور اس کی بیوی کا وارڈ میں داخلہ ممنوع ہو گیا۔

سلیم کو دن میں کئی کئی ٹیکے مارفیا کے لگ جاتے تھے لیکن ۔ اس کی تکلیف میں کمی نہ ہوتی تھی نہ اسے نیند آتی تھی نہ سکون سے لیٹنا میسر تھا۔ زبان کٹ کٹ کر قیمہ ہو گئی تھی ۔ سر آہنی پٹیوں سے ٹکرا ٹکرا کر لہو لہان رہتا تھا۔ اس پر بھی اسے زندہ رکھنا ضروری تھا۔ کیونکہ ایک اچھے بھلے آدمی کی جان لی نہیں جا سکتی۔ لی نہیں جانی چاہیے بلکہ ایسا خیال بھی نہیں کرنا چاہیئے۔

ڈاکٹروں نے اُسے آپریشن ٹیبل پر لٹا کر اس کے ماموں سے کہا۔ "ڈاکٹر کا کام زندہ رکھنا ہے ڈاکٹر کی ہر حرکت اسی کوشش پر آ کر ختم ہوتی ہے کہ زندگی بچے زندگی ختم نہ ہو۔ ہم لوگوں کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں آگے اس کی مرضی ۔"

"اس کی مرضی کے بغیر تو پتہ بھی نہیں ہلتا۔" ماموں نے کہا اور ڈاکٹر نے آپریشن تھیٹر کے دروازے بند کر لیے۔

کوئی دو بجے کے قریب تام چینی کی بالٹی میں محمد سلیم کا کٹا ہوا بازو اس کے ماموں اور اس کی ماں کے سامنے لایا گیا اور دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر دھاڑیں مارنے لگے۔

ڈاکٹر گھوش نے کہا: "اگر آپ یہ بازو ہمیں مطالعے اور معائنے کے لیے دے دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

"اور اگر آپ چاہیں۔" ڈاکٹر شفیع نے کہا۔ "تو آپ اسے لے جاکر دفن بھی کر سکتے ہیں۔ یہ آپ کی ملکیت ہے۔"

محمد سلیم کی ماں نے روتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے کہا: "تم لے لو۔ تم رکھو۔ ہمیں کیا لینا ہے اس بازو سے۔ ہمارا بازو تو بستر پر لیٹا ہے۔"

بازو کٹنے کے بعد سلیم کے چہرے پر سُرخی دوڑنے لگی۔ درد غائب ہو گیا اور پندرہ دن بعد جب اس نے حجام کو بلوا کر شیو کرائی تو نرس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

پورے پینتیس دن بعد جب وہ ہسپتال سے نکلا تو ڈاکٹروں نے اسے گھیر کر کہا۔ کیوں سلیم صاحب ڈاکٹر قاتل ہوتا ہے یا مسیحا؟ سلیم کا سر شرم سے جھک گیا۔ ڈاکٹروں نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی اور تھوڑی دیر کے لیے خالق اکبر کو دل ہی دل میں مسکرا کر یاد کیا۔

اسی رات اشرف کی بیوی نے سلیم سے کہا۔ "توبہ بابا تمہاری جپھی تو پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو گئی ہے۔"

سلیم نے کہا: "دیکھا پھر یوں ہوتے ہیں یاروں کے جٹ جپھے۔" لڑکی ہنسی اور اس کے کٹے ہوئے ٹنڈ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

لیکن محمد سلیم کی اصل کہانی یہ نہیں۔ ہاں اس کا ایک رشتہ ضرور اصل کہانی سے بندھا ہے۔

چھ ماہ بعد جب محمد سلیم نے ساری کمٹری بیچ کر مارفیے پر لگادی تو اس کی ماں نے اپنے اکلوتے بیٹے کے خلاف ایک اشتہار اخبار میں نکلوایا کہ محمد سلیم ولد عبدالکریم کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور اسے متوفی عبدالکریم کی جائیداد پر کسی قسم کا حق نہیں اس

ہے جو کوئی محمد سلیم ولد عبدالکریم سے لین دین کرے گا وہ اپنے نفع نقصان کا خود ذمہ دار ہو گا۔

دو تین مہینے سلیم بڑی کوشش کر کے اشرف کی بیوی کے لیے نئے نئے گاہک بھی ڈھونڈ کر لایا لیکن انہوں نے اسے اس قدر پیسے نہ دیئے کہ وہ مارفیے کے ٹیکے خفیہ فروشوں سے خرید سکتا۔

ایک رات وہ چاقو لے کر اپنی بیوہ ماں کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ لیکن وہ بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھی۔ ایسا شور مچایا کہ سارے محلے کے لوگ جھٹا پٹ جمع ہو گئے۔ بیوہ ماں نے کہا اسے حوالات میں ڈلوا دو تب جا کر مجھے چین کی نیند آئے گی۔ محلے کے لوگ تھانے لے گئے۔ حوالدار نے تین چار تھپیڑا اور سپاہیوں نے دو دو جوتے مار کر چھوڑ دیا اور وہ گھومتا گھماتا بیڈن روڈ پہنچ کر بجلی کی دوکانوں کے تھڑوں پر لیٹ رہا یہی اس کا اڈہ تھا اور یہیں دارو بیچنے والے لوگ ملتے تھے۔ ایک مخیر خفیہ فروش نے تین ٹیکے مفت لگانے کی منت مانی تھی۔ اس کا بڑا لڑکا ٹائیفائڈ سے اُٹھا تھا اور اب خطرے سے باہر تھا۔ پھٹے پر اس کو لیٹے ہوئے دیکھ کر اس نے پوچھا "میاں طلبی ہے؟"

"طلبی حضور طلبی۔" محمد سلیم گڑگڑا کر بولا۔

"نکال ران۔" مخیر آدمی نے کہا۔

محمد سلیم نے ران آگے کر دی اور اس نے لٹھے کے پائجامے پر سے جس پر پیشاب لہو، دھات اور کیچڑ کے داغ لگے تھے، سوئی اندر گھسیڑ دی اور محمد سلیم نے اس کے دونوں ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگا لیے۔

بس کچھ ایسا ہی موسم تھا۔ سردیاں آہستہ آہستہ آ رہی تھیں اور گرمیاں جا چکی تھیں۔ کچھ لوگ اندر سونے لگے تھے اور کچھ ابھی باہر سوتے تھے۔ محمد سلیم لوٹ سے تڑپ رہا تھا۔ اسے ٹیکہ لگے پورے چار روز ہو چکے تھے اور آج پانچواں دن جا رہا تھا۔ مال میں کمی کی وجہ سے

خفیہ فروشوں نے ٹیکہ کے دام بہت چڑھا دیئے تھے۔ محمد سلیم اپنے ٹُنڈ سے ڈاڑھی کھجاتا ملکسن روڈ کے چکر کاٹ رہا تھا کہ آہستہ آہستہ دو کانوں کی بتیاں گل ہونے لگیں۔

بوڑھا پارسی کرسی سے ٹیک لگائے میز کی طرف پُشت کیے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے کیلنڈر پر بیٹھی جاپانی لڑکی مسکرا رہی تھی اور وہ ہوا میں انگلی لہرا لہرا کر تاریخوں کو ٹٹول رہا تھا۔

محمد سلیم چیتے کی سی پھرتی سے اندر داخل ہوا اور اپنے ایک ہاتھ سے کمانی دار کا ایسا کھچہ اس کے پیٹ میں مارا کہ بُڈھے نے ہائے تک نہ کی۔

پھر اس نے ڈھلکی ہوئی گردن والی گرم لاش کی جیب سے چابیاں نکالیں اور تجوری کھول کر سو سو کے دس بارہ نوٹ لے بھاگا۔ بیڈن روڈ پہنچ کر اس نے ایک ساتھ دو ٹیکے لیے اور آرام سے پھٹے پہ لیٹ گیا۔

یہ دوسری بار تھی جب اس نے عدالت کا منہ دیکھا۔

اور عدالت نے محمد سلیم ٹُنڈے کو پھانسی کی سزا دیدی۔

قصّہ نل دمینتی

شائستہ امریکی رسالے ٹائم کی طرح خوبصورت، چھوٹی اور خوشبو دار تھی اور جب بھی وہ کوئی نیا لباس پہنتی تھی اس کی خوبصورتی میں پچھلے ہفتے سے اور اضافہ ہو جاتا تھا۔ سہیل بہت پڑھا لکھا، خوش گفتار اور ذہین نوجوان تھا اور چونکہ اس کا ذخیرۂ الفاظ وسیع تھا اس لیے شائستہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی اور دونوں کی محبت واشنگ مشین میں گھومتی ہوئی قمیص اور شلوار کی طرح ایک دوسرے سے لپٹتی اور جدا ہوتی رہی۔ دونوں ایک دوسرے سے اتنا پیار کرنے لگے کہ ان کے پیار میں پرورش کی سی کیفیت پیدا ہو گئی اور وہ ایک دوسرے کے بچے بن گئے۔ ایسے بچے جو ماں باپ کے بہت لاڈلے ہوتے ہیں۔ خوش پوش خوش اطوار اور خوش خرام، جن کو ان کے ابّو اپنی گاڑی پر سکول چھوڑنے جاتے ہیں اور جن کے لیے ولایت سے قیمتی تحفے اور گیجٹ لاتے ہیں۔ جن کی سانسوں میں لالی پاپ کی خوشبو، جن کے لباس میں امّی کے اوڈی کلون کی باس اور جن کی جلد میں سکول بلیزر کا ٹمپریچر ہوتا ہے۔

شائستہ کا قد لمبا، چہرہ گول اور جلد شہابی تھی۔ اس کی کار کا رنگ گندمی، اپ ہولسٹری گلابی اور ڈرائیو لیفٹ ہینڈ تھی۔ سہیل کو جب بھی وہ اپنے ساتھ ڈرائیو پر لے جاتی۔ وہ ہمیشہ سٹیرنگ والی سائیڈ پر آ کھڑا ہوتا اور شائستہ کو ہر مرتبہ چابیاں چھنکا کر بتانا پڑتا کہ بھائی صاحب یہ سیٹ آپ کے خادم ڈرائیور کی ہے۔ آپ ادھر بیٹھیں گے۔" سہیل ہر مرتبہ یہی کہتا: "مجھے اپنی فوکسی کا خیال رہتا ہے۔"

" اپنی فوکسی کا اتنا خیال نہ رکھا کرو سائیں جی ۔ ہم بھی آپ کے کچھ لگتے ہیں ۔"
سہیل مسکراتا اور اس کی مسکراہٹ میں یونیورسٹی ریسرچ سکالر کی علم دوستی کے تریڑے سے ہوتے ۔

پھر وہ لاہور کی سڑکوں پر ، لاہور کے باغوں میں ، تفریح گاہوں میں ، گولف کورسوں میں اور تاریخی کھنڈروں میں بلامقصد گھومتے رہتے اور اس بلامقصد سیر و تفریح کے دوران دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گذارنے اور ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ باتیں کرنے کا مقصد ہوتا ۔

سہیل کے پاس اتنا علم تھا کہ اگر وہ اپنے علم کو اٹھارہ بائیس آٹھ صفحات پر رقم کر کے ساتھ ساتھ جوڑتا جاتا تو اس کا علم لاہور سے اسلام آباد کی پہاڑی شکر پڑیاں تک پہنچ جاتا ۔ شائستہ کے پاس ایسی اچھی فرانسیسی خوشبوئیں تھیں کہ مغل پورے پولیس سٹیشن کا نزکام کا مارا سپاہی تین دن گزرنے کے بعد بھی بتا سکتا تھا کہ پہلے وہ شالامار گئے ، پھر اس کے سب سے نیچے کے تختے پر اتر ے چھوٹی اینٹوں کے چھتوں کے پاس کھڑے رہے اور پھر انجینئرنگ یونیورسٹی کے راستے واپس گلبرگ چلے گئے ۔ لیکن اتنا کچھ ہونے کے باوجود دونوں بڑے پیارے اور معصوم تھے ۔ اور ان کو پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ کچھ لوگ ان کے بارے میں باتیں بناتے ہیں اور اس ٹوہ میں رہتے ہیں کہ وہ محبت کے پانیوں میں کتنی دور تک اُتر چکے ہیں ۔

کونونٹ کی لڑکیاں ڈھولک بہت اچھی بجاتی ہیں ۔ چونکہ ان کو ہر ملک اور ہر دیس کے لوک گیتوں سے پیار ہوتا ہے ۔ اس لیے وہ پنجاب کے لوک گیت دیسی لڑکیوں سے بہتر گاتی ہیں ۔ شائستہ کے گھر ڈھولک بج رہی تھی اور وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ چھوٹی مارکیٹ میں کون کھانے گئی ہوئی تھی ۔ جب وہ لوٹ کر آئیں تو کچھ لڑکیوں نے کمر کے گرد دوپٹے باندھ کر لڈی ناچ شروع کر رکھا تھا ۔ شائستہ کے ابوؔ اور تایا بڑے صوفے پر بیٹھے اُن

لڑکیوں کا ناچ دیکھ رہے تھے اور ان کے فن کی تعریف کرتے ہوئے دل ہی دل میں ان کے بدلنوں سے چمٹے جاتے تھے۔ سب ان کی بچیاں تھیں۔ ان کی بچی کی سہیلیاں تھیں اس لیے ان کو اپنی بچی سے بھی بڑھ کر عزیز تھیں۔ شائستہ کی امی انہی لڑکیوں کے سائز کے کپڑے پہنے کمرے میں گھوم رہی تھیں اور بیٹھ نہ سکتی تھیں کہ قمیض کے پہلوؤں سے پھٹ جانے کا اندیشہ تھا۔

سہیلیوں نے شائستہ کو بھی ناچ میں شامل ہونے کے لیے کہا لیکن وہ مسکرا کر خاموش ہو گئی۔ یہ اس کی مہندی کی رات تھی اور باوجود اس کے کہ وہ ان سب سے زیادہ اچھا ناچ سکتی تھی۔ اس نے اپنی مسکراہٹ ہی کو کافی سمجھا اور پلنگ پر پڑے ہوئے اپنے کپڑے سمیٹ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ابا جان اور تایا جی دونوں کو لائینز کلب کے ڈنر پر جانا تھا لیکن ان میں سے کسی کا بھی دل وہاں سے اُٹھ کر جانے کو نہ چاہتا تھا۔ انہوں نے لائینز کلب ڈنر کے بجائے شیر کی بچیوں کے درمیان بیٹھنا پسند کیا اور اس وقت تک نہ اُٹھے جب تک شائستہ کی امی نے انہیں جھڑک کر وہاں سے نہ اٹھا دیا کہ ٹیل ٹوسٹرز کی غیر موجودگی میں ڈنر کیسے ہو سکے گا۔ دونوں دُم دبا کر اُٹھے اور اپنی اپنی کار میں بیٹھ کر ڈنر پر روانہ ہو گئے۔ ابا جان کا پہلے بھی خیال تھا کہ کمینی ذات کی عورت سے شادی کرانے کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا اور آج ان کی بیوی نے اس خیال کی صحت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی تھی۔

دونوں موٹروں کے چلے جانے کے بعد شائستہ کوٹھی سے نکلی اور ڈونگھی گراؤنڈ کے کونے پر کھڑی ہوئی فوکسی میں جا بیٹھی۔ سہیل نے اس کے خوشبودار گال پر ہولے سے ناک رگڑ کر موٹر سٹارٹ کی اور دونوں اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔

یو۔ بی۔ ایل کی بچت سکیم۔
فریش اپ وِد سیون اپ
کو آپ

راحت بیکری

مرکزی اردو بورڈ

فرہنگ خانۂ ایران

ای. مرک

اُچاناں پیار دا

ہورٹس. سائنس زون

SORRY ! WE ARE LAYING HERE A NEW GAS PIPE-LINE NORTHERN SUI GAS.

میاں حیات بخش نرسری

ESSO

سلطان ربڑ فیکٹری

فلائنگ کلب لاہور

گلاب دیوی ہسپتال

انگرو یوریا

پانچ پانچ اور دس دس مرلے کے پلاٹ. منظور شدہ سکیم

GAMMON PAK LTD

SCOP سٹیل

بچے کم خوشحال گھرانہ

شائستہ نے سامنے سے نظریں اٹھا کر چہرہ سہیل کی طرف پھرایا اور پوچھا۔ "ہم کہاں جا رہے ہیں۔"

• قصور۔"

"وہاں کون ہے؟"

"میرے دوست کی کوٹھی ہے۔"

"اور دوست۔"

"وہ دیپال پور رہتا ہے۔ کل صبح مولوی اور نکاح رجسٹرار کا انتظام کر کے آئیگا۔"

"اگر وہ کل نہ آیا تو۔"

"تو پرسوں آجائے گا۔"

"لیکن سہیل ہم نکاح کا خود بھی تو انتظام کر سکتے ہیں۔"

"کیوں نہیں قصور میں یہ سارا انتظام بڑی آسانی سے ہو سکتا ہے۔ میں اس شہر میں اس کوٹھی میں کئی کئی مہینے آکر رہا ہوں۔"

"اس کوٹھی میں اور کوئی نہیں رہتا۔"

"ایک چوکیدار ہے صرف۔"

شائستہ نے اپنا سر سہیل کے کندھے سے لگا دیا اور کہنے لگی۔ "میرا سوہنا شہر قصور کتنا خوبصورت ہے۔"

"کافی خوبصورت ہے لیکن تم سے زیادہ نہیں۔"

"اور تمہاری امی۔"

"کافی خوش شکل ہیں جیسے پرانے وقت کی عورتیں ہوا کرتی تھیں۔"

"سہیل" شائستہ نے اپنا ماتھا اس کے کندھے کے ساتھ زور سے دباتے ہوئے کہا۔ "تمہاری امی کتنی خوش نصیب ہیں کہ انہوں نے تمہیں جنم دیا۔ تم چھوٹے سے ہو گے سہیل۔ اپنی امی کا دودھ پیتے ہو گے۔ اس کے ساتھ سوتے ہو گے۔ وہ تمہارے کپڑے بدلتی ہوں گی۔ تمہیں نہلاتی ہوں گی۔ جب تمہارے دانت نکلے ہوں گے تو وہ رات رات بھر تمہیں گود میں اُٹھا کر لوری دیا کرتی ہوں گی۔ تم ان کے سینے سے لگ کر چُپ کر جاتے ہو گے اور سہیل سہیل۔۔"

پھر وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ سہیل نے چنگھاڑتی ہوئی بریکیں لگا کر فوکسی روکی اور شائستہ کو گھُٹ کے چھپی ڈال کے اس کے ماتھے پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ شائستہ نے سر پیچھے ہٹایا اور مسکرانے لگی۔ باہر کی بتیوں کی مدھم مدھم روشنی میں اس کے سفید سفید دانت اور نمایاں ہو گئے۔

"کیا بات ہے۔" سہیل نے اس کا گال تھپک کر کہا۔

"کچھ نہیں۔" شائستہ نے اس کے کندھے سے اپنی آنکھیں پونچھ کر کہا۔ "مجھے تمہاری امی یاد آنے لگی تھیں اور ایک دم میرا جی ان کے ہاتھ چومنے کو چاہنے لگا تھا اور ان کے ہاتھ یہاں نظر نہیں آتے تھے اور مجھے اپنی محرومی پر رونا آ گیا تھا۔

"اوہو" سہیل نے مسکرا کر کہا۔ "یہ محرومی کا لفظ تم نے کہاں سے سیکھا۔"

شائستہ نے شرما کر کہا۔ "ٹیلی ویژن کے پروگرام بصیرت میں ایک مولوی صاحب نے یہ لفظ استعمال کیا تھا جو مجھے بہت اچھا لگا اور میں نے اسے یہاں استعمال کر دیا۔ کیا غلط تھا۔"

"ہرگز نہیں۔" سہیل نے کہا۔ "بلکہ مجھے تو خوشی ہوئی کہ تم نے اپنے اظہار کیلئے نہایت مناسب لفظ استعمال کیا۔ کیا ہم آگے چلیں؟"

"ضرور۔" شائستہ نے ہولے سے کہا اور پھر اپنا سر اس کے کندھے سے لگا لیا۔

فوکسی چلی جا رہی تھی اور وہ سوچتی جا رہی تھی کہ جب عورت کو ایک مرد سے پیار ہو جاتا ہے تو اس کو اپنے محبوب کے ماں باپ بہن بھائی انگ ساک کیوں اتنے اچھے لگتے ہیں۔ اس کے نوکر اور اس کے چپڑاسی پر کیوں اتنا پیار آتا ہے جس کھوکھے سے وہ سگریٹ خریدتا ہے وہ کھوکھے والا کیوں اتنا عزیز ہو جاتا ہے۔ جس لائٹر سے وہ اپنا سگریٹ سلگاتا ہے اس میں جان سی کیوں پڑ جاتی ہے۔ جس کتاب کو وہ اتنے غور سے پڑھتا ہے اس کے ورق پھاڑ دینے کو کیوں جی چاہتا ہے اور جس رسالے کو وہ دیکھ کر ڈرائینگ روم میں

چھوڑ جاتا ہے اُسے سینے سے لگا لینے کو کیوں جی چاہتا ہے۔

اس کا جی چاہا کہ وہ یہ ساری باتیں سہیل سے کرے اور راستہ بھر کرتی جائے لیکن اسے اُردو ٹھیک سے نہیں آتی تھی اور اس سے مذکر و مؤنث کی اکثر غلطیاں ہو جاتی تھیں۔ اسے اچھی اُردو جاننے والوں پر بڑا غصہ آیا جو ذرا سی غلطی ہو جانے پر لوگوں کے درمیان communication بند کرا دیتے ہیں۔ اس نے دل ہی دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ وہ قصور پہنچتے ہی اُردو پڑھنا شروع کر دے گی اور املا لکھا کرے گی۔ اس کے ہجے واقعی بہت خراب تھے کیوں کہ جب بھی وہ ریڈیو سے فلمی گیت سن کر اپنی کاپی پر اتارا کرتی تھی۔ وہ عجیب و غریب رسم الخط میں عجیب و غریب املا کے حامل ہوتے تھے اور انہیں اس کے سوا اور کوئی نہ پڑھ سکتا تھا۔

اس وقت رات کے نو بجے تھے اور وہ قصور شہر سے باہر ایک الگ تھلگ کوٹھی میں ایک نہایت ہی صاف شفاف پلنگ پر بیٹھے تھے۔ شائستہ کے پاؤں میں چھوٹی ہیل والے گولڈن سٹریپ کے نازک سے سینڈل تھے اور وہ ان کے سمیت سفید بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سہیل کا سر اس کی گود میں تھا اور اس نے اپنی ٹھوڑی اس کے ماتھے پر رکھی ہوئی تھی۔

وہ ہولے ہولے کہہ رہا تھا: "عورت جب پہلے پہل مرد کی زندگی میں داخل ہوتی ہے تو مرد کا دل بالکل خالی ہوتا ہے۔ پرانی اینٹوں کے ویران گھر کی طرح ایک سوکھے ہوئے بے آب و گیاہ نخلستان کی طرح۔ پھر عورت ٹھنڈے پانی کے ایک چھینٹے کی طرح ادھر رُخ کرتی ہے، مرد کو ہمدردی کی، اپنا آپ سمجھانے کی، اظہار کی اور عورت سے بات کرنے کی بڑی خواہش ہوتی ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ اس کی ہنسی کی آواز سنے۔ اس کے بول سنے۔ اس کی نگاہوں سے ہم کنار ہو اس کی خوشبو کی سرحدوں پر لیٹا رہے۔ جب وہ اپنی لٹ اوپر اٹھانے کے لیے ہاتھ اٹھاتی ہے تو اس کے لباس میں ایک سرسراہٹ ہوتی

ہے جسے مرد کے مجروح کانوں کے سوا اور کوئی نہیں سن سکتا۔ جب اس کے شرمیلے سے ہاتھ کا دباؤ مرد کے کندھے پر پڑتا ہے تو اس کی سائیکی پسینے سے شرابور ہو جاتی ہے۔ عورت کے وجود کا احساس کس قدر تکلیف دہ۔ کیسا جان لیوا اور کس درجہ جانکاہ ہے کہ ہر لمحہ مرد احساس کے اس بیلنے میں گنّے کی طرح پلتا رہتا ہے اور اس کا وجود کسی احتجاج کے بغیر نچڑتا رہتا ہے۔

شائستہ کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپ کر کے سہیل کے چہرے پر گرا اور دونوں بڑی دیر تک اسی طرح گم سم بیٹھے رہے۔ پھر وہ آہستگی سے کہنے لگی: اپنی پسند اور اپنی مرضی بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ اس کے سامنے دنیا کی ہر نعمت اور ہر چیلنج ہیچ ہو جاتا ہے جس نوجوان سے میری شادی ہو رہی تھی وہ کتنا بڑا چیلنج تھا کتنی بڑی ٹمپ ٹیشن تھی۔ کیسا لالچ تھا۔"

"میں نے اس کے کارخانے کی بہت سی قمیصیں خریدی ہیں اور اب بھی میں اسی کی فیکٹری کی بنی ہوئی قمیص پہنے ہوئے ہوں۔" سہیل نے آرام سے کہا: "وہ اچھا نوجوان ہے اور اس کا مستقبل اس کے حال کے مقابلے میں بہت ہی برائٹ ہے۔"

"اسی قدر ناں؟" شائستہ نے مسکرا کر کہا۔ "کہ بائیس گھرانوں کے بعد تئیسواں گھرانہ اس کا ہو جائے۔"

"بالکل؟"

"میں اس کی کوئی پروا نہیں کرتی۔ مجھے اپنا سہیل ان تین کپڑوں میں قبول ہے۔"

"صرف تین کپڑے ہی نہیں۔" سہیل نے ہنس کر کہا: "ایک فوکسی اور تین مربعے بھی ہیں۔"

"اور اس کے ساتھ علم اور education کا خزانہ بھی۔" شائستہ نے فخریہ لہجے میں جواب دیا۔

"علم سے اور ایجوکیشن سے اور اظہار سے میں اب تھک چکا ہوں over-much

communication نے میرے اردگرد چیخ پکار کی ایک دنیا آباد کر دی ہے اور اس میں کسی کی کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ میں اب سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ تمہاری موجودگی میں۔ تمہاری رفاقت میں تمہاری معیت میں۔

"میں زندگی بھر تمہارے ساتھ رہوں گی اور اپنی محبت کے پھول تمہارے قدموں پر نچھاور کرتی رہوں گی۔"

"بہت زیادہ پالٹیکس اور بہت زیادہ سیکس انسان کو دُکھی بنا دیتا ہے۔" سہیل نے گلوگیر ہو کر کہا۔ "یہ جتنا بھی گلٹ (guilt) اس دنیا میں موجود ہے۔ سیکس اور پالٹیکس اور انفرمیشن کی وجہ سے ہے۔ ہر تیسرا آدمی السر کا شکار ہے اور ہر چوتھے آدمی کی شریان پھٹ رہی ہے اور ہر پڑھا لکھا آدمی ہارٹ سے مر رہا ہے۔ ہمیں ضرورت سے زیادہ انفرمیشن نے ردگی بنا دیا ہے۔"

"تمہیں بھی السر کی شکایت ہے۔" شائستہ نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

"ہے تو چھپی ہوئی ہے۔ نہیں ہے تو ہو جائے گی۔ میں گزشتہ دس سال سے ادبی میٹنگوں میں اپنے علم اور اپنی دانش کا اظہار کرنے کے لیے جگہ جگہ سے معلومات حاصل کرتا رہا ہوں۔ ان باتوں کو مختلف پڑیوں میں باندھ کر وہاں لے جاتا رہا ہوں جن پر نہ میرا ایمان ہوتا تھا اور نہ جن کے بارے میں کوئی بات میرے تجربے یا مشاہدے میں آئی ہوتی تھی ــــ میں نے اپنے اظہار میں اور اپنی communication میں بڑی over-indulgence کی ہے اور اب میں بالکل تھک گیا ہوں جیسے مہاراجہ پٹیالہ تھک گیا اور بجلی کی پیٹی باندھا کرتا۔

شائستہ نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔ "بجلی کی پیٹی کیا۔"

سہیل نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور سامنے دیوار پر نظریں گاڑ کر اپنے اندر سے غائب ہو گیا۔ وہ دونوں بڑی دیر تک اسی طرح خاموش رہے اور ان کے کمرے میں نہ برد کا بلب بھی خاموشی کے ساتھ روشن رہا۔ پھر سہیل نے ایک ٹھنڈی سانس بھری

اور شائستہ کے خوشبودار بازو پہ ناک رکھ کر بولا ۔" میں تمہاری محبت میں پہلے سے زیادہ شرابور ہو گیا ہوں اور مجھے تمہارے سوا اور کچھ نہیں سوجھتا. جب سے میرے ذہنی حالات خراب ہوئے ہیں اور میرے گھر کے معاشی حالات خراب ہوئے ہیں اور میرے ملک کے سیاسی حالات خراب ہوئے ہیں. میں تم سے اور زیادہ محبت کرنے لگا ہوں اور مجھے ہر چیز میں تم نظر آنے لگی ہو اور کل جب ہم دونوں کے معاشرتی حالات خراب ہوں گے تو ہم ایک دوسرے کے وجود میں ہمیشہ کے لیے گم ہو جائیں گے ۔"

"ضرور سہیل ضرور ۔" شائستہ اس کے ساتھ چمٹ گئی اور ان دونوں کی سانس رکنے لگی ۔

سہیل اپنے آپ سے کہہ رہا تھا ۔" جب میری اور تیری محبت کا افسانہ عام ہو گا تو مستقبل کے نقادوں کو اور مبصروں کو آج کے سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی حالات سمجھنے میں بڑی آسانی ہو گی ۔ ان کو زور لگا کر پرانے قصوں اور قدیم داستانوں سے اس وقت کی گھٹن کے آثار علامتوں میں تلاش کرنے کے بجائے سیدھے سبھاؤ معلوم ہو جائے گا کہ سہیل شائستہ پر جان کیوں دیتا تھا اور دونوں کے ایک دوسرے کو پسند کرنے کی وجہ کیا تھی ۔"

شائستہ حیرانی سے سہیل کا منہ تکنے لگی ۔ وہ کہہ رہا تھا ۔ میں over-indulgence سے اور بے پایاں اظہار سے اور لایعنی communication سے بالکل تنگ آ کر تم سے محبت کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں ۔ میری محبت آج پہلی مرتبہ میرے اصل وجود میں پلانٹ ہوئی ہے ۔ کل اس سے ایک نئی کونپل پھوٹے گی اور پھر یہ ایک سایہ دار درخت بن جائے گی اور میں اس کے نیچے بیٹھ کر دور دور پھیلے مرغزاروں کو دیکھا کروں گا ۔ پھر آنے والے مبصر یقین سے کہہ سکیں گے کہ سہیل کی محبت اس گھٹن دور سے ایک فرار تھی ۔ آج فرار کا لفظ بہت تکلیف دہ اور شرمناک دکھائی دیتا ہے ۔ لیکن کل مجھے یقین ہے جب انسانیت سیاست کے زنگ آلود پھاٹک توڑ کر باہر نکل جائے گی اور غزالوں کے ساتھ مل کر زندگی کے پون جھکورے میں شامل ہو جائے گی ۔

تو فرار کا لفظ گالی نہیں رہے گا۔

یہ باتیں اور ایسی بہت سی باتیں کرتے کرتے سہیل اسی طرح شائستہ کی گود میں سو گیا۔ اور جب وہ نیند کی وادی میں بہت آگے نکل گیا تو شائستہ نے آہستہ آہستہ اپنی گود کا حلقہ وا کیا سہیل کا سر سرہانے پر رکھا۔ اس کی پیشانی پر ایک ننھا سا بوسہ دیا اور اپنا پرس اٹھا کر گربہ پائی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

سڑک کے کنارے اس نے لاہور کی طرف جانے والی بس کو ہاتھ دے کر روکا اور اس میں بیٹھ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ جہاں اس کی سہیلیاں اس کی مہندی والی رات میں لڈی کے بعد بھنگڑا ناچ رہی تھیں۔

چور

ڈوبتے چاند کی مٹتی روشنی میں اس نے ٹٹی کے قدمچے پر کھڑے ہو کر عورت کی ناف کو آخری بار دیکھا۔ چربی کی موٹی تہہ نے گہری ناف کو نشیلی آنکھ کی طرح دنبالہ دار بنا رکھا تھا اور نسواری دامن نے اس آنکھ کے نیچے خط مستقیم کھینچ دیا تھا۔ دراصل وہ جس قدمچے پر کھڑا تھا وہاں سے دامن کی لکیر نیچے ہی نظر آتی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے، نسواری نقاب کے اوپر وہ آنکھ اسے اپنی طرف گھورتی ہوئی دکھائی دی، لیکن پھر اندھیرا چھا گیا اور اس کا چور دل شانت ہو گیا۔ وہ ٹٹی سے باہر نکلا اور دبے پاؤں چارپائی کے پاس سے ہوتا ہوا اندر کی طرف چل دیا۔ اس عظیم الشان عورت کے ساتھ اس کا پستہ قد خاوند بھی کنڈلی مارے سو رہا تھا۔ اس نے صرف بنیان اور جانگیہ پہن رکھا تھا اور اس کا ایک زانو اپنی بیوی کی رانوں پر تھا۔ پاس ہی ایک کھٹولی پر دو بچے سو رہے تھے۔

جب اس نے اندر کوٹھڑی میں پہنچ کر دروازہ بند کیا تو اس کا دل ذرا سا گھبرایا۔ لیکن پھر اس نے جی کڑا کر کے جیب سے چھوٹی ٹارچ نکالی اور روپیہ بھر روشنی کا ہالا فرش پر چھوڑ دیا۔ کمرے میں دھیمی سی روشنی ہوئی اور اس نے آگے بڑھ کر الماری کا پٹ کھولا۔

الماری دواؤں کی بوتلوں سے بھری ہوئی تھی اور اس کے بیچ کے خانے میں چھوٹے سے آئینے کے پاس کنگھی اور سرمے دانی پڑی تھی۔ اس نے اوپر اور نیچے کے خانوں میں روشنی کا روپیہ پھینکا لیکن وہاں سوائے دواؤں کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ لکڑی کی تلے دانی میں اون کی ایک گچھی، کانچ کی چوڑیوں کے چند جوڑے سر پہ لگانے کی پنیں اور بجلی کے ایک بل کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

تلے دانی سیاہ شیشم کی تھی اور اس کا بوجھ کافی تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی سیٹ الماری

کے تختے پر ٹھیک نہ بیٹھی تھی۔ اس نے تلے دانی کو احتیاط سے اٹھا کر کھولا اور نیچے اسے ململ کے استر والا رجسٹری کا لفافہ دکھائی دیا۔ لفافہ دوہرا تہہ کیا ہوا تھا اور اس کے پھٹے ہوئے کونوں سے ململ کے دھاگے باہر نکلے ہوئے تھے۔ اس نے بڑی صفائی سے وہ لفافہ اٹھایا اور ٹارچ دانتوں میں دبا کر اسے کھولا۔ اندر نئے نئے تہہ شدہ نوٹ ٹھنسے تھے۔ اس نے لفافے کو ناک کے قریب لا کر سونگھا تازہ نوٹوں سے بروزہ اور السی کے تیل کی خوشبو آ رہی تھی۔

اس نے لفافہ اپنی جیب میں رکھا، ایک ایک سلائی دونوں آنکھوں میں سرمے کی ڈالی اور ہولے ہولے قدم اٹھاتا باہر صحن میں نکل آیا۔ مرد نے اپنا زانو عورت کی رانوں سے پرے اٹھا لیا تھا اور دونوں ایک دوسرے سے دور ہو کر گہری نیند سو رہے تھے۔ چور نے آگے بڑھ کر آہستہ سے عورت کا دامن اپنی چٹکی میں پکڑا اور عورت کا برہنہ پیٹ ڈھانپ کر جدھر سے آیا تھا ادھر سے باہر نکل گیا۔

دور کہیں کوئی کتا بھونکا اور اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ اس کا دل تھوڑی سی مدت میں اتنی بڑی کامیابی پر بڑا مسرور تھا اور وہ دل ہی دل میں سیٹی بجاتا ہوا اپنی راہ چلا جا رہا تھا کہ اچانک اسے سرمئی اندھیرے میں سڑک کے آخری کنارے پر جن دکھائی دیا۔ اس کا سر آسمان میں تھا اور ٹانگیں زمین پر۔ چور کے قدم وہیں رک گئے۔ وہ جن آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کا خون رگوں میں خشک ہو رہا تھا۔ اپنے آپ کو اس بلا سے محفوظ رکھنے کے لیے اس نے سورۃ الناس کی تلاوت شروع کر دی اور جب اس نے الذی یوسوس کہا تو جن بتیسی نکال کر زور سے ہنسا۔ نارنجی رنگ کا ایک شعلہ لپکا اور دو مضبوط کھمبوں پر دھرے بڑے ٹرانسفارمر کا فیوز اڑ گیا۔

جب چور نے اپنی کوٹھڑی میں لالٹین جلا کر لفافہ کھولا تو اس میں سے سو کا ایک اور دس دس کے سات نوٹ برآمد ہوئے۔ ساتھ ہی نیلے رنگ کے کاغذ پر لکھا ہوا ایک خط بھی تھا۔

جناب بھائی صاحب

لعنت ہو آپ کی دولت پر اور آپ کے روپے پر جو وقت پر غریب بھائی کے کام نہ آ سکا اس

دنیا میں جس کا اور کوئی نہ ہو اس کا خدا ہوتا ہے ہم نے کچھ چیزیں گھر کی بیچ کر ایک سو روپیہ بنا لیا ہے بچاس روپے ان کے ایک دوست سے مل گئے ہیں اور بیس روپے دوسرے سے ۔ خدا نے چاہا تو اس رقم سے ہمارا بلو بچ جائے گا۔ ملٹری کے ڈاکٹر نے ہمیں بلو کے آپریشن کے لیے پنڈی بلا لیا ہے۔ خدا اس کا بھلا کرے وہ مفت اپریشن کرے گا ۔ آپ سے تو غیر اچھے ہیں۔ اب ہمیں آپ کی مدد کی بالکل ضرورت نہیں معاف رکھیں اور جو روپیہ آپ ہمیں بھیجنا چاہتے تھے اس سے فریدہ کے کنگن بنوا دیں۔ ہم ایک سو ستر میں پورا ایک مہینہ پنڈی میں گزار سکتے ہیں۔ پرسوں سے ان کی چھٹی شروع ہے اور ہم صبح کی لاری سے پنڈی پہنچ جائیں گے ۔ خدا آپ جیسے بھائیوں سے سب کو محفوظ رکھے ۔ آمین ۔

خاکسار شکیلہ بیگم

یہ خط پڑھ کر چور کے دل پر ایک گھونسہ سا لگا اور وہ بتی بجھا کر اور اپنے کپڑے اتار کر کھری چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا اور اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ننگے چور نے اٹھ کر کونے سے ٹھنڈی صراحی کا پانی پیا اور پھر بستر پر لیٹ گیا ۔ اس واقعے پر غور کرتے ہوئے اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور دو سیاہ آنسو اس کی کنپٹیوں پر پھسل کر بالوں میں جذب ہو گئے۔ اسی پشیمانی کی حالت میں اسے نیند آ گئی اور جب وہ جاگا تو صبح کے دس بج چکے تھے وہ خط اور روپے جیب میں ڈال کر جائے وقوعہ کی طرف روانہ ہو گیا ۔

شکیلہ بیگم کے گھر کے سامنے شہتوت کے چھوٹے سے پیڑ تلے ایک اے ایس آئی میز کرسی ڈالے بیٹھا تھا اور دو سپاہی باری باری ایک سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔ شکیلہ کا پست قد خاوند تھانیدار کے سامنے کھڑا تھا اور تھانیدار پنسل سے کان کھجا رہا تھا۔ چور ان کے سامنے سے گزرا اور پیچھے نظر کیے بغیر سیدھا دوسری گلی میں چلا گیا ۔ بڑی سڑک میں بس سٹینڈ کے پاس اس نے کھوکھے والے سے سگریٹ کی ایک ڈبیا خریدی، لیکن جیب میں صرف بندھے ہوئے ایک سو ستر روپے ہونے کی وجہ سے وہ ڈبیا اسے واپس کر دی ۔

داتا دربار جاکر اس نے دو رکعت نماز کفارہ ادا کی فوارے کا پانی اپنی سرمہ لگی آنکھوں پر پھیرا اور مزار کی طرف منہ کر کے الٹا چلتا ہوا جوتوں والے کے پاس پہنچ گیا۔ جوتے پہن کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں پر انگلیں پھیرتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ باندھ کر کہا "باباجی معاف کرنا اس وقت ہاتھ خالی ہے"۔

جوتوں والے نے ہاتھ کے اشارے اور تیوری کے چڑھاؤ سے کہا "جاجا دفع ہوجا" وہاں سے دفع ہو کر وہ سیدھا بھاٹی اپنے دوست کے پاس پہنچا اور اس سے دو روپے ہاتھ ادھار لے کر لنڈے چلا آیا۔ یہاں آٹھ آنے کی اس نے روٹی کھائی۔ ایک روپیہ بیٹھک میں جاکر ہار دیا اور باقی آٹھ آنے تھرڈ کلاس کے مسافر خانے میں فقیروں کو بانٹ دیئے۔

رات کے وقت جب وہ شکیلہ کے گھر کے سامنے سے گزرا تو وہاں اندر کی بتی روشن تھی۔ اس نے چاہا کہ رجسٹری کا لفافہ اندر اچھال دے لیکن پھر اسے حوصلہ نہ ہوا اور وہ دل کڑا کر کے گھر کے آگے سے گزر گیا۔

رات بھر چور اپنے ضمیر کے ساتھ جھگڑتا رہا۔ لیکن اسے کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ صبح اس نے اپنے ضمیر کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ مسجد کے سقاوے میں ٹھنڈے پانی سے نہانے کے بعد وہ سیدھا شکیلہ بیگم کے گھر پہنچا اور کنڈی کھٹکھٹا کر جیب میں ہاتھ ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ جونہی کوئی دروازہ کھولے گا۔ وہ رجسٹری والا لفافہ اس کے قدموں میں پھینک کر ہوا ہو جائے گا اور پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کرے گا۔

دروازہ کھلا اس کے سامنے شکیلہ بیگم کا پستہ قد خاوند کھڑا تھا۔ چور نے اپنی جیب سے لفافہ کھینچ کر جب پستہ قد آدمی کے سامنے مٹھی کھولی تو اس کے ہاتھ خالی تھے۔ اس نے اپنا ہاتھ پورا کھول کر کہا "میرا نام محمود علی ہے اور مجھے قریشی صاحب سے ملنا ہے"۔

شکیلہ کے خاوند نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "معاف کیجئے یہاں کوئی قریشی صاحب نہیں رہتے"۔

چور نے کہا "یہ مکان نمبر ۲۶، ۳ نہیں کیا؟" "جی نہیں" شکیلہ بیگم کے خاوند نے معذرت بھرتے لہجے میں کہا "یہ مکان نمبر ۶، ۷، ۳ ہے"۔

"اوہ معاف کیجیئے گا۔" چور نے اپنا ہاتھ ایک بار پھر اس کے سامنے پھیلایا اور مصافحہ کر کے اطمینان سے چل دیا۔

راستے میں اس کے ضمیر نے اسے پھر لعنت ملامت کرنا شروع کر دی۔ چور نے چائے والے کی دکان پر بیٹھ کر ضمیر کو سمجھایا کہ اس نے ایمانداری سے روپیہ واپس کر دینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کے ہاتھ اور اس کی انگلیوں نے ساتھ ہی نہیں دیا۔ وہ کیا کرتا!

اپنے ضمیر کے ساتھ تین دن اور تین راتیں جھگڑا کرنے کے بعد چور کی قوت مدافعت جواب دے گئی اسے اپنے اندر کے چور پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا اور وہ اپنی توجہ کسی اور طرف لگانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک شام جیل روڈ کے ایک سرونٹ کوارٹر سے ٹرانسسٹر ریڈیو چرایا اور لنڈے جا کر بیچ آیا۔ بیالیس روپے اس کے تین چار دن گزارنے کے لیے کافی تھے اور وہ یہ تین چار دن گزارنے کے لیے لاہور چھوڑ کر قصور چلا گیا۔

قصور میں حضرت بلھے شاہ کے قرب میں رہ کر اسے بڑا سکون ملا، لیکن اس کے ضمیر کو یہاں بھی آسودگی میسر نہ آئی۔ ہر شام مسجد میں سونے سے پیشتر اس کا ضمیر اس سے ایک ہی سوال پوچھتا کہ اگر تم اس روپے کی اپنی اس طرح حق حلال کی کمائی سمجھتے ہو جیسی تم نے ٹرانسسٹر ریڈیو سے حاصل کی ہے تو پھر اسے خرچ کیوں نہیں کرتے ہو۔ جیب میں کیوں لئے لئے پھرتے ہو۔ چور اس کا ایک ہی جواب دیتا کہ ابھی مجھے اس کے خرچے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اس لیے نہیں خرچتا۔ جونہی ضرورت پڑے گی خرچ لوں گا۔ لیکن اس کا دل اس جواب سے مطمئن نہ ہوتا تھا اور اُسے کچا سا جواب سمجھتا تھا۔

چور حیران بھی تھا اور ناخوش بھی۔ اسے یہ چوری بہت مہنگی پڑی تھی۔ نہ کام آتی تھی نہ جان چھوڑتی تھی۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ شکیلہ بیگم کا خط پھاڑ ڈالے جو ان روپوں کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔

چنانچہ اس نے ایک شام باہر کھیتوں میں ریل کی پٹڑی پر بیٹھ کر وہ خط پھاڑ کر اس کے پرزے ہوا میں اڑا دیے۔

رات جس وقت وہ سونے کے لیے مسجد کی صف پر لیٹا تو اس کا ضمیر پھر اسے لعنت ملامت کرنے لگا۔

چور ایک ہفتہ قصور میں گزارنے کے بعد پھر لاہور پہنچ گیا۔ مزنگ چونگی پر لاری سے اترتے ہی وہ سیدھا شکیلہ بیگم کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے راستے میں رجسٹری والا لفافہ ایک نالی میں پھینک دیا۔ ایک سو ستر کے نوٹ احتیاط سے جیب میں ڈال لیے۔ جب وہ گلی کے موڑ پر پہنچا تو اندر سے ایک بچے کا جنازہ باہر نکل رہا تھا۔ اس کا ایک پایہ پست قد آدمی کے کندھے پر تھا اور وہ زار زار رو رہا تھا۔ چور نے آگے بڑھ کر پست قد آدمی کی جگہ کندھا دیا اور پھر اس سے ایک دوسرے آدمی نے کندھا بدل لیا۔

ایک سفید ریش بزرگ شکیلہ بیگم کے خاوند کو بغل میں لے کر چل رہا تھا اور اسے صبر کی تلقین کر رہا تھا۔ ایک اور نوجوان جو غم نصیب کے دفتر کا ساتھی معلوم ہوتا تھا کہہ رہا تھا۔ ملٹری ہسپتال سے آپریشن کا بلاوا بھی آ گیا۔ کرنل صاحب نے وعدہ بھی کر لیا تھا مفت آپریشن کا اور یہ کوئی بیا آپریشن بھی نہیں ہوتا۔ بس ذرا دل کی نالی میں انگلی ڈال کر اسے کھولنا ہوتا ہے۔ معمولی آپریشن ہے جی — لیکن اگر وقت زیادہ گزر جائے تو بس پھر یہی ہوتا ہے۔ اللہ کا حکم۔

شکیلہ کا خاوند دھاڑیں مار مار کر رونے لگا اور دو تین آدمی مل کر چور کو برا بھلا کہنے لگے۔ جس نے سفر خرچ کی ساری رقم چرا لی تھی۔

چور کے ضمیر نے جیسے اس کی گدی میں زور کا دھپا مارا اور وہ زانوؤں کے بل سڑک پر گرا۔ دو آدمیوں نے اسے کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کے چھلے ہوئے زانوؤں پر ہاتھ پھیرا۔ شکیلہ کے خاوند نے چور کو تشکر اور محبت بھری نظروں سے دیکھا اور جنازہ میانی صاحب پہنچ گیا۔

جب بچے کو دفنا کر سب لوگ چلے گئے تو چور بڑی دیر تک قبرستان کی دیوار پر بیٹھا رہا اور جب

شام کافی گہری ہوگئی تو وہ آہستہ سے اٹھا اور جنازگاہ کے بھلیروں کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا۔ اس نے پھولوں سے بھرا ہوا ایک چھابہ بارہ روپے میں خریدا اور سقّے کو ساتھ لے کر تازہ بنی ہوئی قبر پہ پہنچ گیا۔ جب سقہ اس کی مرضی کے مطابق قبر کو تر بتر کر چکا تو اس نے تین روپے اس کی ہتھیلی پہ رکھ دیے اور ہاتھ جوڑ کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

اور جب چور قبرستان سے باہر نکلا تو ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اس نے باقی کے ایک سو پچپن میں سے دس کا نوٹ اور نکالا اور کھوکھے والے سے بولا "ایک ڈبی کیپسٹن چار پان"۔ ٹھنڈی ہوا کا لطف لینے کے لیے چور کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور شکر کرنے لگا کہ اس ایک نیک کام سے اس کے ضمیر کا بوجھ بالکل ختم ہوگیا۔

مانوس اجنبی

اسلام آباد بہت ہی خوب صورت شہر خموشاں ہے۔ صبح کے وقت اس خموشی کا مزا لینے کے لیے لوگ دور دور سے آتے ہیں اور یہاں سیر کرتے ہیں۔

میں مرگلہ روڈ پر سیر کرتا ہوا اکیلا جا رہا تھا۔ ایک گھنٹہ اور بیس منٹ گزر جانے کے باوجود مجھے سوائے کھمبوں کے راستے میں اور کوئی نہیں ملا تھا —— اور پھر اچانک ایک خاتون بڑے بڑے پھولوں کی پھپھو ساڑھی باندھے میرے قریب سے گزری بیس قدم کے فاصلے پر جا کر میں نے اسے پلٹ کر دیکھا۔ بیس ہی قدم کے فاصلے پر وہ پلٹی اور ہم دونوں رک گئے۔

اس کی بینائی بھی کمزور تھی۔

اس کے بال بھی سیاہ تھے۔

وہ بھی وٹامن کھاتی تھی۔

وہ بھی کولون لگاتی تھی۔

اس کو بھی منسٹری سے بلاوا آیا تھا۔

اس نے بھی پی سی ون فارم غلط بھر دیا تھا۔

اس کی بھی ساری ڈاڑھوں کی فلنگ ہو چکی تھی۔

اس کو بھی ایک سال کی اور ایکس ٹینشن مل گئی تھی۔

وہ بھی خوش دلی سے ڈھاکہ فال کا صدمہ سہہ گئی تھی۔

اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔

سلیم بھائی میانی والے کی شادی تھی۔ اس کی پانچوں بہنوں کی بیسیوں سہیلیاں اس شادی میں شریک تھیں۔ سب نے شادی والے گھر میں ڈیرا ڈالا ہوا تھا اور کئی دن سے وہاں براجمان تھیں۔

سلیم بھائی میانی والے خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ لڑکیاں ڈھولکی پر زیادہ تر بالو ماہیا کے گیت گایا کرتی تھیں۔ اور مائیں ماسیاں، پھوپھیاں اور چچی تائیاں اپنے اپنے پانچویں اور ساتویں بچے کے بعد بھی خاوندی توجہ پر شیخیاں مارنے میں وقت گزارا کرتیں اور اس گفتگو سے فائدہ اٹھا کر لڑکیاں ہر طرح کا پتہ کا جاتیں۔

جب میں سوٹ کیس اٹھائے اندر دالان میں داخل ہوا تو ڈھولکی والیاں "شادا" گا رہی تھیں اور ان کے "شادا" کہنے پر بڑا زور لگ رہا تھا جیسے پینگ کا جھونٹا لیتے وقت گھٹنوں کو خم کرکے زور لگتا ہے۔ بعض باتیں چھوٹی ہوتی ہیں لیکن ان کے جھکورے بڑے لمبے لمبے ہوتے ہیں۔ شادا کی طرح کے کئی گانے مختصر ہوتے ہیں لیکن چھلاوے کی طرح گلے پڑ جاتے ہیں گود میں اٹھاؤ تو پھسلتے ہی جاتے ہیں پھیلتے ہی جاتے ہیں۔

"اوئے ہوئے ہوئے" کہہ کر لڑکیوں نے گانا بند کر دیا اور مجھے مخول کرنے لگیں۔ میں قریب ہی ایک پرانے قصوری مونڈھے پر بیٹھ گیا اور ان کے مخول میں چسکا لینے لگا۔ اس وقت میں نیا نیا ادیب بن رہا تھا اور میری چار پانچ کہانیاں چھپ چکی تھیں۔ ہفت روزہ قیام میں میں نے ایک تنقیدی مضمون بھی لکھا تھا۔ چترا میں میرا مزاحیہ خاکہ بہت پسند کیا گیا تھا اور میں "تو کون سی بدلی میں میرے چاند ہے آجا۔" بانسری پر بھی بجا لیتا تھا اور گا بھی لیتا تھا۔ اپنی تمام تر شرافت کے باوجود مجھے پتہ تھا کہ میں کافی چند ربدن من موہن قسم کا لڑکا ہوں اور آئی سی ایس والے عبدالجبار سے دوسرے نمبر پہ آتا ہوں۔

جبار بھائی کے چھوٹے قد، گھتی ہوئی بھنوؤں پسینہ بھرے ہاتھوں اور گول ٹھوڑی

کو ان کے آئی سی ایس کا غبارہ اڑائے پھرتا تھا۔ انھوں نے بہت اچھے بوچھے کیے تھے اور ساری لڑکیوں کے والدین ان پر فریفتہ تھے اور اپنے والدین کے تتبع میں لڑکیاں بھی ان پر جان چھڑکتی تھیں (اس زمانے میں جنریشن گیپ نہیں تھا اور اولاد اپنے ترقی پذیر ماں باپ کی دل و جان سے عزت کرتی تھی) خدا کی قسم میں بھائی عبدالجبار سے دوسرے نمبر پر آتا تھا اور لڑکیاں اپنے والدین کی اشارت کے باوجود مجھ پر جان چھڑکتی تھیں، لیکن ان کی جان چھڑکنے میں دوستی زیادہ ہوتی، محبت بھی کافی ہوتی پر وہ غم نہ ہوتا اور وہ دکھ نہ ہوتا اور وہ کراہ نہ ہوتی جو کرشن چندر کے اس دور کے افسانوں میں ہوا کرتی۔

جب میری خالہ زادوں نے اوئے ہوئے ہوئے کر کے اور میرے ساتھ آدھی آدھی اور لونی لونی جپھیاں سی ڈال کر پھر ڈھولک سنبھالی تو میں نے دیکھا کہ روڑے والی کے پیچھے والی لڑکی کے ساتھ لگ کر ایک شفاف سی لڑکی دونوں زانوؤں پہ ہاتھ رکھے التحیات کے انداز میں بیٹھی ہے اور اس کی چوٹی اس کے کندھے پر سے ہو کر اس کی گود میں ڈھیر ہے اور اس میں سیاہ ریشم کا موباف ہے اور اس کے آخر پہ کوکا کولا بوتل کے پیندے جتنے بڑے ہاتھی دانت کے گول گول چھلے ہیں۔ کانوں میں گہرے نیلے رنگ کے ٹاپس ہیں۔ گلے میں کنسواری رنگ کا چنا ہوا دوپٹہ ہے اور کندھے کے اوپر لیڈی ہیملٹن دو رنگ بدلتی ہے۔ حالانکہ نہ لٹکتا ہوا بلب ہل رہا ہے اور نہ ہی اس کے کندھے میں جنبش ہے۔ ایک آستین کہنی تک الٹی چڑھی ہے اور دوسری کلائی پر بند ہے اور بند آستین پر تین بٹن لگے ہیں نومبر کی آفتابی کرن کے رنگ لیے اس کے ہاتھ میں اور بازو میں اور تہہ کیے ہوئے زانو میں اس کی بے توجہی ہے اور بے تعلقی ہے اور نفاست ہے اور اس کا موباف ہے اور اس کے بیٹھنے کا انداز ہے اور اس کے کندھوں کا اور کمر کا اور لک کا اور نیچے دبے ہوئے پاؤں کے کچھ حصے کا خوبصورت سا پنسل سکیچ بنایا جا سکتا ہے۔ پھر اس کا ادھر سے جس طرف روڑے والی بیٹھی ہے ایک پروفیشل فوٹو بھی اتارا جا سکتا ہے۔ ٹو پوائنٹ ایٹ۔ سنگل لینز ریفلیکس اپرچر الیٹ + ہنڈرڈ ٹوئنٹی فائیو سپیڈ۔

یا پھر اس کے اس کندھے کے ساتھ لگ کر جہاں لیڈی ہیملٹن اپنا رنگ بدلتی ہے۔ ایک چھوٹے

سے جانماز پر ساتھ ساتھ کھڑے ہو کر نماز بھی پڑھی جا سکتی ہے ۔

میں نے پہلے اس لڑکی کو اپنی خالہ زادوں کے گروپ میں کبھی نہیں دیکھا تھا ۔ اصل میں بیاہ شادیوں میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے ہونے پر کسی کو اعتراض نہیں ہوتا ۔ نہ ان کی بابت کوئی پوچھتا ہے نہ کوئی بتاتا ہے نہ ہی کسی کو ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔ پھر شامیانوں اور کراکری کے ساتھ ایسے لوگ بھی چلے جاتے ہیں ۔

اس لڑکی کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کو کسی کی پروا نہ تھی ۔ ہماری جگہ اگر وہاں آئی سی ایس والے بھائی عبدالجبار بھی ہوتے تو بھی اس کی پروا نہ ہوتی ۔ اصل میں وہ بڑی شفیق بڑی خلیق بے حد ملنسار بہت ہی خوبصورت نہایت سیر چشم اور بڑی کائنڈ اور مہربان سی لڑکی تھی اس لیے اس کو کسی کی پروا نہ تھی ۔ ڈھولک بجتے ہوئے وہ ہر نئے مصرعے کو غور سے سنتی اور دوسرے مصرعے پر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ داد دیتی ۔ وہ ایسی نہ تھی جیسی گھمنڈی لڑکیاں ہوتی ہیں ۔ خواہ مخواہ سبلے تکی ۔ کاں کاں ۔ وہ تو بوسکی کا تھان تھی ۔ لش لش چمکنے والی ۔ گرہ نہیں پڑتی تھی ۔ بزاز نکال کر دکھائے گا تو دکھے گی نہیں تو اپنے خانے میں رہیگی ۔

جب میں کمرے میں داخل ہوا اور زور سے "اوئے ہوئے ہوئے" ہوئی تو نہ اس نے میری طرف دیکھا نہ اپنی جگہ سے ہلی ۔ نہ التحیات والی پوزیشن کو چھوڑا ۔ میں نے سب لڑکیوں کو بتایا کہ بطرس صاحب پھر واپس آکر ہمارے پرنسپل لگ گئے ہیں اور مجھ سے بڑی محبت کرتے ہیں ۔ پرسوں ہم دونوں آگے پیچھے لائبریری کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو ان کے ہاتھ اور میرے کندھے کے درمیان صرف چھ انچ کا فاصلہ تھا ۔ پھر میں نے لڑکیوں کو بتایا کہ ہم ادیب لوگ کافی ہاؤس میں جمع ہوتے ہیں اور راجندر سنگھ بیدی سلیٹی رنگ کی پگڑی باندھتے ہیں اور ان کی داڑھی بہت چمکدار اور سیاہ رنگ کی ہے ۔ میرے ساتھ بڑی محبت کرتے ہیں ۔ دلیندر ستیارتھی ۔ موچی دروازے کے باہر سرکلر روڈ پر برکت علی ہال کے پاس ایک چارپائی پر بیٹھے ہوتے ہیں اور لوک گیتوں پر مضمون لکھا کرتے ہیں ۔ ان کے قریب سنگل بنانے کے کارخانے ہیں اور وہاں سنگلوں کی کڑیاں ویلڈ ہوتی ہیں ۔ میں تقریباً ہر روز ان سے ملتا ہوں ۔ نہ جاؤں تو شکایت کرتے ہیں ۔ لڑکیاں ڈھولک چھوڑ کر دم بخود میری بات سن رہی تھیں اور مجھ پر فخر کر رہی تھیں ۔ ان دنوں میں ادیب بننے

والا ہی تھا۔ جس طرح بلی کے بچے پیدا ہو جاتے ہیں لیکن آنکھیں دیر سے کھلتی ہیں۔

میں نے ان کو بتایا کہ میں نے لاہور ریڈیو سٹیشن پر پارٹ ٹائم نوکری کر لی ہے اور میرا کانٹریکٹ بن گیا ہے۔ اس کانٹریکٹ پر ہمارے اے ایس ڈی جناب ن م راشد صاحب کے دستخط ہیں۔ راشد صاحب کے دستخط ایسے ہیں جیسے سڑک پر ٹیلیفون تار کا گچھا کھل گیا ہو۔ اس کے درمیان اردو کے آٹھ جیسی گھوڑی سیڑھی کھڑی ہو اور آگے تار کے گچھے چھوٹے ہوتے جائیں۔ رمز کا بلینک چہرہ دیکھ کر میں نے کہا: "نہیں سمجھی بیوقوف"! اس نے نفی میں سر ہلایا تو میں نے کہا راشد صاحب اپنے دستخط چھوٹے این اور چھوٹے ایم سے شروع کرتے ہیں۔ این کے دو اور ایم کے تین کل پانچ چکر چھلے دار بناتے ہیں پھر بیچ میں راشد کا بڑا آر کھڑا کر دیتے ہیں اور پھر چھوٹے حروف ڈال دیتے ہیں۔ سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے کہ میں ن م راشد کے اس قدر قریب رہتا ہوں اور ان سے ہدایات لے کر اناؤنسمنٹ لکھتا ہوں۔ لڑکیوں نے کہا "تم ہمارے نام فرمائش میں بلوا سکتے ہو؟ میں نے کہا "ہر روز۔ بلاناغہ۔ سب۔ ایک ایک کر کے :

جتنے لڑکے اس وقت شادی کے اندر اور باہر کمروں میں اور تمبوؤں کے نیچے گھوم پھر رہے تھے۔ میرے سامنے چھوٹے چھوٹے پدے سے بن گئے۔ پھر دو لہا میاں مسکراتے ہوئے اندر آئے اور آ کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ لڑکیوں نے ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی اور اسی طرح میری باتیں سنتی رہیں۔

رات کے وقت کھانے کے بعد جب لڑکیاں پھر ڈھولک پر آ بیٹھیں تو بجلی کا ایک فیز چلا گیا۔ ماموں جان نے مجھے بلا کر میری ڈیوٹی لگائی کہ میں سوئچ بورڈ پر اس خرابی کو چیک کروں اور سرونٹس کوارٹرز اور پچھلے برآمدے کی بتیاں پھر سے چالو کروں۔ ان کا خیال تھا کہ ریڈیو میں کام کرنے کی وجہ سے میں بجلی کے کاروبار سے بھی اچھی طرح واقف ہو گیا ہوں گا۔ میں نے سوئچ بورڈ پر جا کر مین آف کیا تو اندر سے بڑے زور کی "ہا" بلند ہوئی اور شور و غل رک گیا۔ تھوڑی سی کوشش سے مجھے ایک اڑا ہوا فیوز مل گیا جسے میں نے تین باریک تاروں کی گت بنا کر لگا دیا۔ جب میں نے مین آن کیا تو ایک مرتبہ پھر اندر سے "ہا" کی آواز آئی۔ تمام بتیاں روشن ہو گئیں۔ سرونٹس کوارٹرز بھی روشن ہو گئے۔ لیکن پیچھے کا برآمدہ بدستور تاریک رہا۔ میں نے سوچا برآمدے کی خیر ہے کل صبح دیکھ لیں گے۔ پچھلے برآمدے میں روشنی کی ایسی کوئی خاص ضرورت

بھی نہ تھی۔

جب میں بیبیج کس اور پلاس ہاتھ میں لے کر واپس لوٹ رہا تھا تو اس تاریک برآمدے کے ایک کونے میں مجھے وہی لڑکی کھڑی نظر آئی۔ میں نے پلاس اور بیبیج کس رضائیوں والی پیٹی پر رکھ دیا اور آگے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ پھر ہم دو قدم آگے کو بڑھے۔ اس کے بعد میں نے قدرے مضبوطی سے اس کو کھینچا تو اس کے قدم تیز ہو گئے اور ہم بڑی تیزی کے ساتھ ٹوٹی ہوئی پردہ وال سے نکل کر ساتھ کے پلاٹ میں اتر گئے جہاں ایک نئی کوٹھی بن رہی تھی۔

اس کوٹھی کے اندر دیواروں پر پلستر ہو چکا تھا، لیکن فرش ابھی تک نہیں ڈالے گئے تھے۔ مسلسل پانی لگنے کی وجہ سے ساری دیواریں رسی ہوئی تھیں اور اندر بڑی ٹھنڈک تھی۔ پتہ نہیں یہ کون سا کمرہ تھا ڈرائنگ روم یا ماسٹر بیڈ روم لیکن تھا کافی بڑا۔ اس کے اندر پاڑ کے بڑے بڑے پھٹے پڑے تھے اور فرش شپا شپ گیلا تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے چوکھٹ لگ چکے تھے۔ لیکن ان پر پٹ نہیں چڑھے تھے۔ اندر سیمنٹ اور ٹھنڈے پانی کی خوشبو تھی اور اس خوشبو میں رندہ لگی چیل کی مہک بھی شامل تھی۔

ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر پھٹوں پر بیٹھ گئے اور بڑی دیر تک چپ چاپ ایسے ہی بیٹھے رہے۔

اس کا نام امثل تھا اور وہ بہاولپور سے آئی تھی۔ وہ سیمی کی ایک سہیلی نگہت کی سہیلی تھی اور لاہور سے گزر رہی تھی۔ امثل کے سر سے ایٹ کینس ہیرایئل کی خوشبو آ رہی تھی اور اس نے اپنے کندھوں پر کھیوڑی کیوڑہ پاوڈر چھڑکا ہوا تھا۔ اس کی پلکیں اتنی لمبی تھیں کہ جب بھی اس کے کان میں سرگوشی کرو تو سرگوشی کرنے والے کے گال پر لگنے لگتی تھیں اور آنکھوں کی جھپک سے نفی اثبات کا ورد شروع کر دیتی تھیں۔ ان پلکوں کی اپنی ایک بولی تھی جو تھوڑی ہی دیر میں سمجھ میں آنے لگتی تھی۔ امثل کے منہ سے ایسی خوشبو آ رہی تھی، جیسے چھ ماہ کے بچے کو انرجی فوڈ بسکٹ کھلا کر اس کی ماں نے ابھی نہلایا ہوا اور تولیے میں لپیٹ کر تکیوں کے درمیان بٹھا دیا ہو۔

جب ہم کافی دیر تک اسی طرح بیٹھے رہے تو اس نے آہستہ سے پوچھا "تم ریڈیو میں ملازم ہو۔"

"ہاں"

"کیا کرتے ہو؟"

"اناؤنسمنٹ لکھتا ہوں"

"وہاں مصطفےٰ علی ہمدانی بھی ہے ناں۔ تمہارے ساتھ"

"ہے مگر بہت ہی ضعیف آدمی ہے"

"کیوں؟ — اس کی آواز تو نوجوانوں کی سی ہے — بہت ہی خوبصورت"

"منہ میں سٹیل کی پتری فٹ کر کے بولتا ہے بے چارا۔ بہت ہی بھدی آواز ہے اصل نہیں ہے"

"تم نے امتیاز علی تاج کو بھی دیکھا ہوگا"

"روز ملتے ہیں۔ بیچارے ایک ٹانگ سے معذور ہیں۔ بیساکھی لگا کر آتے ہیں"

"ہائے اللہ — یہ کیوں — انہوں نے تو درجنیا میں کام کیا ہے"

"درجنیا میں کام کرنے سے ٹانگ تو نہیں ناں اُگ سکتی دوبارہ — ویسے اچھے آرٹسٹ ہیں"

"اور دیہاتی پروگرام والا نظام دین — اس کو بھی تو دیکھا ہوگا تم نے"

"دیکھا! وہ تو اپنا بچہ ہے — جتنی باتیں وہ اپنے پروگرام میں کرتا ہے میں ہی لکھ کر دیتا ہوں"

"ہائے اللہ — سچ — تم لکھتے ہو"

"شک ہے تو چلو کل میرے ساتھ ریڈیو سٹیشن"

"نظام دین بالکل دیہاتی ہے یا کچھ پڑھا لکھا بھی ہے؟"

"تھوڑی بہت اُردو پڑھ لیتا ہے — اپنے دستخط انگریزی میں کر لیتا ہے"

"نوجوان ہے؟"

"ہے تو نوجوان لیکن اس کی ایک آنکھ پتھر کی ہے"

جب امتل کو اپنے تینوں ہیروؤں کی اصل حقیقت کا علم ہوا تو اس کا دل بجھ سا گیا۔ میں اُسے غمناک پا کر گلے سے لگا کر دیر تک اس کو تھپتھپاتا رہا۔ اس نے میلے پر جلنے والے بچے کی طرح میری

انگلی پکڑلی اور اپنا ماتھا میرے کندھے پر لگائے رکھا۔ پھر میں پھٹے پر لیٹ گیا اور میں نے اپنے ہاتھوں کی کنگھی بنا کر اپنے سر کے نیچے کر لی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور میرے سر کی جانب آکر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اوپر نیچے رکھ کر کوزہ بنایا اور اس کوزے کو میری کنگھی کے نیچے رکھ دیا۔

"نہیں نہیں یہ ٹھیک نہیں۔ تمہیں تکلیف ہو گی۔"

"کوئی تکلیف نہیں۔ خدا کی قسم۔ تم لیٹے رہو۔"

"مجھے لیٹنا کچھ ایسا خاص پسند بھی نہیں۔"

"نہ بھی پسند ہو تو بھی لیٹے رہو۔"

"تم بھی لیٹ جاؤ۔"

"نہیں میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔"

"اتنی دیر ڈھولک کے پاس بیٹھ کر تھک گئی ہو گی۔"

"میں کبھی تھکتی ہی نہیں۔"

"پھر بھی۔ ذرا سی دیر کے لیے۔"

"یہاں کوئی اور پھٹا ہی نہیں لیٹوں کیسے۔"

"میں اٹھ جاتا ہوں۔ آؤ۔ آؤ تم لیٹ جاؤ۔"

"دراصل میں ایک سگریٹ پینا چاہتا ہوں۔"

"تو پی لو۔"

"ماچس جلے گی تو اندر روشنی ہو گی۔ چوکیدار خبردار ہو جائے گا۔"

"تم ماچس جلاؤ میں تمہارے آگے کھڑی ہو جاتی ہوں۔"

اس کا خیال تھا جلتی ہوئی دیا سلائی کے سامنے کھڑے ہونے سے کمرے میں روشنی نہیں ہو گی میں نے شفقت کے ساتھ بزرگانہ انداز میں اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"پی لو سگریٹ"۔

"مشکل ہے"۔

"کوئی مشکل نہیں"۔

"ہے نا بھائی"۔

"میں جو کہتی ہوں کوئی مشکل نہیں۔ پی لو"۔

"تم تو بیوقوف ہو"۔

"میں نے ایف ایس سی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہے"۔

"فرسٹ ڈویژن والے بیوقوف نہیں ہو سکتے"!

"خدا کے لیے سگریٹ پی لو۔ ہاڑے ہاڑے"۔

"یہاں کتنا کاٹھ پڑا ہے۔ آگ لگ جائے گی"۔

"آگ لگ جائے گی تو ہم بھاگ جائیں گے"۔

میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر منہ میں دبائی۔ ماچس نکالی۔ دیا سلائی کو رگڑا اور پہلے نارنجی شعلے میں امتل کی ناک پر پسینہ دیکھا۔ دور سے چوکیدار کی آواز آئی۔

"کون ہے اندر"۔

پھر ہم وہاں سے بھاگے اور ملحقہ غسل خانے کے بے پٹ دروازے سے پچھلی گلی میں سے ہوتے ہوئے ٹوٹی ہوئی پردہ وال کے پاس پہنچ گئے۔ امتل وہاں سے نکل کر پھر اسی اندھیرے برآمدے میں گم ہو گئی اور میں سرونٹس کوارٹرز کی طرف نکل گیا۔ جہاں نائی کے ملازم پیاز چھیل رہے تھے۔ کافی دیر میں ان کے پاس بیٹھ کر میل کے کھانے اور ولیمہ کے کھانے میں فرق معلوم کرتا رہا۔

ماموں جان مجھے تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے اور بولے "یار کہاں غائب ہو گئے تھے۔ یہ برآمدے کی بتی تو آئی ہی نہیں۔

میں نے کہا "ماموں جی اس کا فیوز کہیں الگ معلوم ہوتا ہے۔ بورڈ میں نہیں ہے۔ اس کو

صبح دیکھیں گے" نانی نے کہا، خاں صاحب اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ ہمارا علاقہ روشن ہو گیا یہی کافی ہے۔"

پھر ماموں مجھے اپنے ساتھ سامنے کے لان میں لے گئے جہاں ایک دن چھوڑ کر ولیمہ کا بندوبست ہونا تھا۔ میں نے کرسیاں لگانے کے بارے میں اپنی ایکسپرٹ رائے دی اور کھانا کھلانے کے سیکشن کو تبدیل کرنے پر زور دیا۔ کچھ دیر ہمارے درمیان وزنی دلائل رہے، پھر میں نے ان کی بات مان لی۔

کوئی ایک گھنٹہ بعد جب میں میوزک روم میں داخل ہوا تو لڑکیاں بڑی شدت کے ساتھ ڈھولکی کوٹ رہی تھیں اور روڑے والی کے ساتھ امتل اسی طرح التحیات کے انداز میں بیٹھی تھی۔ اس نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا جیسے پہلے بیٹھی تھی اسی طرح بیٹھی رہی۔

میں نے لڑکیوں کو ریڈیو سٹیشن کے لطیفے سنائے۔ امتیاز علی تاج اور رفیع پیر کے انداز میں بول کر سنایا۔ نظام دین کی نقل اتاری، موہنی حمید کی باتیں بتائیں، لیکن امتل اسی طرح بیٹھی رہی۔ پھر ڈھولک کی تھاپ پر میں نے اور خورشید خالہ نے ناچ کیا۔ لڑکیوں نے ناچ کیا اور ہم سب نے خوب ہلڑ مچایا۔ امتل اسی طرح زانوؤں پر ہاتھ رکھ کر بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ سلام ہی نہ پھیرا۔

اچانک وہ اٹھی اور اس نے سیمی کے کندھے کو چھوا۔ وہ بھی اس کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں کمرے سے باہر نکل گئیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد میرا اور آپا زہرہ کا ناچ ہوا۔ لڑکیوں نے ہم کو چار چار اور آٹھ آٹھ آنے کی ویلیں دیں اور ہمارے پاس گیارہ روپے جمع ہو گئے جب ہم تھک کر بیٹھ گئے تو میں نے لڑکیوں کو اناؤنسمنٹ کے ساتھ راگ شدھ بلاول سنایا جس کا وادی سُر کومل اور سموادی کھرج تھا۔ اکیس مور بجتے تھے اور تال بادن تھی۔ ولمبت لے کے بول تھے "باج رہی پائلیا" طبلے پر سنگت قادر بخش کی تھی اور سارنگی استاد فلو سے خاں بجا رہے تھے۔

جب میرا راگ ختم ہوا اور تالیاں بج چکیں تو میں ہڑبڑا کر اپنی جگہ سے اٹھا اور تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ سیمی گیسٹ روم سے لوٹ رہی تھی۔

• یہ کون ہے تمہاری سہیلی؟

" کون ؟"

" یہی جو تم کو ابھی اٹھا کر کمرے سے باہر لے گئی تھی۔"

" میری سہیلی نہیں نکہت کی سہیلی ہے۔ بڑی ناک چڑھی مغرور اور خود پسند سی ہے۔"

" یہ لڑکی" میں نے تعجب سے پوچھا۔

" توبہ توبہ صبح سے آئی ہے اور ایک بات تک نہیں کی ہم سے۔ کسی کو انسان ہی نہیں سمجھتی۔"

" ذرا بلاؤ اس کو ہم اس سے انٹرویو کریں گے ٹیپ ریکارڈر پہ۔"

" وہ تو چلی گئی۔"

" چلی گئی!"

" اس کے ابا ساتھ تھے۔ دراصل وہ شادی میں شرکت کے لیے نہیں آئے تھے۔ پشاور جانے کے ایک دن یہاں رک گئے تھے۔"

" لیکن اس وقت کونسی گاڑی جاتی ہے آدھی رات کو؟"

" بس جاتی ہے، رات کے ساڑھے تین بجے پنڈی رکے بغیر۔ سیدھی پشاور۔"

اور جب ہم نے مرگلہ روڈ پہ رک کر اور پلٹ کر اور سوچ کر ایک دوسرے کو پہچان لیا تو وہ مجھے میراوالد اور میں اسے احمق کی اماں سمجھ کر اپنی اپنی راہ پر روانہ ہو گئے۔

بیا جاناں

اس نے اپنی پشت پر ایک چھوٹے سے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ اس دباؤ میں گرمی بھی تھی اور ٹھنڈک بھی، کچھ حجاب بھی تھا اور ذرا سی بے تکلفی بھی۔ طالب نے پیچھے مڑ کر دیکھا، ایک چھوٹی سی لڑکی کندھے پر تولیہ ڈالے سر جھکائے کھڑی تھی۔

وہ ابھی کرشن نگر کی بڑی سڑک سے گلی کا موڑ مڑا ہی تھا کہ اس کی مڈبھیڑ محلے کے ننگ دھڑنگ بچوں کے ایک گروہ سے ہوگئی تھی جو ہاتھوں میں مٹی کے ڈھیلے اٹھائے ایک نالی کے دہانے پر چاند ماری کر رہے تھے۔ مئی کی چلچلاتی دھوپ میں ننگے سر، پسینے میں نہائے ہوئے یہ بچے اس پلّے کو اپنے ڈھیلوں کا نشانہ بنا رہے تھے جو ان کے خوف سے بھاگ کر اس غلیظ نالی میں آگیا تھا۔ طالب نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ سیاہ کیچڑ میں سنے ہوئے پلّے کی تھوتھنی سے سرخ سرخ خون بہہ رہا تھا۔ ایک آنکھ کیچڑ کے لیپ نے بند کر دی تھی۔ اور دوسری چھپے ہوئے لیمن ڈراپ کی طرح چمک رہی تھی۔

طالب نے آگے بڑھ کر بچوں کو دھمکایا، ان کے ہاتھوں سے ڈھیلے چھینے اور ان کے پیچھے زور زور سے تالیاں بجا کر انہیں دور دور بھگا دیا۔ پھر وہ نالی کے پاس بیٹھ گیا۔ پلّے نے باہر نکلنے کی تمام کوششیں بالکل ترک کر دیں اور نالی کے سوراخ میں عین نیچے دبک گیا۔ طالب نے اپنی آستینیں چڑھائیں، بازو پر بندھے ہوئے تعویذ کو اوپر بغل تک کھسکایا اور پھر منٹ کیمرہ فوٹو گرافر کی طرح پوری باہیں سوراخ میں گھسیڑ دیں۔ پلّے نے اس آہنی پنجے کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر پوری مدافعت کی، ٹانگیں اکڑا کر نالی کی دیواروں میں

اڑادیں، چوں چوں کا نالہ بلند کیا، منہ کھول کر کاٹنے کی کوشش بھی کی لیکن طالب نے اپنی جدو جہد جاری رکھی اور پلے کی مدافعتی کارروائی کے باوجود اسے نالی سے نکال کر باہر تپتی ہوئی زمین پر ڈال دیا۔ پلے نے کانی آنکھ سے پہلے تو اس کی طرف دیکھا، پھر پوستین کو جھٹکا اور آخر میں "سب اچھا" کا کاشن پاکر دم دبا کر بھاگ گیا۔

نالی کے کنارے بیٹھے بیٹھے طالب نے اپنی پشت پر ایک چھوٹے سے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا، ایک چھوٹی سی لڑکی کندھے پر تولیہ ڈالے سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس نے سر سے پیر تک لڑکی کا بغور جائزہ لیا۔ اس کے پاؤں کے پاس سلور کا ایک لوٹا پانی سے لب لب بھرا رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کی ایک بند صابن دانی تھی۔ پھر طالب نے کہنی تک لتھڑی ہوئی اپنی بانہہ کو دیکھا جس پر چمٹے ہوئے کیچڑ سے بال صفا کی بو آرہی تھی۔ لڑکی نے لوٹا اُٹھایا اور اس نے اپنا بازو نالی پر کر دیا۔ لڑکی نے ایک قدم آگے بڑھ کر صابن دانی اس کے پاؤں کے پاس رکھ دی اور خود لوٹا اٹھا کر جھک گئی۔ جب کورے مٹکے کے ٹھنڈے پانی کی دھار اس کی بانہہ پر پڑی اور اس نے پلاسٹک کی ڈبیا سے سفید رنگ کا آدھا گھسا ہوا وہ صابن باہر نکالا جو ایکٹرسیں اپنے حسن کے نکھار کے لیے استعمال کرتی ہیں تو بال صفا کی بو اور تیز ہو گئی۔

دو مرتبہ صابن لگانے اور لوٹا بھر پانی بہانے کے بعد بھی جب طالب کی تسلی نہ ہوئی۔ اور اس نے بچی کے کندھے سے تولیہ نہ اتارا تو سامنے کی کھڑکی سے آواز آئی "رانی! پانی اور لے جا۔"

طالب نے چہرہ اُٹھا کر اوپر دیکھا۔ وہ سفید ململ کا کلیوں والا کرتہ پہنے کھڑی تھی اور اس کے سینے پہ چاندی کے بٹنوں کی زنجیر لٹک رہی تھی۔ طالب کو اپنی طرف اس طرح دیکھتا پاکر وہ ایک دم پلٹی اور اس کے جوڑے سے موتیے کا ایک پھول ٹوٹ کر نیچے گر گیا۔

رانی پانی کا دوسرا لوٹا بھر کر لائی تو طالب نے پوچھا۔ "یہ تمہاری کون ہیں؟" رانی

نے سر تھوڑا کر اور گردن گھما کر کہا۔"میری باجی ہیں۔" طالب نے کہا۔"بہت اچھی ہیں تمہاری باجی، تمہیں مارتی تو نہیں؟"

"نہیں۔" رانی نے کھلکھلا کر کہا۔"باجیاں بھی کوئی مارا کرتی ہیں۔"

طالب نے کہا۔"میری باجی تو..... "اور پھر وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ رانی نے اٹھلا کر پوچھا۔"کیوں آپ کی باجی آپ کو مارتی ہیں کیا؟"

طالب نے اپنے آپ سے کہا۔"ہاں بس ایک دفعہ مارا ہے اور عمر بھر کے لیے ہم سب کو مار کے رکھ دیا ہے۔"

رانی نے حیران ہو کر پوچھا۔"پھر بھی آپ اپنی باجی سے بولتے ہیں؟" طالب اُٹھ کھڑا ہوا اور تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولا۔"ہم تو اس سے بولتے ہیں۔ پر وہ ہی ہم سے بولنا پسند نہیں کرتی۔" اور یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے رانی کا سر سہلاتے ہوئے پیار سے کہا۔"اپنی باجی سے کہنا شکریہ۔" رانی نے اثبات میں سر ہلایا اور لوٹا اور صابن اُٹھا کر اپنے گھر کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

اسی گھر کی پہلو والی گلی میں اسی گھر کے پچھواڑے طالب کو جانا تھا۔ مضبوط اینگل آئرن کے فریم میں لہریا ٹین کی چادروں کو جکڑے پھاٹک اندر سے بند تھا۔ اس نے پھاٹک دھکیلنے کی کوشش کی لیکن چادریں دھوپ کی حدت سے انگارہ سی گرم تھیں اور ان پہ ہاتھ نہ رکھا جا سکتا تھا۔ طالب نے پھاٹک کو انگلی سے بجایا اور پھر پھاٹک پر لگی ہوئی بانس کی قوسیں سیڑھی میں عشق پیچاں کی بیل کو دیکھنے لگا جس میں اکا دکا کاسنی پھول کھلے ہوئے تھے۔ اس نے ایک بار پھر پھاٹک کو بجایا اور برجی پر لٹکتی ہوئی نیم پلیٹ کو دھپا مار کر اس پر سے گرد جھاڑی۔ تختی ٹپٹپائی اور اس پر لکھے ہوئے "محمد حنیف اے۔ ایل ایم" کے حروف دو چند، سہ چند بلکہ دہ چند ہو کر کانپنے اور پھر اپنی جگہ جا چمٹے۔

پھاٹک کھلا۔ دو فٹ چوڑے شگاف کے سامنے ایک سادھو کھڑا تھا۔

گیروے رنگ کی چادر گلے میں باندھے، کلائیوں میں موٹے منکوں کی مالا، پاؤں میں کھڑاویں، کانوں میں لاکھ کے بالے، سادھو نے طالب کو آشیرباد دی اور پھر بڑے سادھارن طور پر کہا۔ "کیا بات ہے بابا! کیسے آئے؟"

طالب دیر تک بھونچکا کھڑا رہا۔ وہ ایک مرتبہ پہلے بھی یہاں آیا تھا۔ لیکن یہاں کوئی سادھو نہیں رہتا تھا۔ اس دن گو حنیف اسے اس پھاٹک پر ہی ملا تھا لیکن آثار بتاتے تھے کہ یہ گھر ہی تھا کوئی مٹھ نہیں تھا۔ جب سادھو نے طالب کو اس طرح مورتی بنے دیکھا تو اس نے پھر بڑے پریم سے پوچھا۔ "کہو بابا! کس سے ملنا ہے؟"

طالب نے گلا صاف کر کے کہا۔ "جی مجھے حنیف صاحب سے ملنا ہے۔"

"تو اندر آؤ" سادھو نے کو ملتا کے ساتھ کہا۔ "میاں دھوپ میں کھڑے کیوں حیران ہو رہے ہو۔" طالب اندر داخل ہوا تو سادھو نے پٹ بھیڑ کے زنجیر ڈال دی ــ اور کھڑاویں بجاتا ہوا کوٹھڑی کی طرف چل دیا۔

مکانوں کی پشتوں کے درمیان گھری ہوئی یہ جگہ کوئی چار مرلے سے زیادہ نہ ہو گی۔ تین مرلے کا صحن تھا اور ایک کونے میں ایک کوٹھڑی تھی، پھاٹک کے پاس پانی کا نل لگا تھا جس کی ٹیکتی کیاریوں کو پانی دے رہی تھی۔ صحن کے بیچوں بیچ کوئی دو فٹ چوڑی چوپڑ کی روشیں تھیں اور چاروں پلاٹوں میں پانی میں ڈوبی ہوئی گھاس کہیں کہیں سے سر نکال رہی تھی۔ ان پلاٹوں کے کناروں پر موتیے اور گلاب کے پودے تھے جو دھوپ سے سنولائے ہوئے تھے۔ طالب دونوں روشوں کے کٹاؤ پہ کھڑا دیر تک اس ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔ گرمیوں کی سہ پہر تھی لیکن گرمی کا وہی عالم تھا جو ایک ڈیڑھ بجے دن کے ہوتا ہے۔ اس نے دھول میں اٹے ہوئے گلاب اور موتیے کے پھولوں کو دیکھا اور پھر ایک نظر کوٹھڑی پر ڈالی۔ سادھو دروازے پر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جب طالب اس کی طرف بڑھا تو وہ مسکرایا اور اپنا دایاں ہاتھ ہوا میں بلند کر کے الکھ نرنجن کا دھیما سا

نعرہ مار کر اندر کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔

کوٹھڑی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھجور کی چٹائی بچھی تھی اور اس پر حنیف، ایک اور نوجوان اور سادھو آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ اندر اگربتیاں سلگ رہی تھیں، روشنی بہت کم تھی اور باہر کے مقابلے میں یہاں بڑی ٹھنڈک تھی۔ طالب کو دیکھ کر حنیف نے اللہ ہو کا نعرہ مارا اور اٹھ کر ناچنے لگا۔ طالب دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا تو سادھو نے کہا: "بیٹھو، بیٹھو بابا، کھڑے کیوں ہو!" طالب نے جوتیاں اتار دیں اور چٹائی پر دو زانو بیٹھ گیا۔ تیسرا نوجوان دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی گود میں لمبی تسبیح تھی جس میں کوئی دس ہزار دانے ہوں گے۔ یہ تسبیح اس کی گود میں ہو کر چٹائی کے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی تھی اور اس کا ایک کنارہ سادھو کی ران کو چھو رہا تھا۔ حنیف کے بدن پر چوڑے چھینٹوں والا ایک لمبا سا کرتا تھا جو اس کی پنڈلیوں کو چھو رہا تھا۔ اس کے سر پر قلندروں والی ٹوپی تھی اور وہ چٹکیاں بجا بجا کر اور منہ سے "چھو ادھی ای چھو ادھی ای" کی آواز نکال کر گا رہا تھا۔

نمی دانم کہ آخر چوں دمِ دیدار می رقصم
مگر نازم بآں قسمت کہ پیشِ یار می رقصم

جب وہ پیشِ یار می رقصم کی تکرار کرتا تو دونوں ہتھیلیاں دیوار پہ رکھ کر اپنا سر زور زور سے دیوار پہ مارتا اور سارا کمرہ اس کی سرشوری سے گونجنے لگتا۔ سادھو آنکھیں موندے کھڑی پھاوڑی پہ بازو جمائے گیان دھیان میں ڈوبا تھا۔ اس کا سر گھٹا ہوا تھا اور داڑھی مونچھ صفاچٹ تھی۔ پسینے کے قطرے اس کے چہرے پہ عیاں تھے پہ وہ اپنی لگن میں سنسار سے ناطہ توڑ کر بیٹھا تھا۔

حنیف سجدے میں گر کر چٹائی کو دونوں ہاتھوں سے نوبت کی طرح بجا رہا تھا اور سانپ کے پھن کی طرح آدھا دھڑ زمین سے اٹھا اٹھا کر فریاد کر رہا تھا۔

بیا جاناں تماشا کن کہ در انبوہ جانبازاں
بہ صد سامان رسوائی سر بازار می رقصم

اس شعر کا ورد کرتے کرتے وہ سجدے سے اُٹھا اور کوٹھڑی میں پاگلوں کی طرح رقصنے لگا۔ پھر اس نے اپنا گریبان چاک کر ڈالا اور اپنے چہرے کو طمانچوں سے لال کر دیا۔ چانک اس سیاہ فام نوجوان نے جو صرف ایک جانگھیہ پہنے تھا تبیح پر اپنا ہاتھ روک دیا اور آنکھیں کھول کر طالب کی طرف دیکھ کر بولا ”بابو!“

غم خلق خدا دی علم پڑھدی، اساں کیتا مطالعہ یار دا اے
جہناں کھول کے عشق کتاب ڈٹھی، صیغے صرف دے سب وسار دا اے
جہناں یار دے نال دا سبق پڑھیا، اوتھے جا نہ صبر قرار دا اے
حیدر ملاں نوں فکر نماز دا اے تے اہناں عاشقاں طلب دیدار دا اے
الف آن بُن ہان بن اُن بُن تھیں اک سمجھ اساڈڑی رمز میاں

اور پھر تینوں آرام سے بیٹھ کر ”الف اَن بُن ران بن اُن بُن تھیں اک سمجھ اساڈڑی رمز میاں“ کا ورد میٹھے اور سریلے بولوں میں کرنے لگے۔ طالب اپنی جگہ پر گم سم حیران و پریشان بیٹھا تھا۔ اس ورد کی ہوک سے سارا کمرہ وچتر ونیا کی طرح آہیں بھرنے لگا۔ جب یہ ورد تھما تو سادھو نے دایاں ہاتھ ہوا میں اٹھا کر حنیف سے کہا ”بابا تیرے گھر بھگوان آئے ہیں۔“ حنیف دونوں ہاتھ جوڑ کر طالب کے سامنے بیٹھ گیا۔ طالب نے گھبرا کر کہا۔ ”آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ کل اپنے دوست مسعود سٹینو سے مجھے ملائیں گے لیکن آپ اس کے دفتر پہنچے ہی نہیں۔“

حنیف نے سجدے میں گر کر کہا ”مجھ سے بھول ہوئی سائیں۔ میں تیرا گنہگار ہوں۔ تیرا دین دار ہوں۔ مار چاہے چھوڑ، میں تیرا گنہگار ہوں۔“

طالب نے کھسیانے ہو کر کہا۔ ”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں، آخر آدمی بھول بھی

سکتا ہے۔"

"آدمی ؟" حنیف نے ہنس کر کہا۔ "سائیں جی آدمی! آ ہا ہا ہا ــــ گیانی جی آدمی کیا ہوتا ہے؟" ــــ اور وہ سیاہ فام نوجوان جو تسبیح پڑھ رہا تھا، اسی طرح دیوار سے ٹیک لگائے بولا: "آدمی بہت بڑی چیز ہے۔ ہم تو آدمی کے پیر کی دھول بھی نہیں۔"

"نہیں نہیں نہیں۔" سادھو نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور اس کے گجرے کہنیوں تک آگرے۔

پھر حنیف نے سادھو کے پیر پکڑ کر کہا: "باباجی، میرا پیر دیکھا۔"

سادھو نے اس کا کندھا تھپک کر کہا۔ "دیکھا دیکھا۔ من پرسن ہو گیا، کلپنا مٹ گئی۔ ہرے ہرے ہرے۔"

حنیف سادھو کے پاؤں اسی طرح پکڑے ہوئے بولا۔ "سائیں تو میرا مادھو ہے، میرا مادھو لال ہے ــ میرا مادھو لال حسین ہے۔"

سادھو نے آنکھیں بند کر لیں تو حنیف نے اس کے پاؤں پر سر رگڑ رگڑ کر کہنا شروع کیا۔

سائیں تیرے روسڑے، موہے آدر کرے نہ کوئے
دردر کرن سہیلیاں، بیں تر تر تاکوں توئے

پھر اس نے ایک دم پلٹ کر کہا۔ "یہ میرے مادھو لال حسین نے فرمایا ہے۔ میرے لال حسین نے، میرے لال بادشاہ نے۔ بیں تر تر تاکوں توئے۔"

طالب کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ وہ اس دنیا میں ہے یا کسی اور جگ میں پہنچ گیا ہے۔ یہ لاہور ہے یا بندرابن، کاشی ہے یا کرشن نگر۔ جس دن وہ پہلی مرتبہ حنیف سے ملا تھا۔ تو حنیف اچھا خاصا اس کی طرح کا آدمی تھا۔ اس کی جیب میں پلاس تھا، کندھے پر سی ٹی تار کا گچھا تھا اور اس نے نیلے رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی۔ چلتے وقت اس نے اپنا تعارفی کارڈ

بھی طالب کو دیا تھا جس پر محمد حنیف اے ۔ایل ۔ایم لکھا تھا اور تھوڑی دیر کا لبغور مطالعہ کرنے کے بعد طالب نے ڈرتے ڈرتے اس سے اے ۔ایل ۔ایم کا مطلب بھی پوچھا تھا جو شاید غلطی سے ایم ۔ایل ۔اے کی بجائے اے ۔ایل ۔ایم چھپ گیا تھا ۔اس وقت حنیف نے بڑے دوستانہ طریق پر اس کا کندھا تھپک کر کہا تھا "نہیں ، اس کا مطلب اسسٹنٹ لائن مین ہے اور میں واپڈا میں ملازم ہوں ۔" اس کے کوئی ایک ہفتے بعد طالب نے حنیف کو بتی والے چوک پر کھمبے پر چڑھے فیوز لگاتے بھی دیکھا تھا ۔ پر اب تو اس کا نقشہ ہی کچھ اور تھا ۔

طالب کو یوں حیرت میں ڈوبے دیکھ کر سادھو نے کہا ۔ "کیا بات ہے بابا ؟ کیا چنتا ہے تیرے من کو ؟"

طالب نے دل کڑا کرکے کہا ۔ "سادھو جی ! مجھ پر اس آشرم کا بھید نہیں کھلا ۔"

گیانی نے دیوار سے ٹیک توڑ کر کہا ۔ "جب تک من اور تن میں چھپنا چھپٹی رہے گی یہ بھید ہی رہے گا ۔جب تک من کی کوک ، فریاد نہ ہو گی یہ کواڑ بند ہی رہیں گے ۔ بابا جی فرماتے ہیں : کوک فریدا کوک توں جیوں ٹانڈا اجوار ، جب لگ ٹانڈا نہ گرے تب لگ کوک پکار ۔ " کوک پکار کا نام سن کر حنیف فریاد کرنے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ بہہ نکلا ۔اس نے روتے روتے طالب کا ہاتھ تھام کر کہا ۔ "سائیں میں کیا ہوں ؟ کچھ بھی نہیں ہوں ناں ۔یہ سب مایا ہے ناں ، یہ وجود فانی ہے ناں ——— بول سائیں ——— بول ——— تو آج اگر جلدی آ جاتا تو تجھے اپنے پیر سے ملاتا ——— کیوں گیانی جی ؟" گیانی نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔ "بڑی تڑپ دے گیا ہے تیرا پیر ۔ تیرا کیا ، ہم سب کا پیر ——— ہائے ہائے نہ لاہور میں کوئی اسٹیشن ہوتا ——— نہ گاڑی ہوتی ——— نہ گاڑی ہوتی نہ رکتی ——— نہ ہم پیر کی زیارت کرکے دل کو زخم لگاتے ۔ اک اونکار ——— اک اونکار ———"

پھر سادھو اٹھ کر کھڑا ہو گیا ۔ اس نے ہاتھ باندھ کر کہا ۔ "میں مٹھ کو اشنان کرا دوں ۔"

حنیف نے اس کے پیر پکڑ کر کہا۔" نہ سائیں تیرے چاکر موجود ہیں، تیرے گولے حاضر ہیں۔"
سادھو نے جھک کر اس سے اپنے پیر چھڑاتے ہوئے کہا۔" اوم شانتی شانتی۔" اور کھڑاویں پہن کر باہر صحن میں نکل گیا۔

حنیف نے گیانی کے آگے ہاتھ باندھ کر کہا۔" گیانی جی! آج ان کو بڑی تکلیف ہوئی۔ اس دھوپ میں یہ ہمارے یہاں آئے، مجھ سے بھول ہوئی جو میں وقت پر وہاں نہ پہنچ سکا۔ یہ اس کا روپ ہے اور میری وجہ سے اس کو ـــــ اس بڑی سرکار کو تکلیف ہوئی۔"
گیانی نے آنکھیں بند کر کے سر پیچھے ڈھلکا دیا اور کہا۔" پراتیچت پراتیچت توبہ استغفار۔ سوچ بابا لوک تو نے کیا کیا۔"

طالب نے کہا۔" نہیں جی مجھے تو کوئی ایسی تکلیف نہیں ہوئی، میں سارا دن اسی طرح تو مارا مارا پھرتا ہوں۔"

" ہائے ہائے ہائے،" گیانی نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔" ہمارا بابا لوک حضرت سینٹ فرانسس بھی تو اسی طرح مارا مارا پھرتا تھا۔ ولیوں کا ولی ـــــ بندوں کا بندہ ـــــ بابا لوک تو مارا مارا پھرتا ہے تو تو بھی ولی ہے۔"

حنیف نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پہ باندھ لیے اور بے خودی کے عالم میں بولا۔ "میری ماں ـــــ میری بی بی حضرت رابعہ بصری بھی تو اسی طرح ماری ماری پھرتی تھی۔ حضور نے فرمایا ـــــ" گیانی نے اک دم ٹوکا۔" ناں ناں ناں حضور کا نام یہاں نہ لینا۔ ہم دنیا کے کتے ـــــ تو بھی ـــــ مایا کے بندے نہ بابا لوک ـــــ دل کی میل دور کر کے یہ نام لینا ـــــ نہ بابا لوک ـــــ" حنیف نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور اس پر رقت طاری ہو گئی۔

باہر نل سے پانی کے تیز دھارے کی آواز آنے لگی۔
گیانی نے کہا۔" سادھو رات کا جاگا ہے بابا لوک۔"

حنیف نے اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر بٹھا لیا اور کہا۔ "گیانی جی، چاکروں کے ہوتے ہوئے مالک کام نہیں کرتے۔"

"مالک" گیانی نے اپنے آپ کو دیکھ کر کہا۔" مالک ——— میں مالک ——— مجھے طعنہ دیتے ہو بابا لوک، ٹھیک کہتے ہو ——— ٹھیک کہتے ہو ———"

اس نے پھر دیوار کے ساتھ ٹیک لگالی۔ آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے اس کے رخساروں پر ڈھلکے اور پھر نیچے لڑھک گئے۔

اب باہر سے سادھو کی آواز آرہی تھی۔ وہ کھڑتالیں بجا رہا تھا۔ اور میرا کا بھجن مدھم سُروں میں گا رہا تھا۔ پانی کا دھارا اور تیز ہو گیا اور باہر دھوپ کی روشنی منڈیروں پر جا پہنچی تھی۔ طالب نے ڈرتے ڈرتے گیانی کا زانو ہلایا۔ گیانی نے آنکھیں کھول دیں۔

طالب نے پوچھا۔ "گیانی جی یہ سب کیا ہے؟ میں کیا ہوں ——— تم کون ہو؟"

"یہ سب مایا ہے۔" گیانی نے آرام سے کہا۔ "تم اینٹ پتھر کی دنیا میں ہو ——— ہم لوبھی ہیں، کرودھی ہیں، اہنکاری ہیں۔"

طالب نے کہا۔ "گیانی تم کہاں رہتے ہو؟ کس دیس سے آئے ہو؟ کیا کام کرتے ہو؟"

گیانی نے کہا۔" بابا لوک! ہمارا گھر نہیں گھاٹ نہیں ——— کوئی دیس نہیں بھیس نہیں ——— ہم کونج ہیں بابا لوک ——— ہر دم آگے ——— ہر دم آگے ———

طالب نے پھر جھکتے ہوئے پوچھا۔" یہ تم کام کیا کرتے ہو گیانی؟"

"ہم چپراسی ہیں بابا لوک۔ اس ساتھ کی بستی میں نوکری کرتے ہیں ——— صاحب کا پھاٹک کھولتے ہیں، بند کرتے ہیں ——— پر سچا صاحب ہمیں منہ نہیں لگاتا ——— میرے بابا سائیں فرماتے ہیں: فریدا چنت کھٹولا دان وکھ برہا وچھاون لیف ایہہ ہمارا جیونا توں صاحب سچے دیکھ ———" طالب نے کہا۔" لیکن تم تو صوفی ہو ——— سالک ہو ———

بزرگ ہو۔"

گیانی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔" ناں ناں ناں۔" اس نے چیخ کر کہا۔"ہم لو بھی ہیں، کامی ہیں، اہنکاری ہیں —— تم اچھے ہو بابا لوک، ہم اپنے اپنے چور چھپاتے پھرتے ہیں۔ تم ظاہر باطن ایک ہو۔"

طالب نے کہا" اور سادھو کا کیا نام ہے؟"

گیانی نے کان چھو کر کہا" سادھو سید زادہ ہے بابا لوک، ہم اس کا نام نہیں لے سکتے —— اس کا درجہ بہت بڑا ہے۔ جاؤ جاؤ بابا لوک باہر بگیا کی ہوا کھاؤ —— من شانت کرو۔"

طالب نے اس کے قریب دو زانو ہو کر کہا" گیانی، میں بھی اس آشرم میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔" اس کا دل گیانی کے قدم چھونے کو چاہتا تھا لیکن اسے حوصلہ نہ ہوا۔

گیانی مسکرایا —— پھر ہنسا —— اور دیر تک ہنستا رہا —— باہر سادھو میرا کا بھجن گا رہا تھا اور اب اس پر حنیف کی خوبصورت قرأت غالب آنے لگی تھی۔ وہ خالص مصری لہجے میں "سورۃ یٰسین" کی قرأت کر رہا تھا۔

طالب نے ڈرتے ڈرتے گیانی کے پیر چھو کر کہا" سائیں!"

گیانی نے اپنے پیر پیچھے کھینچ لیے اور کہا" مایا ہے، سب مایا بابا لوک — تم ٹھیک ہو، صحیح راستے پر ہو۔"

طالب نے کہا" گیانی! میں جان دے دوں گا لیکن لیکن ——" اور پھر اس کی آواز بھرا گئی۔

گیانی نے انگلی اوپر اٹھا کر کہا" ایک!"

طالب نے دہرایا" ایک۔"

گیانی پھر بولا" ایک۔"

طالب نے کہا ۔"ایک ۔"

گیانی تڑپ کر کھڑا ہو گیا اور ایک انگلی فضا میں کھڑی کرتے ہوئے بولا۔

"ایک اونکار باست نام، کرتا پرکھ، نربھو نردیر، اکال مورت، اجونی سے بھنگ گور پرساد! آد سچ جگاد سچ، ہے بھی سچ، نانک، ہوسی بھی سچ۔" اور پھر وہ اپنی انگلی کو فضا میں اسی طرح اٹھائے باہر آنگن میں نکل گیا۔

طالب کتنی دیر اس کوٹھڑی میں چٹائی پر بیٹھا اردگرد دیواروں کو تکتا رہا۔ جب وہ باہر نکلا تو دھوپ جا چکی تھی۔ آنگن میں ٹھنڈک تھی اور گلاب اور موتیے کے دھلے دھلائے پھول مہک رہے تھے۔

سادھو اپنے گیروے رنگ کے ابرن میں، پانی ڈوبی گھاس میں بیٹھا خاموش جپ کر رہا تھا۔ حنیف نل کے پاس اوندھے منہ لیٹا تھا اور اس کے تڑپنے سے بہت سا گارا اس کی پنڈلیوں، پاؤں اور ہاتھوں سے چمٹا ہوا تھا۔ اس نے اپنا ماتھا بار بار زمین پر مارا تھا اور وہاں خون کا ایک بڑا سا دھبہ تھا۔ گیانی نل کے منہ پر پلاسٹک کی سبز ٹیوب چڑھائے، پودوں کا منہ دھلا رہا تھا اور گھروں کی عقبی دیواروں کو جوان کی گیا کی چار دیواری بناتی تھیں، پانی کے فوارے سے ٹھنڈی کر رہا تھا۔ طالب چوبڑ کی روش پر دو زانو بیٹھ گیا۔ اس کے کپڑوں پر دیواروں سے ٹکرانے والے چھینٹے آ کر گر تے تھے، پر وہ خوش تھا۔ ایک طرح کی عجیب ٹھنڈک تھی جو اس کے دل و دماغ کو تازہ کر رہی تھی۔ اس میں جسمانی آسودگی کم تھی، روحانی ٹھنڈک زیادہ تھی اسے کچھ یوں محسوس ہونے لگا کہ اس جلتی جھلستی دنیا میں بس ایک ہی نخلستان ہے کہ جہاں بیٹھ کر آدمی بڑے گہرے اور بڑے دیرپا دکھ سمیٹ سکتا ہے جن کی لذت کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔

سیلی سیلی زمین کی کچی کچی ٹھنڈک اور پانی میں رچی ہوئی سرخ سرخ دیواروں سے پلٹ کر اس پر گرنے والے چھینٹے اسے اڑائے لیے جاتے تھے۔ اس زمین سے اوپر،

پھاٹک کے اوپر، برجیوں کے اوپر، اس چھجے کے اوپر وہی لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے جوڑے کا گجرا ایک طرف سے کھل گیا تھا اور اس کے بٹنوں کی زنجیر چاند کی ٹھنڈی کرن بن کر اس کے سینے سے چمٹی ہوئی تھی۔ طالب نے اسے دیکھا اور پھر دیکھتا چلا گیا۔ وہ تصوف کی غلام گردش میں ابوسعید ابوالخیر کی رباعی کی طرح منور کھڑی تھی۔

طالب نے ہاتھ اُٹھا کر کہا "یہ نروان ہے ——" پانی کے شور میں گیانی کو کچھ سنائی نہ دیا تو طالب نے چلا کر کہا "گیانی! یہ نروان ہے۔" گیانی کی نگاہیں ادھر اُٹھیں تو اس نے چیخ مار کر ٹیوب چھوڑ دی اور "مایا —— مایا —— موہ، موہ" کی چیخیں مارتا اندر کوٹھڑی میں گھس گیا۔ سادھو ہری جاپ کرتا اندر بھاگا اور حنیف بے خودی کے عالم میں لڑکھڑاتا ہوا طالب کے پاس سے گزر کر مٹھ کے اندر چلا گیا۔

طالب کتنی ہی دیر تک بیٹھا ادھر اُدھر دیکھتا رہا اور پھر منور غلام گردش میں اندھیرا چھا گیا۔

اندر تینوں تپسوی توبہ استغفار اور پرائسچت میں مصروف تھے۔ ان کی آہوں اور کراہوں سے کوٹھڑی گونج رہی تھی۔ طالب اپنا سر زانوؤں میں دبا کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اب اس کا دل ملامت کر رہا تھا کہ اس نے بھی بھاگ کر مٹھ میں کیوں پناہ نہ لی۔ وہ ٹھنڈک اور وہ شبنمیں رسماہٹ جو اس کے وجود کو نصیب ہوئی تھی اس سے کوسوں دور بھاگ چکی تھی اور وہ ایک مرتبہ پھر بھری دنیا میں اکیلا اور بے یار و مددگار ہو گیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر صوفیوں میں سے کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس وقت اپنے آپ سے بہت دور تھے۔

وہ پھر سر زانوؤں میں دبا کر بیٹھ گیا اور اپنے کیے پر پچھتانے لگا۔ یوں بیٹھے بیٹھے کتنی ہی مدت بیت گئی اور پھر جیسے اس نے اپنی پشت پر ایک چھوٹے سے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ اس دباؤ میں گرمی بھی تھی اور ٹھنڈک بھی۔ کچھ حجاب بھی تھا اور ذرا

سی بے تکلفی بھی۔ اس نے سر اُٹھا کر اور پیچھے مڑ کر دیکھا، رانی سر جھکائے کھڑی تھی۔
طالب کی سرخ سرخ آنکھوں کو دیکھ کر وہ سہم سی گئی۔ پھر حوصلہ کر کے بولی ۔
"باجی آئی ہیں۔"
"کون باجی؟" طالب نے تڑپ کر پوچھا۔
"باجی" اس نے وثوق سے کہا۔ "میری باجی۔"
باہر چوپڑ کی روش پر، مٹھ کے پاس باجی سفید قمیص اور سفید دوپٹہ اوڑھے کھڑی تھی۔ بگیا میں اب موتیے کی خوشبو تیز ہو گئی تھی۔ اس نے سر اوپر اٹھائے بغیر کہا۔ "میں نے کئی مرتبہ یہاں آنے کی ہمت باندھی لیکن مجھے کبھی حوصلہ نہ ہوا۔ آج آپ کو یہاں دیکھ کر میں نے یہ جرأت کر ہی لی۔ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔"
"کن سے۔" طالب نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
"ان میں سے کسی سے بھی ۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید ان سے بات کر کے مجھے سکون نصیب ہوگا۔ مجھے ذہنی آسودگی میسر آئے گی اور ـــــ اور ـــــ"
"لیکن" ـــــ طالب نے بات کاٹ کر کہا۔ "یہ لوگ آپ سے ہرگز نہیں ملیں گے"
باجی نے التجا بھرے لہجے میں کہا۔ "آپ ان سے درخواست تو کر دیکھیں ـــــ شاید ـــــ شاید ـــــ" اور پھر اس نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔
طالب نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے ناں، یہ آپ سے ہرگز بات نہ کریں گے۔"
باجی ہولے سے بولی۔ "آپ کو دیکھ کر ایک ہلکی سی اُمید بندھی تھی۔ وہ بھی ٹوٹ گئی۔" پھر اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ "پتہ نہیں یہ سب حیرت کی بنا پر ہے یا نامانوس ماحول کی وجہ سے ـــــ مجھے ان سے ملنے کی بڑی آرزو تھی ـــــ اب بھی ہے اور پتہ نہیں کب تک رہے گی ـــــ اور پھر پتہ نہیں آدمی خود کب تک رہتا ہے ـــــ چل رانی چلیں ـــــ" وہ مڑنے لگی تو اندر سے حنیف کی آواز آئی۔

"کیا بات ہے بابا ــــ کون ہے ؟"

طالب نے کہا ۔" رانی کی باجی آئی ہے ــــ وہ آپ لوگوں سے ملنا چاہتی ہے ۔"

" ہری ہر ــــ ہری ہر ــــ" سادھو نے کہا ۔" کیا بات ہے ماتا ۔ کیوں ملنا چاہتی ہو ؟" باجی خاموش رہی تو سادھو نے پکار کر کہا ۔" چنتا ماتا بولو ۔"

" بولو میری بہن ــــ میری ماں ــــ میری بیٹی ، کیا بات ہے ؟" حنیف نے پوچھا ۔

" کچھ نہیں ۔" باجی نے ہولے سے کہا ۔" کچھ نہیں ۔"

گیانی نے پکار کر کہا ،" ماتا تو مایا ہے ــــ تو قدم قدم پر چک پھیری دیتی ہے ۔ ہم سادھو ہیں ، درویش ہیں ۔ ہم اس گورو کے چیلے ہیں جو اسیسی کی پہاڑیوں میں صلیب اٹھائے مارا مارا پھرتا تھا ــــ بول ماتا ۔"

" بول ماتا " سادھو نے کہا ۔" ہم تیرے ہاتھ جوڑتے ہیں ، ہمارے آشرم میں تیرا کیا کام ؟" باجی سر جھکائے خاموش کھڑی رہی !

" بول چنتا منی " حنیف نے کہا ۔" بول چنتا ماتا ۔ اگر تجھے پسند نہیں تو ہم یہ آشرم چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں گے ــــ تو ماتا ہے ، تیری ہر آگیا کا پالن ہمارا دھرم ہے ۔"

سادھو نے کہا ۔" ہم یہ آشرم چھوڑ دیں ــــ" " نہیں ــــ نہیں " باجی نے رو کر کہا ۔" نہیں میں یہاں پھر نہیں آؤں گی ۔ اس آشرم میں پھر قدم نہیں رکھوں گی ۔" یہ کہتے ہوئے وہ رانی کی انگلی تھام کر پھاٹک سے باہر نکل گئی ۔

طالب نے ڈرتے ڈرتے مٹھ میں قدم رکھا تو تینوں سادھوؤں کو سکتے کے عالم میں پایا ۔ وہ کوٹھڑی کی دہلیز سے لگ کر کھڑا ہو گیا ۔ دور گرجے کا گھڑیال گونجنے لگا ۔ گیانی نے آنکھیں کھول کر اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور گمبھیر آواز میں کہنے لگا ۔

Ave maria **piena** di grazia il signor con te. Tu sei **benedetta** fra **le** donne e benedetto e **il** frutto del ventro tuo Gesu."

اور اس شام طالب کو حنیف کے دوست مسعود سٹینو کے لیے حنیف سے جو تعارفی خط لینا تھا وہ اسے لیے بغیر آشرم کا دروازہ آہستہ سے کھول کر اور دھیرے سے بند کر کے گھر چلا آیا۔

کوئی تین ماہ بعد شیخوپورہ سے واپسی پر جب طالب کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ مسعود سٹینو کی امداد اس کا نصف سے زائد کام سرانجام دے دے گی تو وہ ایک مرتبہ پھر حنیف کے دفتر گیا۔ لیکن حنیف سے اس کی ملاقات نہ ہو سکی۔ آشرم جانے سے وہ کتراتا تھا، اس لیے اس نے ملاقات اگلے دن پہ ملتوی کر دی۔ اگلے دن دفتر سے پتہ کر کے وہ سیدھا اس جگہ پہنچ گیا جہاں نئے سب اسٹیشن پر حنیف کی ڈیوٹی لگی تھی۔ لائن مین نے طالب کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر پوچھا۔ "جناب کہاں سے تشریف لائے ہیں۔"

"یہیں سے۔" طالب نے کہا۔ "لاہور سے۔"

لائن مین نے ذرا سے توقف کے بعد کہا۔ "حنیف تو گھر چلا گیا، چھٹی لے کر، اس کی طبیعت خراب تھی۔"

"طبیعت خراب تھی۔" طالب نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں بس طبیعت ہی خراب سمجھو —— بادشاہ آدمی ہے۔" لائن مین نے مسکرا کر کہا۔

طالب کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ سیدھا آشرم جائے اور حنیف سے مسعود سٹینو کے نام چٹھی حاصل کرے۔

ابھی کرشن نگر کی بڑی سڑک سے گلی کا موڑ مڑا ہی تھا کہ اس کی مٹھ بھیڑ رانی سے ہو گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر شرارت سے رانی کا سر سہلایا اور کہا۔ "بھوتنی اتنی دوپہر میں کہاں جا رہی ہو؟"

"دہی لینے"۔ رانی نے سر جھکا کر جواب دیا۔ طالب نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا: "باجی کا کیا حال ہے؟"

"وہ تو مر گئیں۔" رانی نے اپنی ٹھوڑی اپنے سینے میں پیوست کر لی۔

طالب کے سامنے اس تپتی دوپہر میں بجلی کا ایک کوندا تڑپا اور اسے ساکت و جامد چھوڑ گیا۔ کتنی دیر تک رانی ہاتھ میں سلور کا کٹورہ لیے کھڑی رہی۔ طالب نے اس کے سر پر سے ہاتھ اٹھا کر پوچھا۔ "کیسے؟"

"ایک دن" رانی نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ "ایک دن سکول سے پڑھا کر آئیں۔ گھڑے سے ٹھنڈا پانی پیا اور بستر پر بیٹھتے ہی ایک چیخ ماری —— پھر وہ مر گئیں —— ایک منٹ کے اندر اندر۔"

طالب نے کہا۔ "تمہارے ابا نہیں تھے گھر پر۔"

"جی نہیں۔" رانی نے سر ہلا کر کہا۔ "میرے ابا تو شہید ہو چکے ہیں جی۔"

"اور دوسری باجی وہ جو ——" طالب نے بات پلٹنا چاہی۔

"جی میری اور تو کوئی باجی نہیں۔" رانی نے جواب دیا۔ "بس میں رہ گئی ہوں۔ اکیلی۔"

طالب اس لڑکی کو جھلستی دوپہر میں اسی طرح سلور کا کٹورہ ہاتھ میں تھامے چھوڑ کر کچھ کہے سنے بغیر آشرم کے پھاٹک پر پہنچ گیا۔

آشرم کا پھاٹک کھلا تھا۔ عشق پیچاں کی بیل میں کاسنی پھول لگے تھے۔ چوپڑ کی روشوں کے گرد گھاس کے قطعوں میں گھاس ڈبا ڈبا پانی کھڑا تھا اور موتیے اور گلاب کے پھول دھوپ کی

حدت سے سنولائے ہوئے تھے۔

طالب مٹھ کے دروازے پر پہنچا۔ اندر سادھو، گیانی اور حنیف تپائی بیچ میں رکھے فلاش کھیل رہے تھے اور ان کے درمیان نئے نئے سکوں اور روپے روپے کے نوٹوں کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔

"آؤ آؤ" سادھو نے خالص فلمی لہجے میں کہا۔ "آ جاؤ۔"

"ہو جائے ایک بازی کٹ تھرورٹ" گیانی چلایا۔

حنیف طالب کی پذیرائی کے لیے آگے بڑھا۔ لیکن طالب دہلیز کے ساتھ ٹیک لگا کر پتھر کی مورتی بن گیا۔ اس نے پہلے سب کو ایک ایک کر کے دیکھا، پھر چھت کی طرف نگاہیں دوڑائیں پھر گردن گھما کر باہر کی طرف دیکھا۔۔۔ مکان بھی وہی تھا، مکین بھی وہی تھے۔۔۔ جغرافیہ بھی وہی تھا۔۔۔ لیکن تماشا دیکھنے والی آنکھ باقی نہ رہی تھی!

محسن محلہ

کسی کو ٹھیک سے معلوم نہیں کہ ماسٹر الیاس کب اس محلہ میں آیا تھا اور کب اس نے یہ کوٹھڑی کرائے پر لی تھی۔ لیکن اس بات کا ہر ایک کو علم تھا کہ ماسٹر الیاس مہاجر ہے۔ اور اس کا تعلق انبالے کے کسی علاقے سے ہے کیونکہ وہ بولی ہی ایسی بولتا ہے جو انبالے پٹیالے میں بولی جاتی ہے۔

ماسٹر الیاس کرایے کی کوٹھڑی میں رہتا تھا اور اس کے پاس محلے کے لڑکے گنتی سیکھنے پہاڑے کہنے اور تختی لکھنے کے لیے آجاتے تھے۔ اس کے پاس دو لٹا کا بٹیر اور ایک اصیل مرغا تھا۔ بٹیر تو پنجروں میں بند رہتے تھے لیکن اصیل مرغا اس کی کوٹھڑی کے دروازے سے ذرا دور کھڑا رہتا تھا۔ ماسٹر الیاس نے مرغے کی ایک ٹانگ میں پیتل کا چھلا ڈال کر اس سے اسی کی مضبوط ڈور باندھ رکھی تھی اور اس ڈور کا دوسرا سرا اپنی کوٹھڑی کی دہلیز میں میخ ٹھوک کر اس سے باندھ رکھا تھا۔ محسن محلہ کے سبھی لوگ ماسٹر الیاس کی عزت کرتے تھے اور اس کو سلام علیکم کہہ کر اس کے دروازے کے آگے سے گزرتے تھے۔ ماسٹر جی کچھ اور کام بھی کرتے تھے لیکن کسی کو اس کا علم نہیں تھا۔ شاید وہ سبزی منڈی میں منشی گیری کرتے تھے یا کسی دور کے محلے میں پھیری لگاتے تھے یا کسی کارخانے میں رنگ روغن کی دیہاڑی کرتے تھے۔ کوئی اس کی بابت اچھی طرح سے نہیں جانتا تھا لیکن اتنا سب کو معلوم تھا کہ ماسٹر الیاس کی گزر بسر ذرا تنگی ترشی سے ہی ہوتی ہے۔

دراصل ماسٹر صاحب سیدھے آدمی تھے اور ان کو زمانے کے ساتھ چلنے کا ڈھنگ

نہیں آتا تھا۔ کچھ تو ان کی شکل ہی ایسی تھی کہ اسے دیکھ کر لوگوں کے دل میں محبت یا ہمدردی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا تھا اور کچھ ان کی گفتگو اس انداز کی ہوتی تھی کہ کسی کو اس پر یقین نہیں آتا تھا۔ وہ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ ہیرا پھیری نہیں کرتے تھے۔ مبالغے سے کام نہیں لیتے تھے۔ شیخی نہیں بگھارتے تھے۔ کسی کو خوفزدہ نہیں کرتے تھے۔ اسی وجہ سے کسی کو ان کی بات پر یقین نہیں آتا تھا۔ ان کی گفتگو میں گرامر کی اور علم بیان کی بہت سی غلطیاں ہوتی تھیں اور سننے والا جلا کر ان کی صحبت چھوڑ دیتا تھا۔ وہ اتنے سیدھے اور اس قدر بے پیچ تھے کہ انسان ہی نہیں لگتے تھے۔ سارے محلے پر اور ساری سوسائٹی پر ایک بوجھ سا لگتے تھے اور چونکہ ایسے لوگوں کے ساتھ رسم و راہ پیدا کرنا کوئی بھی پسند نہیں کرتا اس لیے کوئی بھی ان کا دوست نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ محلے والے ان کی عزت کرتے تھے اور ان کے دروازے کے آگے سے گزرتے ہوئے السلام علیکم کہہ کر آگے بڑھتے تھے۔

سردیوں کی ایک شام مالک مکان نے ماسٹر الیاس کو بڑے سخت الفاظ میں ڈانٹا اور دھمکی دی کہ اگر اس نے تین دن کے اندر اندر پچھلے چھ ماہ کا کرایہ ایک ساتھ ادا نہ کیا تو وہ اس کا سامان نکال کر باہر پھینک دے گا۔ ماسٹر جی کی خوف کے مارے گھگھی بندھ گئی۔ کیونکہ ان کے پاس ایک سو اسی روپے یکمشت موجود نہیں تھے۔ صرف چالیس روپے تھے۔ جن کے ساتھ دس کا ایک نوٹ اور پرو کر انہوں نے پچاس بنا لیے تھے۔ پہلے تو مالک مکان پچیس تیس، چالیس پچاس لے کر آگے کی تاریخ دے دیا کرتے تھا۔ لیکن اس مرتبہ وہ تڑ تنگ ہو گیا اور اس نے دھاگے میں پروئے ہوئے پچاس روپے اصیل مرغے کے آگے پھینک کر کہا۔ "جا او ئے! میں نہیں لیتا۔ مجھے پورے ایک سو اسی کر کے دے۔"

جب وہ یہ کہہ کر چلا گیا تو ماسٹر الیاس نے پچاس روپے فرش پر سے اٹھا کر اپنی واسکٹ کی جیب میں ڈال لیے۔ پھر وہ اپنی کوٹھڑی کے اندر جا کر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ چونکہ

وہ اظہار کے معاملے میں کمزور تھے اس لیے ان کو رونا بھی نہیں آتا تھا۔ دکھی سے ہو کر بیٹھ گئے۔ اور شدید غم کے باعث ان کی گھگھی بندھ گئی اور یہ پہلا موقع تھا کہ روئے بغیر کسی شخص کی گھگھی بندھی ہو!

وعدے کے مطابق مالک مکان نے ان کا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ ماسٹر صاحب کی چارپائی ٹرانسفارمر والے دو کھمبوں کے پیچھے لگا دی اور ان کا باقی سامان اس کے ارد گرد چن دیا۔ اس نے کوٹھڑی کو نیا چینی تالا لگایا اور سکوٹر پر سوار ہو کر اپنے گھر چلا گیا۔ اس کا گھر اس محلے سے کافی دور تھا اور وہ اپنی کوٹھڑیوں کا کرایہ وصول کرنے ماہ بماہ آیا کرتا تھا۔

ماسٹر صاحب نے ایک رات جوں توں کر کے ٹرانسفارمر کے نیچے گزاری اور اگلے دن شیخ کریم نواز کی حویلی پہنچ کر اس سے دو سو روپے ادھار کے طلب گار ہوئے۔ شیخ صاحب نے ماسٹر صاحب کو نیک دل، سادہ لوح اور مرنجان مرنج شخص سمجھ کر ٹرخا دیا۔ کیونکہ ایسے احمق لوگوں کو زیادہ رقم دینا اچھا نہیں ہوتا۔ پھر وہ اسماعیل بزاز کی دوکان پہ گئے اور رقم میں کمی کر کے ڈیڑھ سو کا سوال ڈالا۔ اس نے بھی معذرت کر لی۔ محلے کا کوئی نائی حلوائی قصائی ڈاکٹر وید وکیل ماسٹر صاحب نے نہیں چھوڑا۔ لیکن ہر طرف سے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ ان لوگوں کو شدید مہنگائی نے گھیر رکھا تھا اور ان کے پاس ادھار دینے کو کچھ بھی باقی نہ تھا۔

جس دن ماسٹر الیاس نے ہومیوپیتھک ڈاکٹر کو اپنی نبض دکھائی۔ اس روز انہیں ٹرانسفارمر کے نیچے سوتے آٹھواں دن تھا۔ ڈاکٹر نے سٹیتھوسکوپ لگا کر دیکھا اور کہا ماسٹر صاحب نمونیہ ہے میں آپ کو پڑیا تو دے دیتا ہوں لیکن آپ کسی اور کو بھی دکھا لیں۔ ماسٹر صاحب نے کہا "بہت اچھا" اور گرم دودھ پینے جبّار حلوائی کی دوکان پہ چلے گئے۔ انہوں نے دودھ پی کر اپنی نبض جبّار کو دکھائی اور پھر گڑگڑا کر اس سے دو سو روپے قرض کی درخواست کی۔ جبّار ہنس پڑا۔ اس کو پتہ تھا کہ ایسے الو کو کوئی ایک روپیہ

بھی ادھار نہیں دے سکتا۔ یہ پورے دو سو مانگ رہا ہے۔ جب ایسی انہونی بات ہو تو ہر ایک کو ہنسی آ جاتی ہے اور اسی وجہ سے جبار ہنس پڑا تھا ورنہ عام زندگی میں وہ بہت ہی کم ہنستا تھا۔

مسلسل تین دن تک ماسٹر الیاس اپنی رضائی سر پہ اگلو کی طرح اوڑھ کر چارپائی پر بیٹھے رہے جو کوئی وہاں سے گزرتا "السلام علیکم" کہہ کر یہ ضرور پوچھتا۔ "کیوں جی ماسٹر جی دھوپ سینکی جا رہی ہے" اور ماسٹر جی اندر سے بند آواز میں جواب دیتے۔ "ہاں جی تھوڑی سردی لگ رہی تھی۔"

چوتھے روز فجر کی اذان کے وقت جب ماسٹر صاحب فوت ہو گئے تو محسن محلہ کا ایک ایک شخص کو ان کی موت کا بڑا صدمہ ہوا۔ ناشتہ کا وقت ختم ہونے تک ہر شخص خاموشی اور دکھ کے کوئے میں لپٹ کر دھوپ میں جا کھڑا ہوا۔ ماسٹر جی کے بٹیروں کو کٹورہ بھر کنگنی اور ان کے مرغے کو آٹے کی آبخورہ بھر گولیاں ڈال گئیں۔ شیخ کریم نواز صاحب اپنی حویلی سے نکل کر ٹرانسفارمر کے نیچے آ بیٹھے۔ یہاں لوگوں نے بڑی سی دری بچھا دی اور دو تین تازہ اخبار لا کر رکھ دیے۔ لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے۔ شیخ کریم نواز نے دو سو روپے نکال کر سعید اور بلال کو سکوٹر پہ بھیجا کہ جا کر قبر کا بندوبست کریں۔ تین سو روپے بابو جلال کو دیے کہ رحمت کو ساتھ لے جا کر لٹھے کا فور عرق گلاب اور پھولوں کا بندوبست کریں۔ جبار حلوائی نے دودھ پتی کا ایک پتیلا کاڑھ کر صف پہ پہنچا دیا — لوگوں نے ماسٹر صاحب کی رسم قل کے لیے پیسے جمع کرنے شروع کیے اور دیکھتے دیکھتے محسن محلہ کے لوگوں نے آٹھ سو گیارہ روپے جمع کر کے شیخ کریم نواز صاحب کے پاس محفوظ کرا دیے۔

پانچ میل دُور

طاہر کو یہ کارڈ ملے کوئی ایک ہفتہ ہو گیا تھا اس نے اسے سینکڑوں مرتبہ پڑھا تھا۔ ہر وقت جیب میں پڑے رہنے کی وجہ سے اس میں بیسیوں شکنیں پیدا ہو گئی تھیں۔ دفتر کے بڑے بڑے کہنہ رجسٹروں میں شرح پیدائش و اموات کی خانہ پُری کرتے ہوئے اس نے اکثر اس کارڈ کو بڑے آرام سے نکال کر پڑھا تھا اور بے خیالی میں ہر بار روشنائی کے دو تین دھبے اس پر گرا کر پھر جیب میں ڈال لیا تھا۔ آج بھی یہی کارڈ اس کی گود میں پڑا تھا۔ اس پر سیاہی کے دھبے اور تیل کے داغ تعداد میں حروف سے بازی لے گئے تھے۔

شور مچاتی، سڑک چاٹتی ہوئی بس پہاڑیوں پر چڑھ رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ میں نے کیڈٹ اجمل کی عمر کا جھوٹا سرٹیفکیٹ دیتے ہوئے جو دس روپے کی رشوت لی تھی۔ وہ جائز تھی یا ناجائز۔ ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ بس رکوا کر اتر جائے اور اپنے شہر جا کر میونسپلٹی کے سیکرٹری سے کہہ دے کہ میں نے دس روپے رشوت لے کر جھوٹا سرٹیفکیٹ بنا دیا تھا۔ میرے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو دیگر رشوت لینے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے لیکن فوراً ہی اس نے اپنے آپ کو یہ سمجھا کر تسلی دے لی کہ یہ میری پہلی اور آخری رشوت ہی تو ہے۔ اس کے بعد نہ ایسا کارڈ آئے گا نہ میں ایسے جرم کا مرتکب ہوں گا اور پھر جب یہ دس روپے تنخواہ ملتے ہی غریبوں میں تقسیم بھی تو کر دوں گا کیا ہوا جو میں نے ایک امیر زادے سے چند روپے لے کر اس کا کام کر دیا۔ میں نے خود تو نہیں مانگے تھے اس نے آپ ہی آپ میرے ہاتھ میں تھما دیے تھے۔ طاہر نے باقی کے کارڈ پہ آخری نگاہ ڈالی اور پھر اسے اپنی اچکن کی جیب میں ڈال لیا جس میں ایک ایک روپے والے پانچ نوٹ پڑے تھے۔

غل مچاتی بس مری کی اُونچی پہاڑیاں چڑھ رہی تھی اور گہری سرسبز وادیوں میں سفید دھوئیں جیسے بادل اِدھر اُدھر بے مقصد تیر رہے تھے۔ طاہر نے ایک نظر ننھے منے جھونپڑوں والی عمیق وادی پر ڈالی اور پھر سامنے کے شیشے میں سے بل کھاتی کروٹیں بدلتی سرمئی سڑک کو دیکھنے لگا جو چند گزوں کے فاصلے پر کسی پہاڑی کے قدموں سے لپٹ کر ختم ہوتی دکھائی دیتی تھی۔ اب وہ مری سے صرف پانچ میل دور رہ گیا تھا۔ اس نے اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ڈرائینگ روم کے دروازے کو انگلی سے بجایا اور کندھے پر پڑے ہوئے کمبل کو ٹھیک کر کے انتظار کرنے لگا

"بانی نے آ کر پوچھا" کون ہے ؟"

"میں ہوں۔ طاہر" اور اس کی آواز حلق میں ویزلین کے ملغوبے کی طرح جم گئی۔

بانی دروازہ کھولے بغیر نعیم کو آوازیں دینے لگی۔

" ادھر آؤ نعیم۔ کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ ابا جان کو پوچھنے آیا ہے"۔

اور جب نعیم نے دروازہ کھولا تو وہ خوشی سے چلا اٹھی" یہ تو طاہر بھائی ہیں۔ میرے طاہر بھیا"۔ اور وہ طاہر کو یونہی حیران و پریشان دروازے میں چھوڑ کر امی امی پکارتی دوسرے کمرے میں بھاگ گئی، بانی دروازے کی اوٹ میں چھپی رہی۔ اس نے جھری میں سے طاہر کو دیکھا۔ وہ پہلے سے دبلا دکھائی دے رہا تھا اس کے چہرے پر اب وہ لڑکوں والی بات نہ رہی تھی۔ آنکھوں کی شرارت بھری چمک دھندلا سی گئی تھی۔ چہرے پر خط کا نشان گہرا سرمئی ہو گیا تھا اور ماتھے پر ایک دو نئی سلوٹوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔

سامنے دروازے کا پردہ اٹھاتے ہوئے خالہ ننگے پاؤں ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے بولیں" یہاں مہمانوں کی طرح کیوں ٹھٹھک گئے ہو۔ اندر آؤ۔ اب خالہ سے بھی شرمانے لگے ہو" اور انہوں نے آگے بڑھ کر طاہر کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا" نعیم بھائی کا بیگ تو ہاتھ سے لے لو۔ تمہیں تو بس تالیاں بجانے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں"۔

جب وہ دوسرے کمرے میں پلنگ پر بڑے تکلف سے بیٹھ کر چھالیا کترتی خالہ سے

باتیں کرنے لگا تو بانی دروازے کی اوٹ سے کھسک کر غسلخانے میں جاکر منہ ہاتھ دھونے لگی۔ چینی کے بیسن میں پانی کی دھار شور مچاتی گر رہی تھی اور اس میں چوڑیاں بجنے کی مدھم جھنکار سنائی دے رہی تھی۔

بس ایک دھچکے کے ساتھ رکی اور طاہر نے چونک کر ڈرائیور سے پوچھا "بس ٹھہر کیوں گئی"۔

"ریڈیئٹر کھول رہا ہے" ڈرائیور نے سیٹرنگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "چشمے کا ٹھنڈا پانی ڈال لیں تو پھر چلتے ہیں" اور پھر اس نے کلنیر کو پکار کر کہا جلدی کر علیہ جلدی! پہلے ہی سے لیٹ ہو رہے ہیں۔

ریڈیئٹر شدت سے کھول رہا تھا اور اس میں سے گرتے ہوئے پانی اور چوڑیوں کی جھنکار سنائی دے رہی تھی۔ طاہر نے کھلے ہوئے ڈھکنے سے بھاپ کے دودھیا بادل کو باہر نکلتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "ہاں خالہ اماں آپ لوگوں سے کچھ ناراض ہی ہیں۔ انہیں ہر گھڑی یہی شکوہ رہتا ہے کہ آپ انہیں بالکل بھول گئے ہیں۔ اور وہ یہ شکایت کرنے میں کسی قدر حق بجانب بھی ہیں آپ لوگ ڈھاکے میں تین سال رہے اور اس مدت میں ہمیں صرف دو خط لکھے۔ اگر میں بھی خالو جان کی طرح کوئی بڑا افسر ہوتا تو یوں ہوتا کیا؟

یہ بات سن کر خالہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ انہوں نے جواب دینے کے بجائے ایک دو موٹے قطرے کٹی ہوئی چھالیا میں گرا دینے زیادہ مناسب سمجھے۔ طاہر نے پہلو بدلتے ہوئے کہا "اماں تو میرے ساتھ آ رہی تھیں۔ لیکن میں نے سوچا یہاں سردی ہو گی اور موسم کا اچانک تغیر ان کی صحت پر برا اثر ڈالے گا اس لیے ساتھ نہ لایا ورنہ وہ تو تیار تھیں"۔

"بہت برا کیا تم نے" خالہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا "ایک دو دن میں کیا ہو جاتا اور پھر یہاں کوئی ایسی خاص سردی بھی تو نہیں کہ بی بی برداشت نہ کر سکتیں۔ تم نے انہیں ساتھ نہ لا کر بڑی زیادتی کی ہے"۔

جب نعیم کمرے میں آ کر طاہر بھائی کے بیگ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا تو طاہر نے جی ہی جی میں کہا "واقعی میں نے نعیم کے لیے چاکلیٹ اور ٹافی نہ لا کر بڑی زیادتی کی ہے۔ اب میں پہلے سا بھک منگا طالب علم تو نہیں رہا ہوں۔ میونسپل کمیٹی کا اسی روپے ماہوار پانیوالا ایک معزز عہدیدار ہوں ۔۔۔ واقعی میں نے بہت برا کیا۔ خالی ہاتھ ان کے گھر آ گیا"۔

ڈرائیور نے کہا: "یہ لوگ بڑی زیادتیاں کرتے ہیں۔ موٹر پاس کرنے کے لیے ذرا بھی جگہ نہیں چھوڑتے۔ اگر میں ایک دم بریکیں نہ باندھ دیتا تو لاری کھڈ میں اتر جاتی۔"

طاہر نے کہا، "ایسی زیادتیاں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ لیکن اگر میں اس کیڈٹ سے دس کے بجائے پندرہ روپے لے لیتا تو ایسی زیادتی کبھی نہ ہوتی۔ پانچ روپے میں تو کافی چاکلیٹ آجاتی ہے۔"

اور جب خالہ اس کمرے سے اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئیں تو بانی نے اندر جھانک کر دیکھا اور پھر ٹھٹھک گئی۔ طاہر نے اپنی نئی چپل کا بکل کھولتے ہوئے جھک کر اُسے پردوں کی اوٹ میں سے دیکھا اور اس کا دل الٹ کر جیسے حلق میں آپھنسا۔ بانی ہمت کر کے اندر چلی آئی اور اس کے سامنے کھڑی ہو کر بولی: "اب آگئے بڑے صاحب بن کر۔"

طاہر نے خفت مٹانے کی خاطر پوچھا: "کیوں؟"

"ہم ڈھاکے میں اتنا عرصہ رہے۔ مگر آپ نے ایک خط بھی لکھا؟"

"خط.... خط...." اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم نے کونسا ڈاک کا تانتا باندھ دیا تھا۔"

"آخر میں نے ہی کراچی سے چلتے چلتے آپ کو مری آنے کا کارڈ لکھا نا۔"

"کارڈ کا کیا ہے، آخر یہاں تو میں ہی پہنچا — اچھا بتاؤ مجھے کیوں بلایا ہے؟"

"میں کیوں بلانے لگی۔ میں نے تو اتنا لکھا تھا کہ ہم مری جا رہے اور ایک غیر معین عرصے تک وہیں رہیں گے۔ آپ کو کس نے دعوت دی۔"

طاہر نے چٹکی بجا کر جواب دیا: "دعوت نہیں دی تو ہم لوٹ جاتے ہیں۔ پلٹنے میں کونسی دیر لگتی ہے۔"

اتنے میں خالہ پھر اندر آگئیں۔ انہوں نے اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا: "بانی نے اچھی خاصی بنگالی سیکھ لی ہے۔ اس نے وہاں بہت سی بنگالی لڑکیاں سہیلیاں بنا لی تھیں اور اب تو انہیں خط بھی بنگالی میں لکھنے لگی ہے۔"

"کمال ہے" طاہر نے جھوٹ موٹ کی حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "ہم تو چودہ سال تک انگریزی

کے پیچھے لٹھ لیے پھرا کئے مگر آج تک ایک لفظ بھی اٹھا نا نہ آیا۔ بانی نے کمال کیا ہے جو تین سال میں بنگالی لکھنا بھی شروع کر دی۔"

بانی نے خالہ کی طرف منہ کر کے کہا: "امی سبھی کے دماغ ایک سے تھوڑے ہوتے ہیں۔ کوئی ذرا کند ذہن ہوتا ہے۔ کسی کسی کو اللہ میاں ذہین بنا دیتا ہے۔" اس نے چور آنکھوں سے طاہر کو دیکھا اور اپنی امی کے سامنے بھولا سا منہ بنا کر کھڑی ہو گئی۔

خالہ نے مسکرا کر کہا "تم دونوں کی تو یونہی ٹھنی رہی اور خدا معلوم کب تک ایسے ہی ٹھنی رہے گی۔"

ڈرائیور کہہ رہا تھا "تینوں ٹرانسپورٹ کمپنیوں کی آپس میں ٹھنی ہوئی ہے۔ ایک سال کا عرصہ ہو گیا ہے خدا جانے اور کب تک ایسے ہی ٹھنی رہے گی۔" طاہر نے گھبرا کر پوچھا "ابھی مری کتنی دور ہے؟"

"بس آیا چاہتی ہے۔" ڈرائیور نے وقت دیکھا اور سگریٹ جلانے میں مشغول ہو گیا۔

سڑک کے کنارے سبز رنگ کی ایک لمبی سی کار کھڑی تھی، اس کے باہر ایک صاحب، تین چار کلرک اور دفتر کی بے شمار فائلیں بغل میں دابے سرخ رنگ کی وردی والا ایک اردلی کھڑا تھا۔ طاہر کو سرخ رنگ کی وردی دیکھ کر نصرت باجی کا بیاہ یاد آ گیا۔ جب وہ اسی رنگ کا جوڑا پہنے صوفے پر بڑے طمطراق سے بیٹھی تھیں اور ان کے پاس قالین پر لیٹے ہوئے ممتاز بھائی سگریٹ پی رہے تھے، باجی لال جوڑا پہنے بھی افسر دکھائی دیتی تھیں اور ممتاز بھائی دو سٹنڈ کا سوٹ پہنے بھی اردلی لگتے تھے۔ اس ایک شادی کے ساتھ بہت سی شادیاں اس کے ذہن میں گھومنے لگیں۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ طاہر نے ریسیور اٹھایا تو بانی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی: "جلدی گھر آیئے ایک نہایت ضروری کام آ پڑا ہے۔"

"ایسا کیا کام آ پڑا ہے بانی۔ میں دفتر چھوڑ کر کیسے آؤں۔ مجھے ٹیلیفون ہی پر بتا دو۔"

"ٹیلیفون پر بتانے کا ہوتا تو میں پہلے ہی نہ کہہ دیتی۔" بانی نے روہانسی ہو کر کہا۔ "گھر آیئے نہیں تو میں....."

"نہیں تو میں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بھئی میں گھر ہی تو آ رہا ہوں۔" طاہر نے جلدی جلدی

ٹیلیفون بند کیا اور اپنے چپڑاسی کو کھلی ہوئی فائلوں کا دھیان رکھنے کے لیے کہہ کر جلدی جلدی سیڑھیاں اتر گیا۔ سٹاف کار پورچ میں موجود نہ تھی۔ اس نے گیٹ کیپر کو بھیج کر ایک ٹیکسی منگوائی اور گھر پہنچ گیا۔۔۔ بانی سیاہ رنگ کے بڑے بڑے پھولوں والی قمیص پہنے بنگلے کے برآمدے میں کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ طاہر کو اپنی طرف تیزی سے قدم اٹھاتے دیکھ کر ذرا مسکرائی اور اپنی قمیص کے پہلوؤں میں اسی رنگ کی لٹکتی ہوئی پیٹیاں اٹھا کر بولی "ذرا انہیں میری کمر کے پیچھے باندھ دیجئے"۔ طاہر نے ٹھٹک کر استعجابیہ نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ مسکرا کر بولی "خوبصورت سی گرہ دیجئے گا۔ پیاری سی ناٹ"۔

طاہر نے گرہ دیتے ہوئے پوچھا "مجھے دفتر سے کیوں بلایا تھا"۔

"اسی لیے بلایا تھا۔۔۔ ماما کھانا پکا کر چلی گئی ہے۔ یہاں کوئی بھی نہ تھا میں گرہ کس سے دلواتی"۔

طاہر نے جھنجلا کر کہا "میں حضور کا اردلی تو نہیں ہوں۔ ایک بڑے دفتر کا بڑا صاحب ہوں مجھے ....." لیکن بانی نے بات کاٹ کر کہا "صاحب تو صاحب ہی رہتے ہیں۔ گرہ دینے سے اردلی تو نہیں بن جاتے"۔

طاہر نے طنزیہ لہجہ میں پوچھا "اچھا تو اب میں جا سکتا ہوں؟"

"شوق سے"! بانی نے بڑے صاحبوں کی طرح کہا اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اندر چلی گئی۔

طاہر اپنے دفتر پہنچ کر ابھی کرسی پر ٹھیک سے بیٹھا بھی نہ تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ اس نے جھنجلا کر ٹیلیفون پرے دھکیل دیا اور بولا "اب چاہے یہ گھنٹی جتنی دیر تک بجتی رہے میں ہرگز ریسیور نہ اٹھاؤں گا"۔

ڈرائیور نے چلا کر کہا "چاہے یہ گھنٹی رات تک بجاتے رہو میں موٹر کھڑی نہیں کروں گا"۔ کلینر نے پکارا "استاد سواری اترنی ہے، اس ذخیرے کے پاس"۔

"تو میں کیا کروں"، ڈرائیور نے کھیج کر کہا "مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ ڈھلوان پر بس نہیں رک سکتی۔ پتا نہیں اس کی بریکیں خراب ہیں؟"

طاہر نے کہا "ٹھیک ہے ڈرائیور صاحب اب یہ بس مری جا کر ہی رکئے گا راستے میں خواہ مخواہ

وقت ضائع ہو رہا ہے۔

رات کو خالو جان نے طاہر سے اس کی موجودہ تنخواہ پوچھ کر کہا "میاں صاحبزادے تم نے میونسپلٹی کی نوکری کر کے اپنا وقت ہی ضائع کیا۔ اس میں عہدے کی ترقی ہے نہ تنخواہ کی اور آخری عمر میں پنشن سے بھی صاف جواب ہے۔ اس وقت تم نے میرا کہا نہ مانا۔ اگر میرے دفتر میں عرضی دے دیتے تو میں تمہیں ڈائرکٹ اسسٹنٹ رکھ لیتا ــــ اب سوچو کل کو خدانخواستہ تمہاری اماں تمہاری شادی کے درپے ہو جائیں تو ان اتنی سی پیسوں میں اپنا، اپنی اماں کا اور اس بدبخت بیوی کا پیٹ کیسے پال سکو گے ــــ واقعی تم نے بڑی غلطی کی۔ میں تمہیں ڈائرکٹ اسسٹنٹ رکھ لیتا۔ یہ کمیٹی کی نوکری کر کے تو تم نے اپنا وقت ہی ضائع کیا۔"

خالہ نے طاہر کی جگہ جواب دیتے ہوئے کہا۔ کوئی بات نہیں، آہستہ آہستہ آپ ہی ترقی ہو جائے گی۔ ہاتھ آئی ہوئی روزی چھوڑ کر دوسرے روزگار کی طرف بھاگنا کونسی عقلمندی ہے۔ اللہ خود ہی ترقی کر دے گا۔

طاہر نے جھینپتے ہوئے کہا: "ہاں جی اللہ بڑا کارساز ہے وہ اسی نوکری میں مرتبہ دے دیگا۔"

"سبحان اللہ" خالو نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ بھی اپنی خالہ کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ میاں اگر اس خیال میں رہے ہو کہ یہ نوکری کرتے کرتے تم ایک دن تحصیلدار بن جاؤ گے تو اس نوکری سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔" یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگے اور اس مرتبہ کسی نے بھی ان کی ہنسی کا جواب نہ دیا۔"

سونے سے پہلے جب طاہر دانت صاف کر رہا تھا تو بانی غسلخانے میں ہاتھ دھونے آئی اس نے صابن کا جھاگ ہاتھوں سے پونچھتے ہوئے کہا "آپ گھبرائیں نہیں۔ ابا جان کی باتوں پہ نہ جائیں وہ ایسے ہی کرتے ہیں۔ دیکھ لینا ایک دن تم ابا جان سے بھی بڑے آفیسر بن جاؤ گے۔ طاہر نے برش منہ سے نکال کر ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ بانی کی آنکھوں میں خلوص اور یقین کے اشارے اندھیاروں کے جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔

ڈرائیور بلند قامت کلینر سے کہہ رہا تھا: دیکھ لینا گجو آج لیٹ پہنچیں گے۔ جواب طلبی ہو گی۔

تو میں تمہارا نام لے دوں گا کہ جگہ جگہ رکواتا آیا ہے۔

کلینر نے پکار کر کہا: "کوئی بات نہیں استاد میں منشی سے آپ ہی نپٹ لوں گا۔"

پہاڑوں کی اونچی چوٹیوں پر مری دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھی۔ سڑک کے کنارے ڈھلوان چھتوں والے بنگلے ایک دوسرے کے آگے پیچھے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ بڑی بڑی چٹانوں پر موٹے موٹے حروف میں ہوٹلوں کے اشتہار لکھے تھے۔ وادی کے سرسبز کھیتوں پر سفید سفید بادل تیر رہے تھے اور اوپر سیاہ ابر چھایا ہوا تھا۔ بارش ابھی برس کر تھمی تھی۔ لیکن سرد ہوا کے تیز جھونکوں سے درخت ابھی تک برس رہے تھے۔

طاہر نے اپنی اچکن کے سارے بٹن بند کر لیے اور کمبل کو ٹھیک سے تہہ کر کے گود میں ڈال لیا۔

کسی سواری نے ملتجیانہ لہجہ میں کہا "ایک منٹ کے لیے یہاں نہیں روک سکتے۔"

ڈرائیور نے جواب دیا: "اگلا موڑ مڑنے کے بعد اڈہ آ رہا ہے یہاں روک کر کیا لیں گے۔" جب اگلا موڑ آیا تو ایک اور بس پاں! پاں!! کرتی ان کے قریب سے گذری۔ طاہر نے دیکھا اگلی سیٹ پر بانی۔ نعیم۔ خالہ اور خالو کمبل گھٹنوں پر ڈالے واپس جا رہے تھے۔

ڈرائیور نے پکار کر کہا "لے بچہ آخری بس بھی نکل گئی۔"

طاہر نے گھبرا کر پوچھا "اور اب کوئی بس نیچے نہیں جائے گی؟"

"اونہوں،" ڈرائیور نے بے پروائی سے کہا: "اب کل میلے ہوں گے ــــ لیکن ٹیکسی جا سکتی ہے۔ سالم ٹیکسی۔ تیس روپے کی۔ پھر وہ ــــ "یہ زندگی کے میلے" گانے لگا۔ طاہر نے اپنی اچکن کی جیب سے پانچوں روپے اور کارڈ نکال کر مٹھی میں بھینچ لیے۔ بادل زور سے گرجا اور بارش ہونے لگی۔

کالج سے گھر تک

کالج سے گھر کو جاتے ہوئے میں نے کئی مرتبہ ارادتاً اِدھر اُدھر نگاہیں گھما کر ان دو عورتوں کو تلاش کیا جو سروں پر اُپلوں کے ٹوکرے اُٹھائے خچروں کی طرح ہانپتی ہوئی چلتی ہیں مگر اس چند فرلانگ لمبی سڑک پر کبھی بھی مجھے ان کا سراغ نہیں ملا۔ اکثر اوقات میں نے اس فقیر کو ڈھونڈنے کی کوشش بھی کی جو ہاتھ جوڑ کر ایک پونسہ بخشیش کہا کرتا ہے مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ مجھے تو اس راہ پر چلتے ہوئے عجیب عجیب آدمیوں سے پالا پڑتا ہے جن میں سے اکثر مجھ کو جانتے ہیں مگر میں ان کو نہیں جانتا۔

کالج کے بڑے دروازے سے نکلتے ہی جب میں اپنی کتابوں کو آخری مرتبہ غور سے دیکھ کر بغل میں دبا لیتا ہوں تو ایک سُکھ پال میرے قریب آ کر رُکتی ہے اس میں پرانی وضع کی ایک ادھیڑ عمر خاتون انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں ہیں اور گلے میں جواہرات کے ہار پہنے پردہ اٹھا کر مجھے دیکھتی ہیں اور میرا نام لے کر کہتی ہیں ”واری جاؤں میں آج پھر آ پہنچی۔ آج تو تمہیں آخری فیصلہ کرنا ہی ہوگا۔ حضور نواب صاحب فرماتے تھے کہ ایک دفعہ تمہیں اپنے ساتھ ان کے سامنے لے چلوں تو وہ خود منا لیں گے۔ آخر ایسا بھی کیا میرے لعل! ہم تمہارے لیے دوانے ہو رہے ہیں اور تم سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے الٹے چندرا کے بولتے ہو کہ ”مجھے ہر روز اس طرح تنگ کیوں کیا جا رہا ہے؟“ بیٹا ایک مرتبہ آنکھ بھر کر ہماری طرف دیکھو۔ کیا ہم انسان نہیں۔ کیا ہمارے دل میں محبت کی وہ چنگاریاں نہیں جو ہر صاحبِ اولاد کی سانس کو روشن کیا کرتی ہیں تم ہمیں مٹی کے تودے یا گھاس کے پولے کیوں سمجھتے ہو! ذرا

سوچو کیا ہمارا دل کسی کے کان میں "کن کن لٹو" کہنے کو نہ چاہتا ہوگا! کیا ہمارے دل میں کسی کی ضدیں پوری کرنے کو ارمان نہ مچلتے ہوں گے. کیا ہم —— کیا ہم —— اور یہ کہہ کر وہ آبدیدہ ہوجاتی ہیں اور گریبان سے معطر ریشمی رومال نکال کر اپنے ننھے ننھے آنسو پونچھنے لگتی ہیں اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ اے خدا ایں کب تک باتیں بنا بنا کر ان سے اپنی جان چھڑواتا رہوں گا۔ اچانک بیگم صاحبہ کے آنسو تھم جاتے اور وہ پھر اپنی تقریر شروع کر دیتی ہیں۔" اُس کے کاموں میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں۔ اس کے دربار میں کیا کمی تھی۔ ہمیں چاند سے بیٹے کی بجائے کوئی چرخ جل لکڑی ہی دے دیتا۔ لیکن اسے منظور نہ تھا۔ معمولی معمولی آدمیوں کے یہاں آئے سال چرنے والیاں چلی آتی ہیں اور بد حائی لے کر جاتی ہیں۔ لیکن اپنا مقدر ہی کچھ ایسا ہیٹا ہے کہ جس کے آگے دامن پھیلاتے ہیں دھتکارے جاتے ہیں۔ ریاست کی ایک کروڑ سالانہ آمدنی اب پتہ نہیں ہمارے بعد کس کے کام آئے گی اور پھر ریاست بھی رہے رہے، نہ رہے نہ رہے، خدا معلوم ہمارے باپ دادا کی گڑی ہوئی ہڈیاں بھی محفوظ رہیں گی یا ان پر بھی گدھوں کا ہل پھر جائے گا۔ لیکن ہمیں کیا جب اُسی کو منظور نہیں تو ہم کون ہوتے ہیں پرائے پھٹے میں ٹانگ اڑانے والے! —— تمہیں دیکھا تھا تو دل میں ایک آس بندھی تھی۔ پرانے محل کے سامنے ایک نئی وضع کی کوٹھی تمہارے لیے تعمیر کرائی اور گرد چونہ گچ نہر بنوائی اس میں ہزاروں آبی جانور چھوڑے، باغیچہ لگوایا۔ دنیا بھر کے خوش الحان جانور وہاں جمع کر دیئے گئے۔ تمہاری ہر ضرورت کے مطابق علیحدہ علیحدہ کمرے تعمیر کرائے۔ ایک ہال میں دنیا کی مختلف زبانوں کی چار لاکھ ادبی کتابوں کو اکٹھا کر کے لائبریری بنائی گئی۔ ساگوان کی الماریوں پر گہرا بسنتی رنگ کیا گیا کیونکہ مجھے معلوم تھا تمہیں یہ رنگ بہت پسند ہے۔ ایک کمرے میں بڑے بڑے مصوروں کے شاہکاروں کو سجا کر آرٹ گیلری بنائی۔ اسی میں تمہارے شوق کے لیے نقاشی کا سارا سامان مہیا کیا گیا۔ پہلو کے کمرے میں بیل اینڈ ہاول کا ننھا سا سولہ ایم ایم کا پروجیکٹر لگایا۔ چار الماریاں

مالی وڈ سے منگوائی ہوئی فلموں سے بھر دی گئیں تاکہ تمہیں سینما دیکھنے کے لیے دور نہ جانا پڑے کوٹھی کے ہر گیٹ پر پیٹرول سے لبالب بھری کاریں لے کہ ڈرائیور اسی انتظار میں کھڑے رہتے ہیں تاکہ وقت پر تمہیں کبھی بھی جھلّانا نہ پڑے۔ لیکن انہیں اسی طرح کھڑے ہوئے کئی مہینے بیت چکے ہیں کسی نے انہیں کوئی حکم نہیں دیا۔ میں ہر صبح سیر کے لیے اس کوٹھی میں جاتی ہوں اور موٹر کے اندر جھانک کر میل بتانے والی گھڑی کو دیکھتی ہوں پر وہاں سوائے صفر کے اور کوئی ہندسہ نمودار نہیں ہوا اور ہو بھی کیسے جب تم ایسے کٹھور کٹھور ——— کٹھو——ر———

اس کے بعد وہ پھر رونے لگتی ہیں اور میں انہیں دلاسا دینے کی غرض سے کہتا ہوں آپ گھبرائیں نہیں میں ایک نہ ایک دن آپ کی خدمت میں ضرور پہنچوں گا آج کل میں اسقدر مصروف ہوں کہ مجھے فراغت کا ایک لمحہ بھی میسر نہیں آتا اور میں اپنے آپ سے بھی نہیں مل سکتا۔ لیکن آپ کا متبنیٰ بننے کے لیے مجھے اپنے والدین کو چھوڑنا ہوگا۔ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے منہ موڑنا ہوگا اور سب سے بڑھ کر طول و عرض میں پھیلی ہوئی اپنی تجارت کو خیر باد کہنا ہوگا جو ہمارے خاندان کا طرّہ امتیاز ہے میرا ارادہ تھا کہ تعلیم کے بعد اپنی فیکٹری کو اور وسیع کروں تاکہ مشرقِ وسطیٰ کے علاوہ ہم اپنی مصنوعات یورپ میں بھی بھیج سکیں۔ لیکن میں آپ کے یہ آنسو نہیں دیکھ سکتا شاید اب مجھے اپنا ارادہ بدلنا پڑے ——— میں آپ سے ملوں گا اور ضرور ملوں گا لیکن ملاقات کے اوقات مُعین نہیں کر سکتا۔

بیگم صاحبہ کی نمناک آنکھوں میں اُمید کی ایک ہلکی سی کرن چمکتی ہے اور دیر تک سلگتی رہتی ہے۔ جیسے تیز مصالحہ کی ہنڈیا کھانے سے تیکھے تیکھے نقوش والی دودھیا لڑکی کے پتلے پتلے ہونٹ!

جب وہ اپنی سُکھ پال میں بیٹھ کر واپس چلی جاتی ہیں تو میں انہیں دور تک اور دیر

تک دیکھتا رہتا ہوں۔ کچہری روڈ پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جب میں یونیورسٹی ڈاک گھر کے بالکل سامنے پہنچتا ہوں تب مجھے اپنے سامنے ایک شور سنائی دیتا ہے۔ بوڑھوں، بچوں، نوجوانوں کا شور اور ان آوازوں کے درمیان بگٹٹ دوڑتے ہوئے ایک گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز جیسے بہت سی ٹامی گنیں اور سٹین گنیں ایک ساتھ چل رہی ہوں اور پھر دور سے تانگے کا ایک سرپٹ دوڑتا ہوا گھوڑا دکھائی دیتا ہے جو نیلے گنبد سے ایک دھبے کی طرح نمودار ہوتا ہے اور سیاہ بگولے کی مانند میری طرف بڑھنے لگتا ہے۔ لوگ بھاگ بھاگ کر پٹڑیوں پر ہو جاتے ہیں۔ خوانچے والے اپنے خوانچے چھوڑ کر دیواروں سے لگ جاتے ہیں۔ دکاندار اپنی دکانوں کے دروازوں میں آ کر اس سماوی آفت کا نظارہ کرنے لگتے ہیں تانگے میں کوئی آدمی نہیں ہوتا اور گھوڑا ارد گرد کے بھاگتے ہوئے آدمیوں کو دیکھ کر اور متوحش ہو جاتا ہے اس کی ٹانگوں سے بجلیاں لپٹ جاتی ہیں اور اس کے سموں سے چنگاریاں پھوٹنے لگتی ہیں۔ جب وہ میرے قریب سے گزرتا ہے تو میں اپنی کتابوں کو سڑک پر پھینک کر اس کی طرف لپکتا ہوں اور پچھلے پائیدان پر پاؤں رکھ کر سیٹوں پر سے گزر کر بم پر پہنچ جاتا ہوں اور پھر بم سے اچھل کر گھوڑے کی کمر پر پہنچ جاتا ہوں اور اس کی گردن پر چھاتی کے بل لیٹ کر ہاتھ بڑھا کر دہانے کی زنجیر پکڑ لیتا ہوں۔ جونہی دہانے کو جھٹکا پہنچتا ہے گھوڑا الف ہو جاتا ہے۔ لیکن میں دوسرے ہاتھ سے اس کی ایال تھام کر easy ! easy ! ! پکارنے لگتا ہوں اور وہ زمین پر — ایک دو ٹاپیں مار کر رک جاتا ہے۔ بہت سے لوگ تانگے کے گرد جمع ہو جاتے ہیں جن میں سے ایک نے میری کتابیں اٹھائی ہوتی ہیں۔ وہ لوگ اپنے اپنے ذخیرۂ الفاظ کے مطابق میری تعریف کرتے ہیں۔ اتنے میں ہانپتا کانپتا کوچوان بھی پہنچ جاتا ہے اور میں اسے صرف اتنا کہہ کر کہ "بھئی ذرا خیال رکھا کرو" اپنی کتابیں اس آدمی کے ہاتھ سے لے کر چلنے لگتا ہوں تو چند بزرگ کہتے ہیں۔ "اپنی کہنی سے خون پونچھو بیٹا اور اسے دھو کر پٹی باندھ لو۔ لوہے کے کیل کا زخم اچھا نہیں ہوتا۔" مگر میں سنی ان سنی ایک کر کے ان کے پہلو سے گزر جاتا

ہوں. کالج کے اسی دروازے کے قریب جہاں سے میں چلا تھا وہی لڑکی نہایت فکرمند اور شکستہ خاطر انداز میں کھڑی ہوئی ملتی ہے اس طرف ایک مرتبہ دیکھ کر اپنی نگاہیں جھکا لیتا ہوں. کیونکہ اس لڑکی میں جمال سے زیادہ جلال کی آمیزش ہے اور وہ لائبریری کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایسے دکھائی دیتی ہے جیسے شاہی فرمان پر اپنے پاؤں سے مہریں ثبت کر رہی ہو. اس کی ناک کی جڑ میں دو گہری لکیریں سنپولیوں کی طرح ہر وقت گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں. کالج بھر میں کوئی ایسا نہیں جس کے پاس ایسی موہنی ہو جو ان ناگ بچوں کو رام کر سکے. بہت سے اناڑی سپیروں نے جو بچھو کا منتر بھی نہیں جانتے تھے. سانپ کی بانبی میں ہاتھ ڈالنا چاہا. مگر بل کھا کر گرے. لیکن مجھے اس طرح سر جھکائے دیکھ کر وہ بے چین ہو جاتی ہے اور میرے قریب آ کر میری کنپٹی کو چھو کر کہتی ہے." یہ زخم اچھا نہیں ہوتا."

میں جواب دیتا ہوں." بہت سے زخم اچھے نہیں ہوتے."

اس پہ وہ اپنی کتاب کھول کر ایک ننھا سا رومال نکالتی ہے اور اس کی چھوٹی سی گدی بنا کر میری کنپٹی پر رکھ کر زور سے دباتی ہے. رومال سے کئی طرح کی ملی جلی خوشبوئیں اور اس کے ہاتھ سے مٹی کے عطر کی سی خوشبو، جو ہر اسی طرح کی لڑکی کے ہاتھوں سے آیا کرتی ہے. میرے دل کو تیزی سے دھڑکانے لگتی ہے اور لہو بجائے تھمنے کے شدت سے رواں ہونے لگتا ہے پھر وہ مجھے یونیورسٹی میں نل پہ لے جا کر رومال بھگو بھگو کر زخم دھوتے ہوئے کہتی ہے." کیا آپ ہی کو گھوڑا روکنا ضروری تھا؟"

میں کہتا ہوں." تم بڑی بھولی ہو. تمہیں کیا خبر کہ گھوڑے کے زخم آ جانے پر یا ٹانگے کا ایک بم ٹوٹ جانے پر بیچارے کوچوان پہ کیا گزرتی! جس کی زندگی کا ایک ہی سہارا ہو اور اس سہارے میں رخنہ پڑ جائے پتہ ہے اس کی کیا حالت ہوتی ہے؟"

"پتہ ہے." وہ آنکھیں جھپکا کر کہتی ہے.

میں کہتا ہوں." اگر تمہیں پتہ ہوتا تو تم اس طرح ہر وقت کمان کا چلہ نہ چڑھائے

رکھتیں۔ ہر وقت تمہاری آنکھوں میں انگارے سے نہ دہکتے رہتے اور تمہارے ہونٹوں کے سرخ سرخ کنارے ہر گھڑی اس طرح ملے نہ رہتے لیکن تمہیں کیا معلوم کیونکہ یہ باتیں کتابوں میں نہیں ہوتیں۔"

وہ کہتی ہے۔ "میں چہروں کو کتابیں سمجھتی ہوں اور مجھے ایسی ہی کتابیں پڑھنے میں مزا آتا ہے، یہ بات الگ ہے کہ میں ان کے مضمون سے اتفاق نہیں کرتی میری اپنی رائے ہے۔ اپنی نظر ہے لیکن آپ اس قدر پریشان کیوں رہتے ہیں میں نے آپ کو برآمدوں میں، گراسی پلاٹوں میں اور سیڑھیوں پر اترتے چڑھتے ایسے دیکھا ہے جیسے آپ کی کوئی چیز گم ہو گئی ہو۔ اور آپ اسے تلاش کرنے کا فرض ادا کر رہے ہوں جیسے آپ کے ساتھی آپ کو چھوڑ کر بہت دور نکل گئے ہوں اور آپ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہے ہوں کہ کہیں وہ تھک کر راستہ میں ہی نہ رہ جائیں ایسا کیوں ہے؟ اتنی پریشانی میں نے کسی اور کتاب میں کبھی نہیں پڑھی! آپ کی آنکھیں دھوئے دھلائے پژمردہ پھولوں کی طرح رنگ و بو کے لیے ناکام کوشش کیا کرتی ہیں۔ کیا آپ نے کسی سے وعدہ کیا اور اسے نبھا نہ سکے؟"

میں اس کے تر و تازہ چہرے پر اتنی پژمردہ پھولوں کی ساری نکہتیں بکھیر کر کہتا ہوں اس زخم کا علاج کرتے ہوئے خدا کے لیے مجھے اور گہرے زخم نہ لگاؤ مجھے اپنی راہ پر جانے دو ـــــ یہی ڈگر میری دنیا ہے، اسی راستے میں میرا گھر ہے اور یہی پگڈنڈی میری رفیق ہے تم نے میرے زخم پہ مرہم لگا کر ہزاروں نئے داغ دیدیئے ہیں۔ تم نے ایک سلگاپے کو ٹھنڈا کر کے لاکھوں چنگاریاں سلگا دی ہیں۔ تم مجھ سے میرے متعلق نہیں اپنے متعلق پوچھ رہی ہو تم ان جھوٹے وعدوں کے متعلق پوچھ رہی ہو جو تم نے اپنے دل سے کیے اور انہیں پورا نہ کیا ـــــ لیکن میں کیا کروں؟ کیسے تمہاری مدد کو پہنچوں کس طرح تمہارا ساتھ دوں۔ مانا ایک لمحے کی ملاقات ایک مضبوط رشتہ ہے لیکن اختصار اور مضبوطی رسن و دار کا دوسرا نام بھی تو ہے ـــــ جب زخم سے لہو نکلنا بند ہو جائے گا تو تم خود ہی مجھے چلے جانے کو کہو گی۔

اور جب میں چل دوں گا تو ـــــ تو مجھ کو پکاریں گی فلک ریز نوائیں اور میرے مسافر۔ میرے شاعر ـــــ میرے ـــــ

لیکن وہ میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے اور کہتی ہے۔" ایسی واہی تباہی نہیں بولا کرتے۔"

اتنے میں ڈاک کا ہرکارہ سامنے سے آتا دکھائی دیتا ہے۔ ہم سے چند قدم کے فاصلے پر رُک کر فرشی سلام کرتا ہے اور میرے قریب آ کر کہتا ہے۔" حضور کو تلاش کرتے کرتے عاجز ہو گیا ہوں۔ تین دن سے کبھی کالج، کبھی گھر، کبھی لائبریری مگر آپ ملتے ہی نہیں ـــ یہ چٹھی تھی، ولایت سے آئی ہے چونکہ اس پر "ذاتی" لکھا ہے اس لیے میں نے کسی اور کو دینا مناسب نہ سمجھا ـــــ آج یونیورسٹی آیا تھا حسن اتفاق سے آپ نظر آ گئے ـــــ یہ لیجیے۔"

میں خط دیکھتا ہوں لمبا سا لفافہ ہوتا ہے۔ ایک کونے میں ایئر میل کا نیلگوں لیبل لگا ہوتا ہے دوسرے کونے پر فرانس کا ٹکٹ ـــــ وہ لڑکی لفافہ میرے ہاتھ سے لے کر خط نکال کر مجھے دے دیتی ہے اور ٹکٹ خود اتار کر اپنی اسی کتاب میں رکھ لیتی ہے جس میں سے اس نے رومال نکالا تھا ـــــ یہ چٹھی آندرے ژیت کی ہے۔ اس نے لکھا ہے آپ پاکستان کے مایہ ناز ادیب ہیں۔ میں فرانس کا قلمکار ہوں کیا ہی اچھا ہو اگر پاکستان اور فرانس کا ادب ایک سنگم پر مل جائے اگر آپ بواپسی ڈاک اطلاع دیں تو میں آپ کو ایئر فرانس کا ایک چارٹرڈ ٹکٹ بھیج دوں تاکہ ہم بقیہ زندگی ایک دوسرے کی معیت میں گزاریں اور مشترکہ ادبی تخلیقات دنیا کے سامنے پیش کر کے کوئی تعمیری کام کر سکیں۔"

میں اس خط کو پڑھ کر ذرا مسکراتا ہوں اور اُسے لڑکی کی گود میں ڈال دیتا ہوں ڈاکیہ میری طرف طلب آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا ہوتا ہے میں اچکن کی جیب سے لائڈز بنک کی چیک بک نکالتا ہوں اور ایک سو روپے کا چیک کاٹ کر اسے بخشش دیتا ہوں۔ وہ پہلے سے زیادہ جھک کر سلام کرتا ہے اور رخصت ہو جاتا ہے۔

پھر میں اس لڑکی کو اسی نل کے پاس چھوڑ کر اپنی راہ پر آ کر چلنے لگتا ہوں جو میرے گھر کو جاتی ہے۔

سنٹرل بنک کے قریب مجھے ایک امریکن کار دکھائی دیتی ہے جو عین میرے قریب آ کر ایک دم رک جاتی ہے۔ ایک نہایت خوبصورت سرخ سفید امریکن اُسے چلا رہا ہوتا ہے۔ پچھلی سیٹ سے ایم اسمٰعیل، پرتھوی راج اور کامنی کوشل ایک دم باہر نکل کر مجھے تپاک سے سلام کرتے ہیں پھر اس امریکن سے میرا تعارف کراتے ہیں جو ہالی وڈ سے اس تلاش میں یہاں آیا ہے کہ اسے ایک مشرقی ماحول کی فلم میں کام کرنے کے لیے ایک ہیرو مل جائے۔

کامنی کوشل کہتی ہے "مسٹر ڈریک ایک مہینہ سے بمبئی میں آئے ہوئے تھے مگر انہیں ڈھب کا کوئی ہیرو نہ مل سکا۔ یہاں لاہور میں آئے ہوئے ہمیں ایک ہفتہ ہونے کو آتا ہے۔ مگر کوئی حسین اور وجیہ نوجوان نظر نہیں پڑا۔ جہاں جاتے ہیں سبھی آپ کا پتہ بتلاتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ امریکہ سے آئے ہوئے ہمارے اس مہمان کی مدد کر سکیں۔"

اس پر میں جواب دیتا ہوں "مجھے افسوس ہے میں ان کی مدد نہ کر سکوں گا۔ میں بہت سی الجھنوں میں پھنسا ہوا ہوں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ میں اپنے خاندانی تجارتی ادارے سے بھی منسلک ہوں اور اسے عالمگیر بنانے کی فکر میں ہوں اور ۔۔۔ اور ۔۔۔"

پرتھوی راج کہتا ہے۔ "آپ ہمیں نراش نہ کریں ہم نے کئی دنوں کی تلاش کے بعد آپ کا کھوج نکالا ہے اتنے دن آپ کی تلاش میں مارے مارے پھرے ہیں اب بھی اگر آپ نے ہماری آس نہ بندھائی تو ہمیں بہت دکھ ہو گا۔"

اور مسٹر ڈریک جھک کر کہتا ہے۔ "مجھے آپ جیسے ہیرو کی ضرورت تھی۔ ایسے چہرے اور ایسے خدوخال سے میری فلم کو چار چاند لگ جائیں گے۔ آپ کی وجہ سے میں شہرت کے آسمان پر پہنچ جاؤں گا۔ آپ کی بدولت میں بلندیوں سے ستارے توڑ لاؤں گا اور دنیا پر ثابت کر دوں گا کہ مجھے انتخاب میں کیسا کمال حاصل ہے۔ مجھے ایسا ہی

کشادہ ماتھا چاہیے۔ ایسے ہی ریشمی بال، یہی متجسس نگاہیں۔ ٹھوڑی کا ہلکا سا خم اور زیریں لب کے نیچے سیاہ چمکدار تل۔ آپ کو پتہ نہیں ہے میں نے اس چہرے کے لیے کتنے سمندروں کا سفر کیا ہے اور آج کامیاب ہوا ہوں۔ ہم آپ کو ایک لاکھ ڈالر فی ہفتہ کے حساب سے اجرت دیں گے۔ بنگلہ۔ کار۔ نوکر اور آپ کے کروڑوں خطوط کا جواب دینے کے لیے ملازمین کی تنخواہ کمپنی کے ذمہ ہوگی۔ خدا کے لیے ہمیں مایوس نہ کیجیے اگر آپ حضرت عیسٰے کو پیغمبر مانتے ہیں اور اپنے دل میں ان کی بے پناہ محبت سے ایک شمہ خیرات کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو رضامندی ظاہر کیجیے اور ہمارے ساتھ چلیے اور اگر آپ کو امریکہ جا کر اداس ہو جانے کا تردد ہو تو ہم آپکے سارے خاندان کو اپنے خرچ پر ساتھ لے جانے کو تیار ہیں لیکن —— لیکن ——

مَیں بات کاٹ کر کہتا ہوں: "مجھے روپیہ سے محبت نہیں۔ اپنے خاندان سے اُنس نہیں اور میں اداسی کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ میں تو فن کا پجاری ہوں مجھ سے اس کی سوداگری نہیں ہوسکتی۔ مَیں اپنے حسن کو کسی مول پر بھی بیچنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ ایسی نعمت کو چند طلائی سکّوں کے عوض بیچ کر میں اس کی تضحیک نہیں کروں گا۔ اگرچہ میرے پاس اس کا شکرا دا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تاہم میں بنی اسرائیل کی طرح ناشکری کی نجاست سے اپنے آپ کو آلودہ نہیں کر سکتا۔ مجھے افسوس ہے میں آپ کے کسی کام نہ آسکوں گا یہ روح روپے پیسے کی بھوکی نہیں۔ اگر آپ میری زندگی کے اَن گنت سانسوں میں سے ایک سانس بھی خرید سکیں تو آپ یقیناً دنیا کے سب سے خوش قسمت انسان ہوں۔ لیکن قسمت کی یہ خوبی آپ کے مقدر میں نہیں۔"

پھر وہ حیرانی سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتے ہیں اور امریکی فلمساز کے چہرے پر بدنصیبی اور ناامیدی کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چار دور اُفتادہ ملاح بیچ سمندر کے اپنا سفینہ غرق ہونے سے پہلے ایک دوسرے کو جی بھر کے دیکھ رہے ہوں۔

جب میں پھٹے ہوئے ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر گھر میں داخل ہوتا ہوں تو ہمارا بوڑھا کتا ایک لمحے کے لیے میرے پاؤں میں لوٹتا ہے اور پھر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ جاتا ہے جیسے ہی میں

اپنی اکلوتی سیاہ اچکن اتار کر، جس کے نیچے کوئی قمیص نہیں ہوتی، الگنی پر ڈال دیتا ہوں تو میری ماں میرے سامنے چنے کی دال کا ایک کٹورہ رکھ کر چمچ دھونے کے لیے گھڑے سے پانی انڈیلتی ہے تو میں بھنا کر کہتا ہوں "روز دال! روز دال!! اور وہ بھی چنے کی! آخر یہ گھر کب تک طویلہ بنا رہے گا؟" تو میری ماں آہستہ سے کٹورے میں چمچ ڈال دیتی ہے۔ "راشن کے لیے پیسے نہیں تھے، آٹا نہ آسکا آج سب نے خالی دال ہی کھائی ہے" جب میں اس کا جواب دینے لگتا ہوں تو میرا باپ جو بازار میں بیچنے کے لیے لفافے بنا رہا ہوتا ہے اندر سے پکار کر کہتا ہے "اس سے کہہ دو ہم تمہارا خرچ برداشت نہیں کر سکتے۔ آپ کمائے اور چاہے موتی چور کے کھائے۔ غضب خدا کا جس شخص کو بنک والوں نے ساٹھ روپے کی نوکری دینے سے انکار کر دیا وہ چنوں کی دال پر ناک سکوڑتا ہے۔ اسرائیلی کہیں کا!"

گاتو

وہ زیر تعمیر بنگلے کی ان ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ڈھیر پر بیٹھا تھا جنہیں لمبی دستیوں والی چھوٹی چھوٹی ہتھوڑیوں سے توڑ کر روڑی میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ پھر ان کنکریوں میں سیمنٹ اور راکھ ملا کر بنیادوں میں ڈالتے ہیں اور اوپر عمارت اٹھاتے ہیں۔

زیر تعمیر بنگلے کے نامکمل ستونوں سے لوہے کی سلاخیں اوپر کو نکلی ہوئی تھیں اور مسلسل بارشوں سے ان کا رنگ سیندوری ہو گیا تھا۔ اردگرد کی کوٹھیوں میں رہنے والے لونڈوں نے رسیوں کے پھندے پھینک پھینک کر دو تین سلاخوں کو اس طرح دُہرا کر دیا تھا کہ ان کے سرے پیل پایوں کے قدموں تک پہنچ گئے تھے۔ قدآدم اٹھی دیواروں سے خانساماں لوگ اینٹیں اکھاڑ کر باورچی خانوں میں نئے چولہے بنانے کے لیے لے آئے تھے، اور آہستہ آہستہ یہ بنگلہ کھنڈر بنتا جا رہا تھا۔

اسی بنگلے کے پہلو پر عارفہ اور صدیقہ کے کمرے کی کھڑکیاں کھلتی تھیں جن پر پیاز کے پرت ایسے نائیلون کے پردے پڑے تھے۔ یہ دونوں بہنیں کاسنی دوپٹے اوڑھ کر سکول جایا کرتی تھیں اور شام کو ایک دوسری کے کندھے کا سہارا لے کر لباس تبدیل کیا کرتی تھیں۔ پرے یزدانی صاحب کی کوٹھی پر، اوپر برساتی میں، ان کا سب سے چھوٹا لڑکا انور رہتا تھا جو دوسری مرتبہ میٹرک کا امتحان دے رہا تھا اور غسلخانے سے اپنے اباجان کے بلیڈ چرایا کرتا تھا۔ اس بنگلے کی پشت پر بڑی سی کریم کلر کوٹھی میں ایک امریکی جوڑا رہتا تھا جو بالائی منزل کے سپاٹ چھجے پر چھوٹا سا تولیہ بچھا کر دھوپ سینکا کرتا تھا۔

بیگم نیاز نے اپنے بیڈ روم کے سنگار میز سے سرخ ربن اٹھا کر رنگ ماسٹر کی طرح جھٹکا اور اپنے پھولے ہوئے بالوں میں باندھ لیا۔ پھر سفید ڈوری کے سرے پر لگی ہوئی پنگ پانگ کی گیند کھینچی اور لوہے کے فریم میں جڑے ہوئے اڑتالیس شیشوں والے دریچے سے ویل ویٹ کے پردے ادھر ادھر ہٹ گئے۔

دریچے کے عین سامنے وہ زیر تعمیر بنگلے کی ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ڈھیر پر بیٹھا تھا۔ بیگم نیاز نے نفرت سے بھویں سکیڑ کر دوسری گیند کھینچی اور پردہ پھر اپنی جگہ پر آ گیا۔ غصہ سے دانت پیس کر وہ سنگار میز کے سٹول پر بیٹھ گئیں اور رنگھی ہو کر بولیں: "تو یہ رذیلوں کی اولاد کس قدر ضدی اور اڑیل ہوتی ہے۔ جو کچھ ماں باپ سکھا دیں کیا مجال جو رتی بھر بھی ادھر سے ادھر سرک جائیں۔ صبح صبح پھر آ کے بیٹھ گیا۔ حرامزادہ"۔

مسٹر نیاز اپنی بیگم کو خوش کرنے کے لیے مسکرائے اور لیٹے لیٹے تکیے کے نیچے ہاتھ پھیر کر سگرٹ تلاش کرنے لگے۔ بیگم نے منہ سُجا کر کہا: "آپ سے اتنا بھی تو نہیں ہو سکتا کہ اس کے باپ کو بلا کر دھمکائیں اور اسے اپنا رویّہ ٹھیک کرنے کو کہیں۔ آپ نے تو ماتحتوں کو سر چڑھا لیا ہے"۔ مسٹر نیاز نے دیا سلائی کو پھونک مار کر بجھا دیا اور اپنے سگرٹ کا تازہ تازہ سلگا ہوا گُل دیکھ کر بولے: "وہی ہو گا حضور، جو آپ فرما رہے ہیں۔ جناب نے دھمکانے کو کہا ہے میں اسے ٹرانسفر ہی کر دوں گا"۔ بیگم نے ربن کو چٹکی میں پکڑ کر کھینچا اور زمین پر پھینک دیا۔ ان کے پھولے ہوئے بال کانوں پر آ گرے۔ مسٹر نیاز نے اپنے موٹے ہونٹ کی پتلی سی پپڑی نوچتے ہوئے کہا: "سرکار کے تیور کچھ کڑے پڑتے ہیں کہیں ہمی نہ مارے جائیں۔ بیگم صاحبہ اس بات پر بھنا کر بولیں: "کل شام اس فتنہ نے جو مجھ سے کی ہے خدا کرے تمہارے ساتھ ہوتی پھر آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوتا۔ وہ تو میرا جی تھا جو چپکی ہو رہی ورنہ اس حرامی پر پلّو ٹوٹ چھوڑ دیتی۔ قیمہ ہی باندھ کے لے جاتے گھر والے"۔

مسٹر نیاز نے کہنیوں کے بل ہو کر سر پیچھے ڈال دیا اور سگرٹ چچوڑتے ہوئے بولے

گھبرایئے نہیں، میں اس کے باپ کی آج ہی جواب طلبی کروں گا اور اس کی تبدیلی کے آرڈر نکال کر آج شام ہی بستر گول کروا دوں گا۔ ذلیل کہیں کا۔"

"اور اگر آپ نے تبدیلی نہ کی تو؟" بیگم نے بگمانہ انداز میں پوچھا۔

"تو آپ ہمیں اپنے گھر نہ گھسنے دیجیے گا۔"

بیگم نے زمین پر گرا ہوا رن پھر اٹھا لیا۔

قیوم کے ابا دفتر میں نوکر تھے۔ وہ صبح پتلون کو کلپ لگا کر بائیسکل پر دفتر جاتے اور شام کو تھیلا لے کر پیدل سبزی لینے جاتے۔ کبھی کبھی قیوم بھی ان کے ساتھ جاتا۔ خوانچے والوں کو دیکھ کر رک جاتا۔ کبھی کہتا مجھے یہ لے دو۔ کبھی کہتا وہ لے دو۔ اس کے ابا بہت ناراض ہوتے۔ کبھی جھڑکتے، کبھی ہاتھ پکڑ کر کھینچتے۔ گھر پہنچ کر اس کی ماں سے کہتے، دوبارہ میں قیومی کو ساتھ نہ لے جاؤں گا۔ یہ بہت تنگ کرتا ہے۔ راستے میں رک رک جاتا ہے۔

قیومی کی امی کہتی: اچھے بچے یوں نہیں کیا کرتے۔ بڑوں کا کہا مانتے ہیں۔ جس طرح وہ کہتے ہیں اسی طرح کرتے ہیں۔ دیکھو تو اسد کس طرح اپنے ماں باپ کا کہا مانتا ہے۔ سبھی اس سے پیار کرتے ہیں۔ ہر ایک اسے اچھا سمجھتا ہے۔

قیومی نے کہا: اس کے ابا نے تو اُسے طوطا لا کر دیا ہے۔ میرے پاس کوئی طوطا ہے؟ اس نے کہا: تُو طوطا لے کر کیا کرے گا۔ غصہ میں آئے گا تو انگلی کتر ڈالے گا۔ ذرا پنجرہ کھلا رہ جائے گا تو پھر سے اڑ جائے گا۔ قیومی نے کہا: پھر مجھے ایک چھوٹا سا کتا لے دو جیسا جمی کے پاس ہے۔ اس کی امی بولیں: ہم کتا کہاں رکھیں گے۔ جمی تو کوٹھی میں رہتا ہے۔ ان کے کئی نوکر ہیں، وہ ہر چیز کی دیکھ بھال کرتے ہیں، ہم کتا کیسے پال سکیں گے؟ قیوم نے جواب دیا: میں کتے کو زنجیر سے باندھ دوں گا۔ آدھا دودھ اس کو پلاؤں گا، آدھا خود پیوں گا۔ سکول سے آ کر سیر کرانے لے جاؤں گا۔ جب بڑا ہو جائے گا تو چوروں کو مارا کرے گا۔ قیوم کی امی نے کہا: بیٹا کتا چوبارے پر نہیں رہ سکتا۔ بڑے تنگ

میں منڈلاتا ہے۔ غصہ میں آجائے تو بوٹی نکال لیتا ہے۔ اڑوس پڑوس کی مرغی پکڑ لے تو پیسے بھرنے پڑجاتے ہیں۔ تو کتا لے کر کیا کرے گا؟ قیوم نے کہا: پھر مجھے بلی لے دو۔ میں اسکے گلے میں ......
اس کے باپ نے جھڑک کر کہا "بکواس بند کرے گا کہ نہیں بلی کا بچہ؟" قیوم سہم کر دیوار سے لگ گیا۔

قیوم کے ماموں انڈونیشیا میں رہتے تھے۔ پہلے وہ کراچی رہا کرتے تھے۔ پھر ان کی بدلی انڈونیشیا ہوگئی۔ جھٹ پٹ شادی کرا کے ماموں انڈونیشیا پہنچ گئے۔ قیوم کے ابا شام کو نیچے اتر کر جلد ساز کے پاس جا بیٹھتے۔ حقہ پیتے۔ انڈونیشیا کی باتیں کرتے: کالی مرچ وہاں دو آنے سیر بکتی ہے، زیرہ ایک آنہ سیر، گوشت چونی کا آدھا سیر، پھل ایک روپے کا ٹوکرا بھر۔ قیوم کی امی پڑوسن سے کہتیں: انڈونیشیا سے بھائی کا خط آیا ہے۔ بنگلے میں رہتا ہے۔ پانچ نوکر ہیں۔ اگلے مہینے کار خریدے گا۔ آتا ہوا ساتھ لائے گا۔ دو ریڈیو خریدے ہیں۔ ایک میرے لیے، دوسرا اپنے لیے۔ بجلی کی مشین بھی لی ہے۔ آپ سے آپ کپڑے سیتی ہے۔ وہاں ہر چیز سستی ہے۔ پچاس ساٹھ میں اچھا گزارا ہو جاتا ہے۔

قیوم نے دونوں کی باتیں سنیں بہت خوش ہوا۔ تالی بجا کر بولا: امی مجھے وہاں سے ایک بلی منگوا دو۔ سستی مل جائے گی۔ میں اس کے گلے میں پیلا ربن باندھوں گا۔ دو ٹانگوں پر چلنا سکھاؤں گا۔
امی نے کہا: ________ صدقے جاؤں بلی کیسے آئے گی۔ ماموں کے آنے میں تو دیر ہے۔

قیوم نے کہا: ماموں کو لکھیے۔ وہ ڈبے میں بند کر کے بھیج دیں گے۔ ڈاکیا دے جائے گا۔

قیوم کی امی ہنس پڑیں۔ پیار بھرے لہجے میں بولیں: ڈبے میں بیچاری بھوکی پیاسی مر جائے گی۔ سانس رک جائے گی۔ دم گھٹ جائے گا۔

قیوم نے کہا: ماموں کو لکھیے چھیدوں والے ڈبے میں بھیجیں۔ ساتھ ہی دودھ کی بوتل رکھ دیں۔ ماں نے بیٹے کو کلیجے سے لگا لیا اور جھلا جھلا کر تھپکنے لگی۔

ایک دن قیوم کے ابا دفتر سے آئے تو ان کی بیوی نے کپڑے دھونا چھوڑ کر کہا: "جی پتہ ہے آج قیومی نے کیا کیا؟"

خواجہ صاحب وہیں رک گئے اور گھبرا کر بولے: "کیا؟"

بیوی نے کہا: "میں صدیق بھیا کو خط لکھتی تھی کہ میرے پاس ایک پرچی لکھ کر لے آیا۔ کہنے لگا ماموں کو میرا خط بھی بھیج دو۔ میں نے دیکھا۔ ہائے صدقے جاؤں۔ ایسا پیارا خط لکھا تھا کہ شاید آپ سے بھی نہ لکھا جائے۔"

"کیوں"؟ خواجہ صاحب نے کلپ اتارتے ہوئے پوچھا۔

"لکھا تھا: میرے پیارے ماموں جان جی۔ میں آپ کو بہت یاد کرتا ہوں، جلدی آجائیں۔ میرے لیے ایک بلی لانا۔ چھوٹی موٹی کی بلی نہیں، ہچیں مچی کی بلی۔ بڑے بالوں والی۔"

یہ کہہ کر خواجہ صاحب کی بیوی ہنسنے لگیں اور خواجہ صاحب ماتھے پر تیوڑی ڈال کر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ان کی بیوی نے کپڑوں کا جھل پرے دھکیل دیا اور خود پیڑھی گھسیٹ کر ان کے پاس پہنچ گئیں۔ خواجہ صاحب نے پوچھا: "کوئی خط آیا تھا؟"

"کوئی نہیں۔" ان کی بیوی نے آٹھویں کی لڑکی ایسا سر ہلا کر جواب دیا اور پھر خواجہ صاحب کے زانو پر دونوں ہاتھ رکھ کر کہنے لگیں: "توبہ اللہ آپ تو بس منہ سجا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ قیومی کی بات سنائی پھر بھی ہنسی نہیں آئی۔"

خواجہ صاحب نے کہا: "لعنت بھیجو۔ حالات ہی ایسے ہیں۔ ہنسی کیسے آئے۔"

ان کی بیوی نے کہا: "حالات کو بیشک گولی مارو پر میرے قیومی کو کچھ نہ کہو۔ منہ بھر کے بات کر دیتے ہو۔"

خواجہ صاحب نے کہا: "چپ رہو مریم میں تھکا ہوا ہوں۔"

مریم چپ ہو گئی اور خواجہ صاحب ویسے ہی پتلون پہنے چارپائی پر دراز ہو گئے۔

انڈونیشیا کی پاکستانی ایمبیسی میں اپنی سروس ڈیوریشن ختم کرنے کے بعد جب قیوم کے ماموں واپس پاکستان آئے تو فارن آفس میں چارج لینے کے بعد سیدھے لاہور پہنچے۔ وہ اپنی سسٹر کے لیے بہت سی چیزیں لائے تھے۔ ان میں ریڈیو سیٹ یا سوئنگ مشین وغیرہ تو نہ تھیں، البتہ سمر

میں پہننے کے پرنٹیڈ کپڑے منزور تھے۔ کچھ ڈوڈن سٹیچو تھے جو وہاں کے فوک ڈانسرز کی مختلف پوزوں پر مشتمل تھے۔ اپنے برادران لا کے لیے وہ سوٹ کا کپڑا لائے تھے اور ایک آئی وری ہینڈل کی خوبصورت سی چھڑی۔ لیکن جب انہوں نے قیوم کا گفٹ دینے کے لیے بوٹ کا ڈبہ کھولا تو اس میں سے ایک چھوٹا سا بلی کا بچہ نکلا۔ جس نے ڈھکنا کھلتے ہی ننھی سی چھینک ماری اور اپنی کمر محراب بنا کر انگڑائی لی۔ قیوم خوشی سے دیوانہ ہو گیا اور ماموں کی کمر میں باہیں ڈال کر مارک ٹائم کرتے ہوئے ناچنے لگا۔ اس کے ابا نے جھڑک کر کہا: "گدھا کہیں کا۔ کیا بے صبرا ہوا ہے۔"

امی بولیں: "بیٹا شور تو نہ کرو۔ ماموں جی غصے ہوں گے۔"

ماموں نے کہا: "یہ بڑی ونڈرفل بلی ہے۔ اسے سیامیز کیٹ کہتے ہیں۔ جکارتا میں ایک کرنل کے پاس تھی۔ میں نے قیوم کا لیٹر پہنچتے ہی ایک بلونگڑا خرید لیا۔ جسٹ سی! اس کے کان اور ناک دونوں سیاہ ہیں۔ یہی سیامیز کیٹ کی پہچان ہے۔"

قیومی نے ماموں کی کمر پیچھے سے سر نکالا اور بلی کو پیار دینے کے لیے ذرا سا آگے بڑھا۔ بلی نے ایک اور انگڑائی لی اور قیومی سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ سب ہنسنے لگے۔ ماموں نے کہا: "کم آن۔ کم آن۔ یہ تو تمہاری فرینڈ ہے۔ ہم نے اسے تمہارا نام بتا دیا ہے۔ بالکل کچھ نہیں کہے گی۔ پھر انہوں نے بلونگڑے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور اس کے جسم سے خر خر کی آواز نکلنے لگی

قیوم کی امی نے کہا: "صدیق ہماری بلیوں کے اندر بھی ایسی آواز ہوتی ہے؟"

"نہیں" خواجہ صاحب نے کہا "ادھر کی بلیاں تو کاٹھ کی بنی ہوتی ہیں۔ ہاتھ پھیرو تو برادہ جھڑتا ہے۔ واہ عقل کی کودن!"

قیوم کے ماموں نے کہا: "سیامی کیٹ بس ایک ہی بچہ دیتی ہے اس کے بعد ساری لائف ویسے ہی پاس کر دیتی ہے۔"

"بڑی بڑی بیچاری بلی ہے۔" خواجہ صاحب شرارت سے مسکرائے۔

"مریم نے کہا: "ہائے اللہ اک بچہ صرف! مر جائے تو ماں کا جی ویران ہو جائے۔ ہے نا؟"

خواجہ صاحب نے کہا: "بلی ماں اور عورت ماں میں بڑا فرق ہے۔ بلی کے بچے کو نہ سونے کے سہرے لگتے ہیں نہ اسے ڈپٹی بننا ہوتا ہے اس لیے وہ بچے کو رو دھو کر بھول جاتی ہے۔ عورت ماں کا بچہ مرتا ہے تو اس کے ساتھ ایک دولہا مرتا ہے۔ ایک ڈپٹی مرتا ہے۔ کمائی کا ذریعہ ڈڈ بتا ہے۔ جب اتنی ساری چیزیں ایک ساتھ فنا ہو جائیں تو کس کا جی ویران نہ ہو گا بھلا۔"

صدیق نے کہا "بھائی جان تو فلسفی ہو گئے۔"

خواجہ صاحب بولے: "اسلام آباد میں رہے گا۔ دو چار بچے ہو جائیں گے۔ تیلون گھس جائے گی تو تیری فلاسفی بھی خود بخود نظر آنے لگے گی۔"

قیوم کی امی چمک کر بولیں: "توبہ میری۔ کسی کی بات کو یوں تو نہیں مروڑا تروڑا کرتے۔"

اس گفتگو میں سارے یہ بھول گئے کہ قیوم ابھی تک ماموں کی کمر سے لپٹا ہوا ہے اور چور آنکھوں سے بلونگڑے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ خواجہ صاحب نے کہا: "شاباش شیر بترا۔ تھوڑا اور ماموں کی بغل میں چھپ جا۔"

ماموں نے قیوم کا آرم پکڑ کر سوتیلی اپنی طرف کھینچا اور کہا: "کم آن۔ یہ تو فرینڈلی ہے۔ تم سے تو ماں باپ سے بڑھ کر پیار کرے گی۔ تمہارے لیے لایا ہوں تم نے لیٹر لکھا تھا کہ نہیں؟"

قیوم نے اثبات میں سر ہلایا اور تھوڑا سا باہر نکل آیا۔

"پچ اٹ! پچ اٹ!!" ماموں نے قیوم کا ہاتھ پکڑ کر بلی کی فر پر پھیرا اور کہا: "دیکھا۔ کچھ بھی نہیں کہتی ناں۔" قیوم نے نفی میں سر ہلایا اور ماموں کے گھٹنے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

"اس کا نام ڈیزی ہے ماموں؟" قیوم نے ہولے سے پوچھا۔

"اور خواجہ صاحب ہنس پڑے۔" ہاں ڈیزی جیکسن! بڑی حرامزادی تھی۔ ایسی پکی جالندھری میم تھی۔ خانساموں، خاکروبوں کی موسیائی نکال لیتی تھی۔"

"بس بس" مریم نے کہا: "اب اس کی گندی باتیں نہ سنانے لگ جانا۔ ہم تو قیوم کی بلی کا کوئی اور ہی نام رکھیں گے۔ ہیں ناں بھئی قیومی؟"

قیوم نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے ماموں نے مسکراتے ہوئے کہا: "اس کا نام تو گاتو ہے...."

"گاتو ماموں؟" قیوم ایک دم بولا۔

"ہاں" ماموں نے سوچتے ہوئے کہا: "گاتو اٹالئین لینگویج میں بلی کو کہتے ہیں۔"

"بڑا واہیات نام ہے" خواجہ صاحب بولے۔

"واہیات نہ واہیات چنگا بھلا ہے" مریم نے یقین سے کہا۔

"ہاں امی بڑا اچھا ہے گاتو۔ ہے نا ماموں؟"

"شاباش" ماموں نے قیوم کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور گاتو کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر قیوم کی طرف بڑھایا۔ ——— قیوم ڈرا، جھجکا، ایک قدم پیچھے ہٹا، پھر اس نے اپنا چہرہ ذرا سا ایک طرف موڑ کر گاتو کو ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ گاتو نے اپنی دم پچھلی ٹانگوں میں دبا لی اور پنجے بغلوں میں چھپا لیے۔ قیوم نے اسے اور قریب کیا تو گاتو نے ہولے سے میاؤں کی آواز نکالی۔ قیوم نے ڈرتے ڈرتے اس کے گلابی ناک پہ ہولے سے پھونک ماری۔ گاتو نے آنکھیں بند کر لیں۔ قیوم کا حوصلہ بندھا اور اس نے بند آنکھوں والی گاتو اپنی گال سے لگا لی۔ گاتو خرخر بولنے لگی۔

اب محلے کے بچے قیوم سے کھیلنے لگے۔ کوئی کہتا ذرا سی دیر کو گاتو میری گود میں دو۔ کوئی کہتا ایک منٹ مجھے دو۔ قیوم ہر ایک کو اپنی بلی دے دیتا۔ اس کے دوست گاتو کو گود میں اٹھا کر پیار کرتے۔ اپنے گھروں سے دودھ چرا لاتے۔ گاتو کو پلاتے خوش ہوتے۔ قیومی کہتا، میرے ماموں لائیٹ سے لائے ہیں۔ صاحب سے خریدی ہے سو روپے میں آئی ہے۔ امی نے مجھے ربن دیا ہے صدیق چچا اس کے لیے گھنگرو لائے ہیں۔ ابھی چھوٹی ہے۔ بڑی ہو جائے گی تو چوہے مارے گی۔ شیر سے لڑے گی۔ میرے ساتھ سکول جایا کرے گی۔ اس کے دوست پوچھتے: جب گاتو بڑی ہو جائے گی پھر بھی تو ہمیں اس سے کھیلنے دیا کرے گا؟ قیومی کہتا اگر تم میرا بستہ اٹھا کر لے جایا کرو گے تو کھیلنے دوں گا۔ نہیں تو نہیں۔ سب بچے ایک ساتھ بولتے۔ میں اٹھا کر لے جاؤں گا۔ میں اٹھا کر لے جاؤں گا۔ قیومی خوش ہو کر گاتو کو گلے سے لگاتا۔ اس کا منہ چومتا۔ بلی خرخر کرنے لگتی۔

قیوم کی امی کہتی تو تو اس بلی پیچھے پاگل ہو جائے گا۔ تختی لکھتا ہے تو گود میں بٹھا کر۔ روٹی کھاتا ہے تو ساتھ بٹھا کر۔ سوتا ہے تو گلے سے لگا کر۔ آخر اس میں ہے کیا۔ تجھے اتنی اچھی کیوں لگتی ہے۔ قیوم کہتا: میری گاتو ہے نا۔ آپ کو کیا۔ جب میں سکول سے آتا ہوں دروازے میں بیٹھی ہوتی ہے۔ سیڑھیوں میں میری آواز سنتی ہے۔ میاؤں میاؤں کرنے لگتی ہے۔ جو میں کہتا ہوں وہی کرتی ہے۔ میں اسے کہانیاں سناتا ہوں۔ یہ مجھے گانا سناتی ہے۔ گانے کی بات سن کر قیوم کی امی ہنس پڑیں۔ کہنے لگی گانا نہ گانا۔ تمہاری بلی تو گونگی ہے۔ قیوم کو اس بات پر بہت غصہ آیا پہلے بھس بھس کی۔ پھر بھیں بھیں رونے لگا۔ گاتو سہم کر کونے میں جا دبکی۔ قیوم کی امی نے کہا: میں تو یونہی کہہ رہی تھی۔ یہ تو سچی مچی بہت اچھا گاتی ہے۔ میں نے بھی سنا ہے اس کا گانا۔ قیوم ایک دم چپ ہو گیا۔ آستین سے آنسو پونچھے اور بولا: ہے نا امی رات کو گاتی ہے نا؟ امی نے کہا ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میں نے خود سنا ہے۔ قیوم نے لپک کر گاتو اٹھالی۔ جھولی میں ڈالی اور پیار کرنے لگا۔

ایک شام جب خواجہ صاحب دفتر سے لوٹے تو انہوں نے مریم سے کہا: "آج بیگم صاحبہ دفتر آئی تھیں۔"

"تمہارے دفتر؟" مریم نے بے تعلقی سے کہا: "اپنے خاوند سے ملنے آئی ہوگی۔"

"تو اور کیا مجھ سے ملنے آئی تھی۔" خواجہ صاحب چارپائی پر دراز ہو گئے اور مریم ان کے پاس پائینتی پر بیٹھ گئی۔ اپنے شوہر کے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بولی: "آج روٹی کھائی تھی۔"

"ہاں" شوہر نے آنکھیں بند کر کے کہا: "پلاؤ اور مرغ کا شوربہ انگور اور کیلے کا کسٹرڈ۔"

مریم نے اپنے خاوند کو زور سے جھنجوڑا اور کہا: "ہائے اللہ میرے ساتھ تو مذاق نہ کرو۔"

"خدا کی قسم!" خواجہ صاحب نے آنکھیں کھول دیں اور پتلون کے پائینچے تلے تمغہ کھجا کر بولے: "بیگم صاحبہ اپنے ساتھ بنگلے پر لے گئی تھیں۔"

"اللہ خیر" مریم نے مسکرانے کی کوشش کی "اتنی مہربانیاں کیوں بھلا؟"

خواجہ صاحب تھوڑی دیر تک چپ رہے پھر بولے: "سنو مریم! بیگم صاحبہ نے گاتو مانگی ہے۔"

" گاتو!" مریم کے منہ سے چیخ نکل گئی " قیومی کی بلی "

" ہم اسے کوئی اور لے دیں گے۔ یہ امیروں کے رکھنے کی بلی ہے وہی اس کی ذات کی قدر سمجھتے ہیں "

" امیر جائیں دوزخ میں۔ میرے لال کی بلی۔ میں تو کسی کو ہاتھ بھی نہ لگانے دوں"

خواجہ صاحب نے مریم کی بات پر جان بوجھ کر توجہ نہ دی اور بولے: "پرسوں صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور کہا: "خواجہ صاحب سنا ہے آپ کے پاس ایک بلی ہے" میں نے جواب دیا " جی ہاں ہے۔ پوچھنے لگے کیسی ہے؟ میں نے کہا جی پتہ نہیں۔ چھوٹی سی ہے۔ میرے لڑکے کا ماموں انڈونیشیا سے لایا تھا، صاحب نے میز کی دراز سے ایک کتاب نکالی۔ اس میں بلیوں کی ہزاروں تصویریں تھیں۔ مجھے دکھا کر کہنے لگے۔ پہچانو تو تمہارے والی بلی کس سے ملتی ہے۔ میں نے آٹھ دس ورق ہی الٹے ہوں گے کہ گاتو جیسی بلیوں سے پورا ایک صفحہ بھرا ہوا نکل آیا۔ میں نے صاحب سے کہا ایسی ہے جناب عالی، صاحب بہت خوش ہوئے کہنے لگے ہماری بیگم کو بلیوں کا بہت شوق ہے۔ یہ کتاب انہی کی ہے۔ انہوں نے ہی درخواست کی تھی کہ اگر آپ ازراہ کرم اپنی بلی ہمیں تحفہ دے دیں گے۔ تو آپ کی نوازش ہوگی۔ یہ سن کر میں شرمندہ سا ہو گیا اور نظریں جھکا لیں۔ صاحب نے پھر پوچھا تو میں نے کہا: "صاحب وہ میرے بچے کی بلی ہے اور اسی کے لیے...... مگر صاحب نے میری بات پوری نہ سنی اور کہا بچے کا کیا ہے اُسے تم کوئی کھلونا ولونا دے کر بہلا لینا۔ کوئی ایسی مشکل بات نہیں —— بچے ویسے بہل ہی جایا کرتے ہیں " یہ کہہ کر صاحب نے مجھے واپس اپنے کمرے میں بھیج دیا اور آج بیگم صاحبہ آگئیں کہ چلو ابھی بلی لا کر دو۔ میں نے کل کی مہلت مانگی ہے۔

مریم نے یہ ساری بات خاموشی سے سن کر کہا: "بیگم صاحبہ ہوں گی تو اپنے گھر ہوں گی۔ ہم کوئی اس کا دیا ہوا کھاتے ہیں جو بلی دے دیں میرے قیومی کی تو اس میں جان ہے "

" خواجہ صاحب نے کہا " اور ہماری جان صاحب کے اختیار میں ہے "

" کیوں؟" مریم نے تنک کر پوچھ تو لیا، لیکن فوراً ہی اسے محسوس ہوا کہ اس میں بھلا ایسی

کون سی مشکل بات تھی جو سمجھ نہ آتی — مریم رونے لگی تو اس کے خاوند نے اسے سینے کے ساتھ لگا لیا اور کہا: "میں کل قیوم کے سکول جانے کے بعد دفتر جاؤں گا اور گاتو کو ساتھ لے جاؤں گا۔ اور بیگم صاحبہ کے بنگلے پر چھوڑ آؤں گا۔ جب قیوم سکول سے آئے گا تو ہم کہہ دیں گے کہ محلے کی آوارہ بلیوں کے ساتھ بھاگ گئی۔

مریم اپنے خاوند کے کندھے سے لگی روتی رہی اور اس کا سارا وجود سسکیوں سے ہچکولے کھاتا رہا۔

قیوم چوبارے کی چھت پر کھڑا بہت رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں گاتو نہ کسی کوٹھے پر نظر آتی تھی۔ نہ کسی صحن میں۔ اس نے چاروں طرف منہ اٹھا کر آوازیں دیں۔ گاتو۔ گاتو! — گاتو گاتو!! پر کوئی بھی نہ بولا۔

قیوم روتا ہوا نیچے اتر آیا۔ اس کی امی نے کہا۔ صدقے جاؤں کیوں ہلکان ہوتا ہے۔ آج گئی ہے۔ کل واپس آجائے گی۔ بلی اپنا گھر نہیں چھوڑتی۔ سال بعد بھی واپس آجاتی ہے۔ نہ آئی تو میں اپنے چاند کو اور لے دوں گی۔ اور کا نام سنا تو قیوم اور زور زور سے رونے لگا۔ چیخیں مارتا نیچے اتر گیا۔ جلد ساز کی دکان پر پہنچا۔ کہنے لگا میری گاتو یہاں تو نہیں آئی؟ دفتری نے کہا اس نے کیا جلد بندھوانی تھی جو یہاں آتی۔ قیوم نے پنساری سے پوچھا۔ شربت والے سے پوچھا۔ قصائی کے تختے نیچے نالی میں ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ سگرٹ والا بولا: کلرک کا لونڈا کیا گاتو گاتو کر رہا ہے۔ یہاں بلیاں غائب ہو جاتی ہیں۔ یہ بلونگڑے کو رو رہا ہے۔ بڑا ہو گا تو آپ ہی سمجھ جائے گا۔ قیوم کے دوست کہنے لگے بڑی مسجد کے مولوی جی سے لوٹا پھروا تے ہیں۔ وہ چور کی پرچی نکال دیں گے۔ دوستوں کو ساتھ لے کر قیوم روتا روتا مولوی کے پاس پہنچا۔ مولوی کانا تھا۔ اس نے ساری بات سنی۔ ڈاڑھی ہلا کر بولا: پانچ پیسے لاؤ۔ میں لوٹا گھما دوں گا۔ سب نے ایک ایک پیسہ ڈال کر پانچ پیسے جمع کیے۔ مولوی نے لوٹا گھمایا۔ بھنگن کے نام کی پرچی نکلی۔ قیوم غصے میں دیوانہ۔ زور زور سے دھاڑیں مارتا بھنگیوں کے کوارٹر پہنچا۔ جاتے ہی اپنی بھنگن سے الجھ گیا۔ اس کی اوڑھنی پھاڑ ڈالی۔ ٹانگوں سے چمٹ گیا۔ چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ میری گاتو دو۔ میری بلی دو۔ بھنگن نے پرے دھکیلا۔ قیومی نے

اس کی کلائی میں کاٹ کھایا۔ بھنگن نے جلدی سے ہاتھ چھڑایا تو گلٹ کا کنگن قیومی کے ماتھے میں لگا۔ خون کی ایک پتلی سی لکیر دوڑنے لگی۔ بھنگی نے روتے ہوئے قیوم کو اٹھایا۔ ان کے گھر لے آیا۔ امی نے دوپٹہ پھاڑ کر پٹی باندھی۔ خواجہ صاحب نے قیوم کو اس حالت میں دیکھا۔ چپ چاپ نیچے اتر گئے۔

جاڑے کا موسم تھا خشک سردی پڑ رہی تھی زمین سے آسمان تک یخ بھری ہوئی تھی اور انسان سے حیوان تک سبھی کانپ رہے تھے۔ قیوم ماتھے پر پٹی باندھے اپنی ماں کے ساتھ بستر میں دبکا ہوا تھا۔ اس نے کئی خواب دیکھے۔ جلد ساز کٹائی کی مشین کے نیچے کترنوں میں سے گاتو نکال کر ان کے یہاں دینے آیا تھا۔ گاتو کے گلے میں ہلکی نیلی اور مٹیالے رنگ کی کترنیں الجھی ہوئی تھیں۔ شربت والے نے گاتو گود میں اٹھا رکھی تھی اور اس کی پوستین کے بال صندل اور بزوری سے چپکے ہوئے تھے۔ پنساری کا لڑکا اوپر چوبارے میں بلی لایا تھا اور وہ ساری ہلدی میں لتھڑی ہوئی تھی۔ بھنگی دروازے پر دستک دے کر کہہ رہا تھا "بی بی جی۔ بلی لے لو جی"۔ بھنگی کی اس دستک سے قیوم کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اپنی ماں کا گول گول کندھا پکڑا ہوا تھا اور اس کی ماں اس کے ابا سے کہہ رہی تھی: "اس مرنے جوگی خچر کے اپنے تو اولاد نہ ہوئی۔ دوسروں کے بچوں کا نور نکال کر لے گئی"۔

خواجہ صاحب نے کہا: "لعنت بھیجو۔ اس کا نام ہی نہ لے۔ مجھ سے تو قیوم کے ماتھے پر زخم دیکھا نہ گیا اسی لیے میں نیچے اتر گیا تھا"۔ مریم نے کہا: "اللہ کرے اسے ساری عمر بچہ نہ ہو — سوکھی بنجر ہی مر جائے خدا کرے۔ میرے لال کو ہلکان کر دیا"۔ خواجہ صاحب بولے: "کیا کریں پوزیشن ہی ایسی ہے صاحب تو کھڑے کھڑے نوکری سے نکال سکتے ہیں۔ اس وقت تو قیوم کی خوشی کو روتے ہیں اس وقت اس کی جان کو رونا پڑے گا"۔ "مٹی تمہارے منہ میں" مریم نے غصے سے کہا "نیاز صاحب کوئی ہمارے رازق ہیں۔ روٹی تو اللہ دیتا ہے"۔

"اس نے وسیلے ہی ایسے بنائے ہیں" خواجہ صاحب نے اپنی بیوی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "اب وہ زمانہ نہیں رہا مریم"۔

اور مریم نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: "اس زمانے نے تو ہماری ہڈیاں پولی کر دی ہیں۔ اللہ کرے نہ رہے یہ زمانہ! میں تو جس دن عید کی ڈالی لے کر گئی تھی اسی دن پتہ لگ گیا تھا کہ کیسی ڈائن ہے تمہاری بیگم صاحبہ۔ سارا وقت میں تو قیومی پہ پڑھ پڑھ کر دم کرتی رہی۔ حبیب پاک اس کے دیدوں سے بچائے۔ بچہ خور لگتی ہے۔ اسی لیے تو گودی نہیں بھرتی۔ اب گا تو کوئے کر دودھ پلاتی پھرے۔"

خواجہ صاحب چپ رہے تو مریم نے پوچھا: "جب تم نے اسے گا تو لے جا کر دی نو بہت خوش ہوئی ہوگی۔"

"ہوں" خواجہ صاحب نے لاتعلقی سے کہا "کہنے لگی شکریہ، صاحب سے کوئی کام ہو تو مجھے بتانا۔ میں نے کہا جی اچھا۔ پھر کہنے لگی بس پہ آئے ہو؟ میں نے کہا نہیں جی سائیکل پر۔ کہنے لگی اچھا کیا یہاں تو گھنٹہ گھنٹہ بس ملتی ہی نہیں۔ پھر اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو کوئی اور کام تو نہیں؟ اور میں سلام کر کے دفتر آ گیا۔"

"حرامزادی" مریم نے دانت پیس کر کہا اور کروٹ بدل کر قیومی کے ماتھے پر ہونٹ رکھ دیے۔

گیارہ بج چکے تھے۔ دھند بالکل مٹ گئی تھی۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ قیومی بستہ اٹھائے سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ اب اسے سردی نہیں لگتی تھی۔ وہ آج سکول نہیں گیا تھا۔ بس سٹاپ تلاش کر رہا تھا۔ وہی بس سٹاپ جہاں پیپل کا پیڑ تھا۔ جہاں وہ اور اس کی امی عید کے دن سوار ہوئے تھے۔ قیومی نے راہ چلتے لوگوں سے پوچھا۔ نیاز صاحب کی کوٹھی کون سی بس جاتی ہے۔ بس کنڈیکٹر سے پوچھا۔ نیاز صاحب کے بنگلے کون سی بس جاتی ہے۔ سب ہنس پڑے۔ کنڈیکٹر نے کہا آج سکول نہیں گئے نا بچو۔ قیوم سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ دوسری بس کی اوٹ میں چھپ گیا۔ ایک تانگے والا آگے بڑھ کر بولا چل تجھے میں چھوڑ آؤں۔ مفت مفت۔ قیوم نے کہا: نا میں نہیں جاتا۔ مجھے ابا ماریں گے۔ پھر ایک اور بس آئی۔ اس پر طوطا مارکہ گرم مصالحہ لکھا تھا۔ عید کے دن وہ اس بس میں سوار ہوئے تھے۔ قیوم جلدی سے آگے بڑھا۔ لپک کر بس پر چڑھ گیا۔

کتنی دیر بعد کنڈیکٹر قیوم تک پہنچا۔ ٹکٹ کا پوچھا۔ قیوم چپ رہا۔ اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ ڈرنے لگا کہیں کنڈیکٹر مارے نہ۔ پر کنڈیکٹر نے اپنے پنچ سے بس کی پائپ بجائی۔ بس رک گئی۔ اس نے قیوم کو اتار دیا۔ دھوئیں کا بادل اٹھا۔ پھر بس اس میں چھپ گئی۔ قیوم نے کہا جدھر جدھر بس جاتی ہے۔ میں ادھر ادھر مڑتا جاؤں گا۔ جب پٹرول پمپ آئے گا بنگلہ خود بخود نظر آجائے گا۔ وہ چلتا رہا۔ ٹکٹکی باندھے بس کو دیکھتا رہا۔ بس غائب ہو گئی۔ قیوم کی رفتار سست پڑ گئی۔ لیکن وہ بستہ جھلاتا برابر چلتا رہا۔

اتنے میں ایک اور بس آئی۔ بڑ والے چوک سے دائیں کو مڑی۔ قیوم بھاگا۔ چوک پر جا کھڑا ہوا۔ بس غاں غاں کرتی سیدھی جا رہی تھی۔ جہاں تک نظر جاتی تھی۔ بس ناک کی سیدھ ادھر ہی جا رہی تھی۔ جب بہت دور بڑی ساری بس کا ایک دھبہ سا رہ گیا تو قیوم نے پھر چلنا شروع کر دیا۔ وہ چلتا رہا۔ چلتا رہا۔ دیر تک چلتا رہا۔ دوپہر گزر گئی۔ سورج کی روشنی پیلی پیلی ہونے لگی۔ ایک دفعہ اس نے نلکے پر چلو بھر پانی پیا۔ تھیلا کھول کر کتابیں نکالیں۔ جھاڑیں اور پھر تھیلے میں ڈال لیں۔ پہلے سورج کے سامنے، سیاہ بادلوں کے ٹکڑے گزرے ٹھنڈی ہوا چلی اور قیوم نے اپنا بایاں ہاتھ نیکر کی جیب میں ڈال لیا۔ سڑک اتنی لمبی تھی کہ ختم ہونے میں نہ آتی تھی پھر بھی وہ چلتا رہا۔ تھک کر رک جاتا تو سردی لگتی چلتا تو گرم رہتا۔ اسی طرح چلتے چلتے جب وہ ٹوٹے پل پر سے گزرا تو سامنے اسے پٹرول پمپ دکھائی دیا۔ قیوم بہت خوش ہوا۔ پہلے اس کے تیز تیز قدم اٹھے۔ پھر وہ بے سوچے بھاگنے لگا۔ سامنے درخت تھے ان کے پیچھے کچھ کوٹھیاں بن رہی تھیں۔ بڑے فوارے کے پاس قیوم کو سگریٹ والے کی دکان نظر آئی اسی کے ساتھ رستہ جاتا تھا۔ ادھر ہی صاحب کی کوٹھی تھی۔

قیوم ڈرتے ڈرتے پھاٹک میں داخل ہوا۔ سرخ سرخ بجری بچھی تھی۔ برآمدے میں پھولوں کے گملے تھے۔ کسی میں موتیا، کسی میں بیلا، کسی میں گلاب، کسی میں گیندا۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر قیوم نے بستہ رکھ دیا۔ ہولے ہولے قدم اٹھاتا دروازے تک آیا۔ شیشوں میں سے دیکھا۔

سنگار میز کے پاس ریشمی بستر پر گاتو بیٹھی پنجہ چاٹ رہی تھی۔ قیوم گولے کی طرح دروازے سے
میں لگا۔ دروازہ کھٹاک سے کھل گیا۔ قیومی نے بجلی کی طرح ٹوٹ کر گاتو کو گود میں اٹھا لیا۔
منہ چوما۔ گلے سے لگایا۔ گاتو خرخر کرنے لگی۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر بیگم صاحبہ اپنا تانپورہ چھوڑ
ادھر بھاگیں۔ قیومی دروازے سے نکلنے ہی لگا تھا کہ انہوں نے اسے بالوں سے پکڑ لیا اور گرج
کر کہا: "حرامزادے، کمینے!"

قیوم نے پورے زور سے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ بال زور سے کھنچے اور اسکی آنکھوں
میں پانی بھر گیا۔ بیگم صاحبہ نے دوسرا ہاتھ قیومی کی چھاتی سے بھنچی ہوئی گاتو پر ڈالا اور قیوم زور
زور سے رونے لگا۔ بیگم نے بال چھوڑ کر سر پہ زور کا دھپا مارا لیکن قیوم گرا نہیں۔ بیگم
زور سے چلائیں "کمینے، رذیل، حرامزادے، چھوڑ ہماری بلی"۔ قیوم نے اونچے اونچے روتے
ہوئے کہا: "یہ آپ کی بلی تو نہیں۔ یہ تو میری گاتو ہے۔ میرے ماموں ولایت سے لائے تھے۔
میرے لیے لائے تھے۔"

"ماموں! ولایت!" بیگم نے دانت پیس کر بڑے بڑے دو دھموکے اس کی کمر میں دیے
اور بلی کو اپنے چنگل میں جکڑنے کے لیے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر زور لگایا۔ قیوم نے اپنی
ٹھوڑی چھاتی سے ملا لی۔ بلی کو اور زور سے بھینچ لیا۔ گاتو بلبلائی۔ بیگم صاحبہ نے مارنا کوٹنا
چھوڑ کر ایک ہاتھ سے قیومی کی انگلیاں مروڑیں اور دوسرے ہاتھ سے بلی چھڑانے کی کوشش
کی۔ قیومی نے ان کی کلائی میں کاٹ کھایا۔ انہوں نے جلدی سے ہاتھ جو چھڑایا تو سونے کا
کنگن قیوم کے ماتھے میں لگا۔ خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ بیگم صاحبہ نے جلدی جلدی دو تین مکے،
تین چار تھپڑ، ایک دو لاتیں رسید کیں۔ قیوم گھٹنوں کے بل گرا۔ بیگم صاحبہ نے پاؤں کمر
پر رکھ کر ٹھوڑی تلے سے گاتو نکال لی اور اپنے سینے سے لگا کر کھڑی ہو گئیں۔

قیوم سپرنگ کی طرح اچھلا اور زور زور سے رو کر کہنے لگا: "میری گاتو دے دو۔ میری
بلی دے دو۔ میرے ماموں میرے لیے لائے تھے۔" بیگم نے آواز دی۔ "کریم کریم" اور قیوم

بلبلانے لگا "اللہ میاں آپ کو ثواب دے گا۔ میری بلی دے دو۔ میری بلی دے دو۔"

بیگم خون آلود نظروں سے قیومی کو گھورتی رہیں۔ قیومی پھر گھٹنوں کے بل گر گیا اور بیگم کا دامن چوم چوم کر اور ہاتھ باندھ کر کہنے لگا میری بلی دے دو جی — یہ میری گاتو ہے ۔ مجھے مار لو جی چاہے جتنا مرضی مار لو پر میری بلی دے دو۔" بیگم ویسے ہی کھڑی رہیں۔ قیوم ان کے پاؤں پہ ہاتھ رکھ کر جلدی جلدی سجدے کرنے لگا۔" اللہ کے واسطے میری گاتو دیدو۔ میری بلی دیدو۔ مجھے روز مار لیا کرو جی۔ میں آپ آجایا کروں گا جی۔ میری گاتو دے دو۔ ابا جی سے پوچھ لو۔ یہ میری بلی ہے۔ انہوں نے ہی آپ کو دی ہے۔ چاہے مجھ سے سارے کام کروالیں۔ مجھ کو نوکر رکھ لیں۔ مجھے سوٹی سے مارلیں جی۔ میں کچھ نہیں کہوں گا۔ میری گاتو — میری گاتو — مجھ کو دے دیں۔" قیومی پھر سجدے کرنے لگ گیا۔ سارا کمرہ اس کے ڈوبتے ابھرتے نالوں سے بھر گیا۔ بیگم آنکھیں سرخ کیسے کھڑی تھیں۔ گاتو ان کے سینہ سے لگی اپنا پنجہ چاٹ رہی تھی۔

کریم نے اندر آ کر پوچھا: "آپ نے مجھے بلایا تھا بیگم صاحبہ؟"

بیگم نے چلا کر کہا: "کہاں مر گیا تھا؟ دیکھ اس حرامزادے نے کیسا تنگ کیا ہے اٹھا کر کوٹھی سے باہر نکال دے۔"

قیوم نے ذبح ہونے والے بیلے کی طرح پتلیاں گھما کر کریم کو دیکھا اور چیخ مار کر کہا: "مجھے باہر نہ نکالو جی۔ میں توبہ کرتا ہوں۔ اللہ کے واسطے۔ توبہ کرتا ہوں جی۔ میری گاتو دے دو۔"

کریم نے اسے گردن سے پکڑا اور باہر دھکیلنے لگا۔ قیوم نے ٹانگیں اکڑا لیں۔ قالین کے نیچے دری میں موٹے موٹے سلوٹ پڑ گئے۔ بیگم نے کڑک کر کہا: "باہر لے جا حرامزادے، کتے کو۔"

کریم نے قیومی کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا تو اس نے ہاتھ باندھ کر کریم سے کہا: "اللہ کے واسطے مجھے گاتو کو ہاتھ لگا لینے دو۔ اپنی بلی کو پیار کر لینے دو بس ایک بار ہاتھ لگا لینے دو۔ اللہ کے واسطے۔ حضرت حضور صاحب کے واسطے۔ اللہ کے۔" لیکن کریم اسے گھسیٹتا ہی گیا۔ بجری پر اس کی نیکر سرخ اور ٹانگیں تومڑی ہو گئیں اور بوٹوں اور جرابوں میں کنکریاں اتر گئیں، گھٹنوں اور پنڈلیوں پر گہری خراشیں

پیدا ہو گئیں۔ قیوم اونچے اونچے رو رہا تھا اور کریم اسے گھسیٹے لیے جاتا تھا۔ سڑک سے پرے، سفید زمین برائے تعمیر کی سوکھی ٹوٹی جھاڑیوں پر دھکا دے کر کریم واپس لوٹ آیا اور آ کر کوٹھی کا پھاٹک بند کر دیا۔ قیوم بڑی دیر تک ریتلی مٹی پر لیٹا سسکیاں بھرتا رہا۔

جب اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو رات چھا چکی تھی سارے بنگلوں کی بتیاں جل چکی تھیں اور ٹھنڈی ہوا سیٹیاں بجانے لگی تھی۔ بادل کے اکا دکا ٹکڑے دبیز ہو کر سارے آسمان پر گھور اندھیرا بن کر چھ گئے تھے۔

قیوم زیر تعمیر بنگلے کی ان ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ڈھیر پر جا بیٹھا جنہیں لمبی دستیوں والی چھوٹی چھوٹی ہتھوڑیوں سے توڑا جاتا ہے۔ اس نے سوچا۔ اچھے بچے جب بہت اچھے ہو جاتے ہیں تو پریاں آتی ہیں۔ انہیں مٹھائی دیتی ہیں۔ ان کے لیے پھول لاتی ہیں۔ ان کا ہر کام کر دیتی ہیں۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھ کر اور بھی اچھا ہو گیا ابھی نیلی پری آئے گی۔ مٹھائی لائے گی۔ مجھے پیار کرے گی پھر کوٹھی میں جا کر گاتو لے آئے گی۔ میں سلام کروں گا۔ خوش ہو کر دعا دے گی۔ میں گاتو لے کر گھر چلا جاؤں گا۔

سرد ہوا کے ایک تیز جھونکے سے قیوم کا چہرہ سن ہو گیا۔ اس نے سر گھٹنوں میں دبا لیا اور کہا:

اللہ میاں جی میری گاتو لے دو۔ پھر میں کبھی برا نہیں بنوں گا۔ سب مجھ کو اچھا کہیں گے۔ پیار کریں گے۔ میری گاتو لے دو اللہ میاں جی میری گاتو.....

وہ پھر سسکیاں بھرنے لگا اور گرم گرم آنسو اس کی لرزتی ہوئی یخ ٹانگوں پر پھسلنے لگے۔ قیوم نے ذرا سی اونچی آواز میں اللہ میاں کو بلایا سر گھٹنوں میں اور گھسیڑا تو ماتھے کے زخم میں زور کا درد اٹھا۔ درد اور کرب کی شدت سے قیوم بلبلا اٹھا اور روتے روتے اس کی گھگی بندھ گئی۔

اللہ میاں جی چاہے میں مر جاؤں۔ چاہے مجھے مار دو پر میری گاتو مجھے لے دو۔ میں گاتو لے کر جاؤں گا۔ چاہے مجھے چڑیلیں کھا جائیں۔ بھوت کھا جائیں۔ اللہ میاں جی میری بلی لے دو۔

بادل زور سے گرجا۔ ہواؤں نے بھدی بھدی سیٹیاں بجائیں اور قیوم ڈر اور سردی کی شدت سے کانپنے لگا۔ پھر ایک دم جیسے آسمان میں دراڑیں پڑ گئیں۔ منوں پانی ندی نالے بن کر ایک دم اترا اور قیوم

گھٹنوں میں سر دبا تا گیا۔ اردگرد کی ساری بتیاں بجھ گئیں اور آسمان کے کناروں پر بجلی چمکنے لگی۔

سورج نکلنے سے کوئی گھنٹہ بھر بیشتر ایک بھیگا ہوا لنگڑا کتا ادھر سے گزرا تو قیوم کو یوں بیٹھے دیکھ کر رکا۔ اینٹوں پر پھدکتا اس کے پاس پہنچا۔ تھوتھنی اس کے قریب کی۔ سونگھا۔ ذرا سا جھکا اور منہ اوپر اٹھا کر رونے لگا۔ بارش سے بوجھل قیوم کے کپڑے اس کے ٹھنڈے یخ جسم سے چپٹے رہے اور لنگڑا کتا اس کے سرہانے کھڑا بین کرتا رہا۔

بیگم نیاز نے سفید ڈوری کے سرے پر لگی ہوئی پنگ پانگ کی گیند کھینچی اور لوہے کے فریم میں جڑے ہوئے اڑتالیس شیشوں والے دریچے سے ویل وٹ کے پردے ادھر ادھر ہٹ گئے۔ دریچے کے عین سامنے زیر تعمیر بنگلے کی ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ڈھیر پر قیومی بیٹھا تھا.... غصہ سے دانت پیس کردہ سنگھار میز کے سٹول پر بیٹھ گئیں اور رونکھی ہو کر بولیں: "توبہ! رذیلوں کی اولاد کس قدر ضدی اور اڑیل ہوتی ہے جو کچھ ماں باپ سکھا دیں کیا مجال جو رتی بھر بھی ادھر سے ادھر سرک جائیں۔ دیکھو صبح صبح پھر آ کے بیٹھ گیا حرامزادہ۔"

فُل برائٹ

بڑی شاہراہ کے پہلو میں پختہ اینٹوں کی ایک چوڑی سی سڑک تھی جس پر وکیلوں کے دفتر تھے۔ ان کے درمیان ایک دفتر ایسا تھا جس کے اندر لوہے کی ایک قوی ہیکل سلیٹی رنگ کی الماری کھڑی تھی۔ اس الماری کی دو چابیاں تھیں۔ ایک ایسی جس سے یہ الماری کھل جاتی تھی۔ لیکن بند نہ ہو سکتی تھی دوسری، عام سیدھی سادی چابی جس سے الماری کھل بھی جاتی تھی اور بند بھی ہو جاتی تھی۔ اس الماری کے اندر ضروری کاغذ اور خفیہ دستاویزیں بڑے قرینے سے رکھی ہوتی تھیں۔ اوپر کے خانے میں ایک پورٹیبل ٹائپ رائٹر کے پاس جس پر خاکی زین کا غلاف چڑھا تھا ایک کالی صندوقچی پڑی تھی۔ یہ صندوقچی مقفل تھی اور اس میں لائسنس اور پرمٹ بند تھے۔ نچلے خانے میں فائلیں تھیں۔ اس سے نیچے، شیشے کی صراحیاں، گلاس، ترنجبیں، سپرٹ لیمپ۔ زہریلی دوائیں اور کچلے اور سنکھیئے کے پیکٹ پڑے تھے اور سب سے نیچے ایک آدمی کی کھوپڑی اور ٹانگوں اور بازوؤں کی ہڈیاں پڑی تھیں۔

اس الماری کی ایک چابی میرے پاس تھی اور دوسری مالک کے پاس۔ میرے پاس وہ چابی تھی جس سے الماری کھل بھی جاتی تھی اور بند بھی ہو جاتی تھی۔ لیکن مالک کے پاس دوسری قسم کی چابی تھی۔ جب کبھی اُسے الماری کھولنے کی ضرورت محسوس ہوتی وہ اسے کھول کر اپنے مطلب کی چیز نکال لیتا اور پھر پٹ بھیڑ دیتا۔ تختے کا ایک بوڑہ اٹک جاتا، پٹ کھل تو سکتا لیکن فریم میں ڈھیلا ڈھیلا بجتا رہتا۔ جب مجھے اس الماری کو کھولنا مقصود ہوتا تو مجھے پتہ چل جاتا کہ مالک نے اسے کھولا تھا یا نہیں۔ میرا فرض تھا کہ جونہی اس سے ملاقات ہو سب سے پہلے یہ پوچھوں "آپ نے الماری

کھول کر اس میں سے کیا لیا تھا؟ اکثر مجھے الماری کھول کر خود ہی پتہ چل جاتا کہ کونسی چیز وہاں سے اٹھائی گئی ہے، لیکن اگر کسی فائیل میں سے کوئی کاغذ نکالا جاتا یا اس کی پڑتال کی جاتی تو مالک میرے استفسار پر خود مجھے بتا دیتا۔

یہ امپورٹ ایکسپورٹ کا دفتر تھا۔ ہم ولایت سے سائنٹفک گڈز اور کیمیکلز منگواتے تھے اور یہاں سے جڑی بوٹیاں برآمد بھیجتے تھے۔ فیروز پور روڈ پر ہماری ایک چھوٹی سی فیکٹری تھی اور میکلیگن روڈ پر سائنس کا سامان فروخت کرنے کی دو دکانیں۔ پنجاب کے تقریباً سارے سکولوں اور کالجوں کو مردوں کے ڈھانچے بھی سپلائی کرتے تھے۔ ادارے کے مالک مرزا صاحب سے بھائیجان کے بڑے تعلقات تھے اور انہوں نے مجھے امپورٹ ایکسپورٹ کا کام سیکھنے کے لیے ان کے سپرد کر رکھا تھا۔ میں شام کو تین چار گھنٹے دفتر میں لگاتار ڈاک کا جواب دیتا۔ بیوپاریوں کو reminder بھجواتا اور کچے حساب کی فردیں اپنے ہاتھ سے کیش بک اور کھاتے میں منتقل کرتا۔ ٹائپ کرنے پر ظہور صاحب مامور تھے۔ یہ کسی سرکاری دفتر میں ملازم تھے اور شام کو دو گھنٹے ہمارے یہاں لگا جاتے تھے۔ دن بھر یہ دفتر بند رہتا، لیکن شام کے وقت ہم دو آدمیوں کی سرگرم کوششوں سے خاصا آباد ہو جاتا۔ مرزا صاحب دن بھر فیکٹری میں رہتے اور اگر انہیں کسی ضروری کام سے دفتر آنا بھی ہوتا تو صرف چند لمحوں کے لیے۔ دفتر کی ایک چابی ان کے پاس بھی تھی۔

بھادوں کا آغاز تھا اور اندر باہر حبس سے دم گھٹا جا رہا تھا۔ میں اور ظہور صاحب اپنے دفتر سے باہر پکے فرش پر کرسیاں ڈالے آم چوس رہے تھے کہ ایک بھکاری چھوٹی سی جستی بالٹی کا کنڈا بجاتا ہمارے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بڑی مریل آواز میں ہمارے پاس آ کر کہا "حکم حاکم۔ بھلے کو بھی لاج اللہ رنگ بھاگ سارے۔۔۔" اور اس کے ساتھ ہی اس نے کنڈا کھڑکایا۔ ظہور صاحب کا منہ آم کی ہتھوڑی پر تھا اور حلق میں رس کا بڑا سا گھونٹ اترنے والا تھا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے چلے جانے کو کہا اور میں نے ماتھے کے قریب بھیگا ہوا ہاتھ لیجا کر ذرا اونچی آواز میں کہا "بابا جی معاف کرو" مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا اور لجاجت بھرے لہجے میں بولا

"پکّی کوٹھیاں والے سخی کی خیر۔ کچھ فقیر کو مل جائے" میں نے جان چھڑانے کی غرض سے بالٹی میں سے ایک آدم نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ بدستور اپنی جگہ پر کھڑا رہا اور پوپلا سامنہ بنا کر کہنے لگا "سخیا یہ تیرے کھانے کا تحفہ ہے۔ ہم فقیر اسے لے کر کیا کریں گے۔ کچھ اس پاپی پیٹ کے لیے دے۔ دے تیرے حکم چلتے رہیں۔"

ظہور صاحب کا رس بھرا گھونٹ حلق نیچے اتر چکا تھا۔ انہوں نے تاؤ میں آ کر کہا "اور تجھے گھگھو چاہیئے۔ آم نہیں لینا تو جا عیش کر" پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے "لعنت بھیجیئے، آپ بھی کیا سوروں کے آگے پونڈے ڈال رہے ہیں" بھکاری نے اس بات کا بُرا منایا اور اپنے مخصوص لہجے میں کہا "اک آنے کا سوال ہے سخیا، تیرے بنک بھرے رہیں" میں اس بنک کے لفظ پر چونکا تو ظہور صاحب نے کہا "بنک کے بچے شرم نہیں آتی۔ ہٹے کٹے ہو کر مانگتے پھرتے ہو۔ کہیں نوکری کیوں نہیں کر لیتے۔"

"اپنا اپنا کسب ہے موتیوں والے، ہمیں کون نوکری دیتا ہے"

"کرے گا نوکری؟" ظہور صاحب نے وثوق سے پوچھا۔

"دے دے" بھکاری نے لاتعلقی سے کہا۔

ظہور صاحب نے میری طرف اور میں نے ان کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر میں نے انگریزی میں کہا "ہمارے پاس کونسی نوکری دھری ہے جو اسے دیدیں۔ انہوں نے کہا "فیکٹری بھجوا دیں" میں نے جیب سے اکنّی نکالتے ہوئے سر ہلایا اور ہولے سے کہا "لعنت بھیجے ان سے نوکری ہوتی ہے بھلا" اس کی طرف دیکھے بغیر میں نے بڑی رعونت سے اکنی اسکے پاؤں میں پھینک دی اور آم چوسنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ جھکا۔ اکنی اٹھائی، اسے پھونک کر صاف کیا اور مٹھی میں دبا کر دعا سلام بغیر یوں چل دیا جیسے ہمارے قریب اس کی اپنی اکنی گر گئی ہو۔

اس کی عمر چالیس بیالیس سے زیادہ نہ ہو گی لیکن وہ پچاس پچپن کا دکھائی دیتا تھا۔ بڑھے ہوئے بال، جھکے ہوئے کندھے۔ بینگی تانگیں اور چپٹے پیر۔ اس نے خاکی رنگ کی ایک غلیظ دھوتی باندھی

ہوئی تھی جس پر جگہ جگہ رنگ برنگے پیوند لگے تھے۔ کرتا کمر سے پھٹا ہوا تھا اور اس کی ایک آستین غائب تھی۔ گلے میں ایک پرانا گلاسٹرا کینوس کا جوتا لٹک رہا تھا، شاید وہ اسی قسم کے دوسرے جوتے کی تلاش میں تھا۔ جستی بالٹی آدھے سے زیادہ آٹے سے بھری تھی اور اس پر روٹی کا بل کھایا ہوا ایک سوکھا ٹکڑا اپڑا تھا۔

وہ چلا گیا تو ظہور صاحب نے کہا: "یہ حکومت بھی ان لوگوں کا کوئی علاج نہیں کرتی۔ پہلے پہلے انہیں گرفتار کرنا شروع کیا تھا۔ مگر چند ہی دنوں بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ کوئی اپاہج ہو، لولا لنگڑا ہو تو خیر اک وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے، لیکن اچھے بھلے صحیح سالم، مانگنے والے میری سمجھ میں نہیں آتے!"

"آپ اسے اچھا بھلا کہیں گے ظہور صاحب؟" میں نے کہا "اس کے کندھوں کی ہڈیاں نہیں دیکھیں آپ نے۔ ایک ایک پسلی گنی جا سکتی تھی کمبخت کی۔ حکومت انہیں گرفتار کرنے کے بجائے ان کی روٹی پانی کا بندوبست کرنے، انہیں کام مہیا کر کے دے تو اک بات بھی ہو۔ یہ کیا کہ ادھر ادھر سے پکڑ کر ٹرکوں میں بٹھایا اور لے جا کر بندی خانے میں دے دیا۔ اچھے بھلے آدمی کو جرائم پیشہ لوگوں کے حوالے کر دیا۔"

ظہور صاحب کو میری اس رائے سے اختلاف تھا۔ انہوں نے کہا "ہر کام حکومت نہیں کر سکتی لوگوں کی کچھ اپنی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ یہ لوگ، سارے کے سارے، معاشرے کے دباؤ سے فقیر نہیں بن جاتے اور بھی وجہیں ہوتی ہیں۔"

"اور کیسی وجہیں؟" میں نے پوچھا "آپ کا خیال ہے کہ اگر ہم اسے دس روپے دے کر ایک چھابا آموں کا لگوا دیں تو یہ پھر بھی بھیک مانگتا رہے گا۔"

"ضرور" ظہور صاحب نے یقین کے ساتھ کہا۔

میں ان کی اس قطعیت پر ہنس پڑا اور پھر ہماری بحث بڑی دیر تک ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مارتی رہی۔

اس واقعے کے کوئی ایک ہفتہ بعد میں اپنے دفتر میں بیٹھا ایک انگلی سے چٹھی ٹائپ کر رہا

تھا کہ وہی فقیر پھر آنازل ہوا۔ اس نے اطمینان سے دروازے کی چق اٹھائی اور میرے سامنے کھڑا ہوا۔ میں نے ٹائپ سے نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے برسوں سے کچھ نہ کھایا ہو اور اس کے بجائے اس کی بھٹکی ہوئی روح خیرات مانگنے آئی ہو۔ میں نے دراز کھول کر اس میں سے اکنی نکالی تو اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور داد دینے کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا "تانبے کے ملیسوں میں کیا رکھا ہے سخیا۔ ہم تو تیرا درشن کرنے آئے ہیں۔ بڑا اللہ والا ہے تو، تیرے اس ایک آنے کی برکت سے شام تک میری ساری جھولی بھر گئی۔ اللہ مولا خوش رکھے۔

میں کھسیانا ہو کر اکنی ٹائپ رائٹر کے جسم پر پھیرنے لگا۔ اس نے ذرا آگے بڑھ کر کہا "تیرا وہ ساتھی آج کدھر گیا ہے موتیوں والے؟"

"میں نے کہا" آج ان کی طبیعت کچھ خراب تھی۔"

"اللہ خراب ہی رکھے" اس نے جل کر کہا "اب مزہ آیا مجھو۔ بابے وارث شاہ فرمایا ہے ریشم نال ہے ٹاٹ پیوند کیتا تے پتھر جوڑیا نال سریش کیا۔ اک سونا، اک تانبہ اللہ اللہ سخیا تیرا اس کا کیا جوڑ۔"

"میں نے دل ہی دل میں خوش ہو کر پوچھا" وہ تانبہ ہے کیا؟"

"پیتل" اس نے نچلا ہونٹ یوں آگے نکالا جیسے تھوکنے لگا ہو۔ پھر دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر بولا "آپ سرکار اسی دفتر کے نوکر ہوتے ہیں؟"

میری حماقت ملاحظہ فرمایئے کہ میں نے بے تکلفانہ انداز میں کہا "یہاں تو میں صرف حساب کتاب کا کام سیکھتا ہوں۔ میری اصل نوکری تو کالج میں ہے۔"

"پڑھاتے ہو؟" اس نے اسی بے تکلفی سے پوچھا

"ہاں" میں نے جواب دیا "دیال سنگھ کالج میں۔ نسبت روڈ پر۔"

اس نے سر ہلا کر کہا "ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ ہلے گُلّے سے پہلے بڑے بڑے کھتری آباد تھے نسبت

روڈ پر۔

"بالکل وہی" میں نے کہا" تم نے دیکھی ہے وہ سڑک؟"

"سڑک" اس نے حیران ہو کر کہا" میں نے لاہور کا کونسا کوچہ کونسی گلی نہیں دیکھی۔ تیئس سال ہو گئے ہیں اس شہر میں" پھر اس نے ایک چٹخارا بھرا اور کہا" وہ والا ہور شہر نگینہ، کوئی آئے اک دن رہے مہینہ!"

مجھے اسکی یہ لاہور دوستی بڑی اچھی لگی۔ میں نے کرسی کی طرف اشارہ کرکے کہا" بیٹھ جاؤ۔"

لیکن وہ اسی طرح کھڑا رہا اور سر ہلا کر بولا" منگنے والا بیٹھ گیا سمجھا تو پھر اس نے مانگ لیا۔ مہربانی، تیرا گولا کھڑا ہی ٹھیک ہے۔"

"میں نے ٹائپ رائیٹر ایک طرف دھکیل دیا اور بڑے تجسس سے پوچھا" کیوں بیٹھنے میں کیا حرج ہے؟"

اس نے کہا" سیانے کہہ گئے ہیں فقیر، سپاہی بیٹھ جائے اور بنیا بیٹھک چھوڑ دیوے تو ان کی پوری نہیں پڑتی۔"

"پوری کیوں نہیں پڑتی" میں نے کہا" ہزاروں فقیر ایک ہی جگہ بیٹھ کر مانگتے ہیں اور جھولیاں بھر بھر کر لے جاتے ہیں، بلکہ میرا تو خیال ہے....."

لیکن اس نے میری بات بیچ ہی میں کاٹ دی اور رازدارانہ لہجہ میں بولا" اپنا اپنا کسب ہے اپنی اپنی ڈیوٹی ہے، آپ سرکار لکھنے پڑھنے کی ڈیوٹی پر ہیں، جرنیل کرنیل لڑنے کی ڈیوٹی پر، کام الگ الگ ہیں، پر جان ماری ایک سی ہے۔"

میں اس کی یہ بات سن کر چکرا گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا تو اس نے کہا" موتیوں والے بیٹھکی منگتے یا تو نکمے اور احدی ہوتے ہیں یا ان کا کوئی انگ عیبی ہوتا ہے۔ اچھا اڈہ مل گیا تو گذران ہو گئی نہیں تو دم دم دھوکا زعم۔ اٹھاؤ منگتے کو بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ پر اتنی بات ہے کہ پھل پورا ملتا ہے۔ جرنیل کرنیل مار دھاڑ کرتا چل سو چل، بادشاہیاں فتح کر لیتا ہے، آیا نا سواد۔ منشی متصدی افسر کلرک پیچھے آکر بادشاہی کا کام چلانے لگتے ہیں۔ کام تو دونوں ہی اپنی اپنی جگہ بڑے ٹھیک ہیں، پر سواد تو لے گیا سپاہی جس نے یہ بادشاہی بھی لے لی وہ بادشاہی بھی لے لی۔"

اس نے کمرے میں ہاتھ ہلا ہلا کر "یہ" "وہ" کچھ اس طرح سے کہا کہ میرا وجود اس کے سامنے بلونگڑا سا بن گیا۔ میں نے اپنی خفت مٹانے کے لیے اور بے تکلف ہو کر پوچھا "تمہارا نام کیا ہے یار؟"

"بتی"۔ اور اپنا یہ نام اس نے اس زور سے لیا جیسے خالی ماچس کو منہ میں دبا کر اور اپنے مکوں میں پوری ہوا بھر کے اس نے ماچس کے دراز کا کارتوس میری ناک پر مارا ہو۔

"بتی" میں نے ہولے سے اس کا نام دہراتے ہوئے کہا "اچھا نام ہے"۔

"اور تمہارا کیا اسم شریف ہے"۔ اس نے بڑے مہذب لہجے میں پوچھا۔

میں نے اپنا نام بتایا تو وہ اس کا تلفظ ادا نہ کر سکا اور بولا "اسحاق احمد بھی اچھا نام ہے، پیر پیغمبراں والا نام"

میں نے سر ہلا کر کہا "دیکھ لو آدھے بزرگ ہم بھی ہیں"۔

"آدھے!" اس نے حیرانی سے کہا "تُو تو پورا بزرگ ہے۔ میں نے اس دن ہی تیرے ماتھے پر تاج دیکھ لیا تھا۔ بہت کرموں والا ہے تُو، سخی کی اولاد، بڑا بھاگوان ہے"

میں نے کہا "تمہاری مہربانی ہے، ورنہ ہمیں تو یہاں کوئی ایک پیسے کو بھی نہیں پوچھتا"۔ اس نے برادرانہ لہجے میں کہا "محمد اسحاق وقت ہی ایسا جا رہا ہے۔ کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔ اپنی اپنی پڑی ہوئی ہے کیا بادشاہ کیا فقیر، سب ایک کلکتے میں بندھے ہوئے ہیں"۔

"میں نے پوچھا "بتی پڑھے بھی ہو؟"

اس نے ڈھیلا سا منہ بنا کر کہا "اپنے لیکھ میں پڑھنا ہوتا تو در در بھیک کیوں مانگتے۔ ملا جی سے قرآن پڑھا تھا۔ وہ بھی بھول گیا۔ اردو کا کوئی کوئی لفظ اٹھا لیتا ہوں۔ سٹیشنوں کے نام پڑھ لیتا ہوں۔ فلم کا نام پڑھ کر سمجھ جاتا ہوں"۔

فلم دیکھنے بھی جاتے ہو؟" میں نے پوچھا

"توبہ توبہ" اس نے دونوں کان چھو کر کہا "منگتے کا منڈوے کے اندر کیا کام"۔

میں نے کہا "یہ تو نہ کہو۔ میں نے کئی بھک منگے منڈوے میں دیکھے ہیں"۔

"وہی جاتے ہیں جن کا کام نہیں چلتا۔ مزدوری نہیں بنتی — پیسہ ہی اجاڑنا ہے نا۔ اس فلم منڈوے میں رکھا کیا ہے۔"

میں نے کہا "واہ گھڑی بھر کو جی بہلا لیا تو کونسی قیامت آگئی۔"

بتی نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا "قیامت تو خیر کوئی نہیں۔ یہ جی بہلانے والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ فلم سے کیوں آدمی اپنے کاروبار سے دل کیوں نہ بہلا دے۔ یہ جو سینما میں لمبی لمبی قطاریں باندھ کے ہوتے ہیں سب بے کاروبار کے آدمی ہوتے ہیں۔ نوکر لوگ۔ کوئی پریس کا نوکر، کوئی کارخانے کا کوئی کچہری کا کوئی لاٹ صاحب کے دفتر کا۔ کیا بڑا کیا چھوٹا۔ سب نوکر ہی ہوتے ہیں۔ کوئی بجنس مین آدمی نہیں آتا منڈوہ دیکھنے۔ آئے بھی کیوں......"

لیکن ابھی وہ فقرہ مکمل نہ کر پایا تھا کہ مرزا صاحب اندر داخل ہوئے، پہلے مجھے اور پھر بتی کو دیکھا۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ بتی کہنے لگا "اللہ تیرے کاروبار میں ترقی دے بابا، کچھ یتیموں مسکینوں —" اور پھر ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے "تین دن سے میرے بچے سٹیشن پر بھوکے پڑے ہیں۔ ماں ان کی گذر گئی مجھ سے سنبھالے نہیں جاتے —"

مرزا صاحب نے کہا "چلو چلو معاف کرو" لیکن بتی گڑگڑانے لگا، اس کے لہجے میں ایسا دکھ ایسا کرب تھا کہ میرے پیٹ میں مروڑ سا اٹھنے لگا۔ مرزا صاحب نے جیب سے الماری کی چابی نکالتے ہوئے ایک اکنی بھی ساتھ نکالی اور بتی کے ہاتھ پر رکھ کر بولے: "جاؤ جاؤ معاف کرو۔ باہر کھڑے ہو کر مانگا کرو" — بتی نے اکنی لے کر آنسو پونچھے اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا "تو سخیا، تیرے حکم بنے رہیں" تو بھی کچھ دے۔"

مرزا صاحب نے جھڑک کر کہا "دے جو دیا ہے، — جاؤ — ایک ہی بات ہے۔"

لیکن بتی کے کندھے کچھ اس طرح سے جھک گئے تھے۔ آواز کچھ اس طرح رندھ گئی تھی اور آنسو ایسے خشک سے ہو گئے کہ میں ضبط نہ کر سکا اور ٹائپ رائیٹر کے پاس پڑی ہوئی اکنی اٹھا کر میں نے اس کے ہاتھ میں دیدی۔

رات گئے تک میں بتی کے متعلق سوچتا رہا۔ کبھی مجھے یوں لگتا کہ وہ خاندانی فقیر ہے اور بھیک مانگنا اس کا آبائی پیشہ ہو کر رہ گیا ہے۔ کبھی ایسے محسوس ہوتا کہ وہ واقعی مستحق ہے اس کے بال بچے فاقوں سے دم توڑ رہے ہیں اور اس کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ بھیک مانگ کر اپنا اور بال بچوں کا پیٹ پالے۔ لیکن جب مجھے اس کی باتیں یاد آتیں تو یہ یقین ہو جاتا کہ وہ سی آئی ڈی کا ملازم ہے اور بھیس بدل کر لوگوں کی ٹوہ لگاتا پھرتا ہے۔ ایک آدھ مرتبہ یہ خیال بھی ذہن میں آیا کہ وہ فنکار ہے اور اپنے آپ کو اپنے جوہر دکھاتا پھرتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان میں سے ایک بات بھی ٹھیک نہ تھی۔ وہ فقیر تھا اور بھیک مانگا کرتا تھا جیسے ایک راج اینٹیں چنتا ہے اور مکان بناتا ہے یا ایک نائی حجامتیں بناتا، دیگیں پکاتا ہے۔

اس واقعہ کے کوئی دس پندرہ روز بعد بتی پھر میرے دفتر آیا اور تھیلی میں سے دس پندرہ روپے کی ریزگاری نکال کر بولا "ناواں لے لو، نوٹ دے دو۔" میرے پاس دراز میں دس کا ایک نوٹ تھا اور جیب میں دو چھ آٹھ کے روپے۔ جب اس نے ریزگاری گنی تو سولہ روپے نو آنے نکلے۔ میں نے کہا دس تو یہ ہیں اور دو یہ ہیں" اس نے دس کا نوٹ اٹھا لیا اور دو چھوڑ دیئے۔ میں نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا "دو کاغذ کے ہوتے تو لے لیتا یہ میرے کس کام کے۔"

میں نے کہا "واہ یار، ہماری دولت کسی کام کی ہی نہیں۔" اس نے ہنس کر کہا "تمہارے کام کی ہے میرے کام کی نہیں۔"

میں بوکھلا سا گیا۔ اس نے میری الجھن دور کرنے کو محبت بھرے لہجے میں کہا "محمد اسحاق تو بڑا سیدھا آدمی ہے۔ آج سینچر ہے اور مجھے میل جانا ہے۔"

میں نے کہا "آج سینچر ہے اور مجھے میل پہ جانا ہے!" میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔

اس نے دس کے نوٹ کی تہیں جماتے ہوئے کہا "سینچر کو میل سے بڑی سواری اترتی ہے۔ یہ شام میں سٹیشن پر لگاتا ہوں۔ ڈیوڑھی میں تو ہمیں آنے کا حکم نہیں۔ ٹانگوں کے پیچھے بھاگنا پڑتا ہے اور کسی ٹانگے کے پیچھے بھاگتے ہوئے جیب میں روپے بجنے لگیں تو....."

"دینے والا کچھ نہیں دیتا" میں نے بات کاٹی۔

اس نے آرام سے کہا "محمد اسحاق تو پوری بات سن لیا کر۔ روپے جیب میں بجیں تو کام کرنے کی لگن مر مٹ جاتی ہے۔ جب پیسے بجنے کی آواز ہر دے کو آ جائے تو حرامی ہو جاتا ہے کہ چلو دو روپے تو جیب میں ہیں، پھر ٹانگے کے پیچھے بھاگا نہیں جاتا۔ من حرامی ہو تو ٹانگیں جواب دے دیتی ہیں۔ دم بھول جاتا ہے۔"

میں احمقوں کی طرح اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

بتی نے کہا" اگر سیٹھ، بجنس مین آدمی اپنی پونجی کا حساب لگا کر اس تیری کتاب کی طرح سامنے میز پہ رکھ لیں تو کاروبار کی لگن ختم ہو جائے۔

اونچا سیٹھ وہی ہے جو گھاٹے ٹوٹے کا رونا روتا رہے:

" تاکہ لوگ اس پہ رحم کھاتے رہیں" میں نے پھر بات کاٹی۔

" ہائے ہائے محمد اسحاق" اس نے مایوس ہو کر کہا " گھاٹے ٹوٹے کا رونا ہودے کو سننے کے لیے ہوتا ہے یار! سیٹھ دس ہزار کا نفع پا کے بھی منہ ڈھا دے نہیں جاتا۔ اپنا جی خوش نہیں کرتا۔ قسم قرآن کی میں بڑے بڑے سیٹھوں بجنس مین آدمیوں کا منگتا رہا ہوں، میں نے ساری باتیں ان سے سیکھی ہیں۔ اپنا بنج بیوپار وجار کے سب کام کرتے ہیں۔

دو روپے میرے سامنے پڑے تھے اور میں کبھی ان کی طرف اور کبھی بتی کی طرف دیکھتا تھا اس نے کہا "شاباش میرا شیر، بس اب ان کو جیب میں ڈال لے اور بھول جا کہ تیرے پاس دو روپے ہیں۔ گھر جا کے پرانی کتابوں کے پیچھے پھینک دے، پر بھول جا کہ پھینکے ہیں۔ بس ننگ ہو جا، پھر دیکھ کام کرنے کو جان نکلتی ہے کہ نہیں۔ پر تو سیدھا آدمی ہے۔ تجھ سے بھلایا نہیں جائے گا نا.....

مہینے کی پہلی کو دیکھا ہے۔ بھو کے شوقین۔ بابو بابو آنیاں کس طرح بازاروں میں آدم بو آدم بو کرتے پھرتے ہیں۔ ان کو اپنے آپ سے نانویں کی بو آتی ہے۔ بابے وارث شاہ نے فرمایا ہے مشک ہرن کو ٹکنے نہیں دیتا۔ ٹکر مار مار کے مر جاتا ہے بھولا۔ بابو بھی مہینے کی پہلی کو مرگ ہی بن جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "خدا کے لیے بتی کوئی کام کی بات کرو، لعنت بھیجو اس گفتگو پر" اس نے ہنس کر کہا "لے پھر میں یہ دس لیے جاتا ہوں، اب تیری طرف میرے چھ روپے نو آنے رہ گئے" پھر کبھی میلے ہوئے تو لے لوں گا"

میں نے کہا "بیٹھو گے نہیں"

اس نے کہا "محمد اسحاق میری کونسی تیری طرح مہینے کی تنخواہ بندھی ہے۔ بھوتی بھوتی کر کے تالاب بھرنا پڑتا ہے۔ شاباش چپتا بتا رہ"

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا اور میں سوچنے لگا کہ یہ آدمی فقیر نہیں ہو سکتا۔ ضرور کوئی جاسوس ہے، خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔ یا دوستوں نے میرا مذاق اڑانے کو کسی کا بھیس بدل کر بھیج دیا ہے ــــ میں وہ ریزگاری سامنے رکھے جانے کن خیالوں میں غرق تھا کہ مرزا صاحب داخل ہوئے اور میرے سامنے ایک خاکی لفافہ پھینک کر بولے" لو دیکھ لو کنٹرولر نے کیا ــ ــ ــ ــ ــ ــ پنادیا ہے کتنے کا لائسنس اشو ع کیا ہے۔ لعنت بھیجو اس کام پر ــ اس سے تو آدمی جھاڑی لگا لے۔ بند کر دجی۔ لینا ایک نہ دینے دو خواہ مخواہ کی سردردی۔ میں نے لفافہ کھولا۔ اس ششماہی کے لیے صرف دس ہزار کا لائسنس ملا تھا۔ واقعی مجھے بڑا رنج ہوا۔

اس کے بعد بتی سے ملاقاتیں بڑی گہری اور طویل ہوتی گئیں۔ ایک مرتبہ وہ بھیک مانگتا ہمارے کالج بھی آ گیا۔ میں نے سٹاف روم کے اندر سے دیکھا۔ وہ پورچ کے پاس ہاتھ پھیلائے لڑکوں سے بھیک مانگ رہا تھا۔ میں لپک کے اس کے پاس پہنچ گیا اور اپنے شاگردوں کی موجودگی میں اس کے سامنے ہاتھ بڑھا دیا مگر وہ اسی طرح کھڑا رہا اور اس نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ لڑکے بھی حیران تھے اور میں بھی۔ وہ اپنی جگہ میں اپنی جگہ۔ اور بتی لمبی لمبی دعائیں دے کر کہہ رہا تھا "موتیوں والے حاکما! تجھے غلطی لگی ہے، تو راجہ بھوج میں گنگا تیلی کا بھی نوکر۔ کوئی اور بھاگوان ہوگا، میں نہیں بڑا جانتا۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ مان جائے لیکن وہ بھی بتی تھا اتنی جلدی ہار کیسے جاتا۔ اسی دن شام کو جب میری اس کی ملاقات جادو گھر کے سامنے ہوئی تو میں نے اسے گردن سے پکڑ لیا۔ وہ زور زور

سے ہنسنے لگا اور بولا "محمد اسحاق تو بھی اللہ لوک ہے، یار وہاں تیرے ہزار چیلے چانٹے جمع تھے میں کیسے مان لیتا کہ تجھے جانتا ہوں، تیری تو جو بے عزتی ہونی تھی سو ہونی تھی میرا روزگار خواہ مخواہ ڈوب جاتا۔ دو چار پیسے تیرے ان چیلے چانٹوں سے بن جاتے ہیں جب انہیں پتا چلتا کہ منگتا ہمارے ماسٹر کا دوست ہے تو ضرور مجھے دان دکھشنا دیتے۔ شاباش ہے تیرے پیدا ہونے والے دن پر۔ کسی نے آج تک گھر کے فقیر کو بھی خیرات دی ہے"۔ مجھے اس کا یہ فلسفہ سمجھ نہ آیا اور میں نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر کھینچنا شروع کر دیا کہ چل آج تجھے انہی کپڑوں میں ساتھ لے کر کسی ریستوراں میں چلتا ہوں۔ وہ سنجیدہ ہو گیا اور ایک ہی جھٹکے سے گردن چھڑوا کر بولا "کیوں میرے رزق کے پیچھے پڑ گیا ہے؟ اچھی دوستی نبھانے لگا ہے"۔ میں نے کہا "وہ جو چالیس روپے تو میرے پاس جمع کرا گیا تھا بجو! میں آج ان کی فیسٹ اڑاؤں گا"۔

اس نے خوش ہو کر کہا "شوق سے اڑا۔ یاروں کے لیے تو سر بھی حاضر تو چالیس پر خوش ہو جائے تو اور کیا چاہیئے"۔

"میں نے پوچھا "پھر کیا صلاح ہے"؟

اس نے کہا "جو تیرے جی میں آئے کر، پر میں تیرا ساتھ نہ دوں گا"

میں نے کہا "خیر آج نہ سہی پھر کبھی سہی یا تو تو میرے ساتھ چلے گا یا اپنا سر تڑوا لے گا"

میرا خیال ہے اس نے اس الٹی میٹم پر بڑی سنجیدگی سے غور کیا کیونکہ تیسرے دن جب وہ مجھ سے ملا تو اس نے کہا "فیسٹ دینے کو میں تیار ہوں بشرطیکہ ....."

"بشرطیکہ میں تجھے ساتھ نہ گھسیٹوں۔ ہے نا" میں نے چڑ کر کہا۔

"یہ بات نہیں چاچا" اس نے جل کر کہا "اگر تو یہاں کسی ہوٹل وٹل میں جانے کی بجائے کہیں باہر چلے"

"بسم اللہ" میں نے کہا "اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ چل، بول کہاں چلے گا"؟

"راوی ٹھیک ہے"؟ اس نے پوچھا

"واہ وا کیا کہنے" میں خوش ہو گیا۔

" اس اتوار چلیں گے ...... پر .....

" پر کیا" میں نے تڑپ کر پوچھا۔

" کپڑے مل جائیں پہننے کو تو میرا بھید چھپا رہے"

" میں نے کہا' یہاں دوکان سے بنی بنائی بشرٹ اور پتلون لے لیں گے سستی سی"

" سستی سی کتنے کی؟" وہ سہم گیا۔

" یہی کوئی بیس پچیس کی" میں نے کہا۔

" تو پھر یوں کر" وہ بولا" اکیلی بشرٹ لے لے۔

" پتلون تیرے پاس ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

" تیرے پاس ہو گی کوئی پرانی سرانی ،حکم حاکم قائم ، بھلے کو بھلی لاج ، وہ دنیا ستر آخر تیرا

دونوں جہانوں میں .....

میں نے اس کی گردن ناپی تو وہ کہنے لگا" خدا کی قسم کیوں ایک دن کے لیے روپیہ برباد

کرتے ہو؟"

میں مصنوعی غصے میں آگیا اور جھلا کر بولا" پھر لعنت بھیجو اس سارے قصے پر' اور وہ جو روپے

تم نے جمع کرائے ہیں میرے پاس کل آکر لے جانا، اس نے دردناک نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا" اچھا

رہنے دو تم بس بشرٹ لے لینا میرے ناپ کی' میں پتلون لے آؤں گا ــ ہے ایک ڈیرے پر" میں

نے اس کی بات مان لی اور گھر چلا آیا۔

ہفتے کے روز کالج جانے سے پیشتر میں نے اس کے پیسوں سے گہرے گلابی رنگ کی ایک

بشرٹ گیارہ روپے میں خرید لی تھی اور اسے اپنے ساتھ سٹاف روم لے آیا تھا۔ ٹھیک بارہ بجے

وہ حسب وعدہ مجھے نشاط سینما کے سامنے ملا اور میں نے کاغذ میں لپٹی ہوئی بشرٹ اس کے حوالے

کر دی اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دی کہ اگر وہ کل نو بجے مجھے لوہاری کے باہر نہ ملا تو میری اس کی دوستی

ختم ہو جائے گی۔ اس نے ان مانے جی سے ہامی بھر لی اور چلا گیا۔

اتوار کا وہ دن میری زندگی میں نہیں تو میری موت میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بٹی وقت سے پہلے لوہاری دروازے کے باہر کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اپنے بال بڑے سلیقے سے جمائے ہوئے تھے اور آنکھوں میں سرمے کی ہلکی سی تحریر تھی۔ گہرے گلابی رنگ کی بشرٹ میں وہ کسی اچھے دفتر کا ہیڈ کلرک دکھائی دیتا تھا، لیکن اس کی ملیشا کی پتلون ساری شخصیت کو تباہ کیے دیتی تھی۔ وہ پتلون اس نے لنڈے سے خریدی تھی اور مجھے یقین ہے اس کی قیمت ڈھائی یا تین روپے سے زیادہ ادا نہ کی تھی۔ میں اس پتلون کو دیکھ کر کباب ہو گیا لیکن بٹی کے بڑھے ہوئے ہاتھ اور ہونٹوں پر سفیروں کی سی مسکراہٹ نے مجھے سب کچھ بھلا دیا اور میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

میں نے کہا "چلو تمہیں اپنے پیسوں سے ناشتہ کراؤں۔"

اس کے قدم زمین میں گڑ گئے۔ سر ہلا کر بولا "اب راوی پر چل کر روٹی ہی کھائیں گے۔"

میں نے کہا "خست چھوڑ دے بٹی چھوڑ دے مر جائے گا۔"

وہ نہ مانا اور اسی جگہ کھڑا رہا۔

لوہاری کے اندر ہم نے ایک دکان سے نان کباب خریدے اور انہیں اخبار میں لپیٹ کر پیکیٹ سا بنا لیا۔ پھر میں نے کہا "چلو انارکلی کے سرے پر کھیر کی ایک دکان ہے۔ منہ میٹھا کرنے کو کچھ کھیر بھی لیتے چلیں۔"

وہ وعدہ کر چکا تھا۔ انکار نہ کر سکا۔

ہم دونوں اشیائے خوردنی کو کلیجے سے لگائے تانگے میں بیٹھ گئے، اور تانگہ راوی کی طرف دوڑنے لگا۔ بٹی اس لباس میں اچھا بھلا دکھائی دیتا تھا لیکن وہ کچھ اس طرح سے مغموم بیٹھا تھا جیسے سارا سرمایہ اور پونجی لٹ جانے کے بعد چیتھڑوں میں ملبوس ننگے پاؤں اپنے شہر سے نکل رہا ہو اور راہگیر اس کی طرف انگلیاں اٹھا اٹھا کے کہہ رہے ہوں۔ وہ جا رہا ہے بٹی سیٹھ۔ دیوالیہ ہو کر، قرقی کرا کر۔ میں نے ہر چند اسے ابھارنے کی کوشش کی مگر وہ نہ ابھرا،

اسی طرح گم سم تانگے میں بیٹھا رہا۔ میں نے جان بوجھ کر الٹے تلٹوں کی باتیں کیں تاکہ وہ پند و نصائح کا دفتر کھولے مگر وہ خاموش رہا اور بہرے آدمی کی طرح مسکراتا رہا۔

ہم پل کے اس طرف جا اترے اور ریتلے کھیتوں میں چلتے چلتے بارہ دری پہنچ گئے۔ بارہ دری کے ایک در کا فرش رومال سے جھاڑ کر ہم اس پر بیٹھ گئے اور سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ میں کشتی کی سیر کے حق میں تھا اور وہ اس بات پر مصر تھا کہ دوپہر کا کھانا کھا کر سیر کریں گے۔ لیکن میں جیت گیا اور پتھر سے بندھی ہوئی کشتی کے ملاح کو جگا کر اس میں بیٹھ گئے، سورج کی چمکیلی کرنوں سے پانی کی لہریں چمک رہی تھیں اور ہم بہاؤ کے خلاف جا رہے تھے۔ پانی کا بہاؤ اپنے پورے جوبن پر تھا۔ کشتی ایک گز آگے بڑھتی تو دو گز پیچھے نکل جاتی۔ میں نے ملاح کی مدد کرنا چاہی، لیکن کشتی میری طرف سے جھپ کھا جاتی۔ ملاح نے قمیص اتار دی، لنگوٹا کس لیا اور چپو میرے ہاتھ سے لے کر پورا زور لگانا شروع کر دیا۔ کوئی ایک گھنٹہ کی مسلسل جدوجہد کے بعد پل کے نیچے پہنچ گئے۔ پانی کی لہریں موٹے موٹے بل کھاتی کروٹیں سی بدل رہی تھیں۔ میں نے پانی میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ اوپر اوپر پانی کی سطح کنکنی تھی، لیکن نیچے بڑی ٹھنڈی رویں چل رہی تھیں۔ میں نے قمیص اتار کر پتلون کے پائینچے چڑھا لیے اور پانی میں اترنے لگا تو بی نے پوچھا "اسحاق تیرنا آتا ہے؟"

میں نے کہا "واہ، کون علم ہے جو ہمیں نہیں آتا" لیکن پانی میں اتر کر بھی میں نے پتوار نہ چھوڑی، کشتی کے ارد گرد چکر لگاتا رہا۔ ملاح نے کونے میں پڑی قمیص سے ایک سگریٹ نکال کر سلگائی اور کشتی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ کشتی آہستہ آہستہ بہاؤ میں چلی جا رہی تھی اور میں پتوار پکڑے اس کے ساتھ ساتھ پیر مارتا تھا۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا ایک چھوٹا سا گرداب اٹھا، کشتی کو جیسے ہچکولا سا لگا اور میرا ہاتھ چھوٹ گیا۔ ایک غوطہ، دوسرا غوطہ اور پھر ٹھنڈی لہریں مجھے اندر ہی اندر کھینچنے لگیں۔ میں نے زندگی اور موت کے درمیان آخری مرتبہ ہاتھ پاؤں مارے، میرا سر تھوڑی تک سطح آب سے ابھرا۔ مجھے کشتی میں بی کا دھندلا سا وجود دالتیادہ

نظر آیا۔ پوری قوت سے میں نے ایک چیخ ماری" بتی" اور پھر جیسے میرے قریب پانی میں زور کا دھماکا ہوا۔ اور جب میری آنکھ کھلی تو میں ملاح کی جھگی میں تھا۔ پانی میں شرابور۔ بتی میرے سرہانے بیٹھا تھا اور بہت سے ملاح میرے ارد گرد جمع تھے۔

جب ہم اپنے کھانے کا بسکٹ اور کھیر کا آبخورہ لے کر واپس لوٹ رہے تھے تو بتی کہہ رہا تھا" بابے وارث شاہ نے فرمایا ہے جے کر منتر کیل داناں آوے اینویں سترے ناگ نہ چھیڑئیے نی۔ تو تیرنا نہیں جانتا تھا تو جھوٹ کیوں بول گیا؟

میں نے شرمندگی ٹالتے ہوئے کہا" مجھے پتہ تھا تجھے تو تیرنا آتا ہے"

اس نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا" نہ میرا دادا تیرنا جانے نہ باپ مجھے تیرنا کہاں سے آتا بھلا؟"

میں نے حیران ہو کر پوچھا" تو مجھے پکڑنے کو تو نے چھلانگ نہیں لگائی تھی؟"

اس نے کہا" لگائی تو میں نے ہی تھی۔ لیکن میں تیرنا تو نہ جانتا تھا"

میں خاموش رہا تو اس نے آہستہ سے کہا" گھر جا کر اللہ کے نام کا کچھ فقیروں منگتوں کو دینا"

میں نے کہا" اگر اتنے سارے ملاح اس وقت کنارے پہ نہ ہوتے تو ہم شاید اس وقت تک فوت ہو چکے ہوتے"

اس نے کہا" میں نے کہا نا کہ گھر جا کر کچھ فقیروں منگتوں کو دینا"

" گھر پر اس وقت سوائے تمہارے پیسوں کے اور کچھ بھی نہیں" میں نے کہا" کہو تو ان میں سے روپیہ سوا روپیہ"

اس نے چمک کر کہا" انہیں ہاتھ لگایا تو دیکھنا پھر"

جس دن ہم دریا کی سیر کو گئے تھے اس دن۔ بتی کے اسی روپے میرے پاس جمع تھے۔ جو اس پکنک کے علاوہ گھٹتے گھٹتے سولہ رہ گئے تھے۔ اس واقعہ کے بعد اس نے ہر روز باقاعدہ

اپنی کمائی میرے پاس جمع کرانی شروع کر دی۔ میں اس کے پیسے میز کی دراز میں کاغذوں کے نیچے رکھتا گیا اور جب ایک دن ان کی تعداد ایک سو بیس روپوؤں پر پہنچ گئی تو مجھے فکر ہوئی میں نے اپنے کھاتے میں فیکٹری کے نام وہ روپے بنک میں جمع کرا دیئے اور مرزا صاحب کو بتا دیا کہ میں رقم جمع کرا رہا ہوں جب ضرورت پڑے گی آپ سے چیک لے لوں گا۔ اس کے بعد جب بھی بی کے روپئے تیس چالیس سے اوپر ہو جاتے میں بنک بھجوا دیتا۔ کوئی ڈیڑھ مہینے بعد جب میں نے کھاتہ جوڑا تو میرے چھ سو ستر روپے بنک میں جمع تھے۔ میرا مطلب ہے بی کے چھ سو ستر روپے میرے پاس جمع تھے۔ "چھ سو ستر روپے" ! میں رات بھر سو نہ سکا۔ جب بی ملتان سے لوٹا تو میں نے کہا "بیٹا ہم نے اتنی رقم خواب میں بھی نہ دیکھی تھی جتنی کا تو مالک ہے"۔

اس نے ساٹھ روپے اور میری طرف کھسکا دیئے اور بولا "سب تیرے ہی ہیں۔ میں کونسے قبر میں لیجاؤں گا — لے یہ بیلٹھ اور جمع کرلے"۔ میں نے وہ ساٹھ اس کے ہاتھ سے لے کر دراز میں رکھ لیے اور گڑگڑا کر بولا "بی خدا کے لیے ایک دن تو یہ چیتھڑے اتار کر، نئے کپڑے پہن اور پان منہ میں دبا کر ذرا دنیا کی سیر کر۔ منڈوہ دیکھ، شیراز میں جا کے چائے پی۔ اور نہیں تو ایک گلاس ٹھنڈی لسی کا پیڑے ڈلوا کر پی"۔

اس نے کہا "میرا کیا جی نہیں چاہتا؟ پر روزگار پر بُرا اثر پڑتا ہے تو لسّی کو چھوڑ جس دن ٹھنڈے شربت کا دو پیسے کا گلاس پی کر صدا لگاؤں آواز ہر دے سے نہیں نکلتی۔ بس منہ سے نکل کر رہ جاتی ہے۔ اندر ٹھنڈ پڑی ہو۔ دل کو سرور آیا ہو تو کلیجہ پھاڑ صدا نہیں نکلتی۔ بس غوں غاں ہو کے رہ جاتی ہے۔ گاہک جیب میں ہاتھ ڈالتا ڈالتا رک جاتا ہے"۔

میں نے کہا "لعنت ہے ایسی کمائی پر جس کا آدمی ایک پیسہ بھی نہ کھا سکے"۔

وہ ہنسا اور بولا "میں بڑے بڑے سوداگروں سیٹھوں کا منگتا رہا ہوں، بڑے بڑے افسروں کی کوٹھیوں سے دکھشنا مانگی ہے۔ تو کیا جانے پیسہ کیسے بنتا ہے"۔

میں نے جھلا کر کہا "پیسہ بن گیا۔ اچھا، پھر؟"

اس نے کہا" اچھا پھر کیا۔ بڑی ٹھنڈک ہے اس میں تیرے جیسے سولہ جماعتوں والے ہزاروں پھرتے ہیں"۔

میں نے کہا "یہ کیا بات ہوئی بھلا؟"

اس نے کہا "ہولے ہولے تجھے سب پتہ لگ جائے گا۔ ابھی کسب سے پیار نہیں ہوا نا"۔

میں نے کہا "کسب کے پیار کو گولی مارو تم ان چھ سو ستر بلکہ سات سو تیس روپیوں میں سے کچھ تو کھاؤ کچھ تو اڑاؤ، کہیں تو لگاؤ"۔

وہ حسب عادت میز پہ جھکا اور بولا "بڑا صاحب ٹھیکیداروں سے اس لیے نذرانہ نہیں لیتا کہ اس کے گھر روٹی کی تھڑ ہوتی ہے۔ اس لیے بھی نہیں لیتا کہ بی بی کی ڈولی اٹھانی ہوتی ہے — چھوٹا نالائقا — کہہ تو کسی بجنس مین آدمی سے کہ تجھے لاکھ روپیہ مہینے کی آمدن ہے دوسرا کارخانہ لگا کسی اور کو راہ اللہ دیدے۔ توبہ توبہ کسب سے پیار کی بات ہے محمد اسحاق — میرے سات سو تیس کے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔ میں کوئی روپیہ مانگتا ہوں .... تجھ سے لیتا ہوں — بس مجھے آواز دے دیا کر بی تیرے آٹھ سو ہو گئے، بی نو سو ہو گئے .... ہزار کو پہنچ گئے .... اللہ تیرے خزانے بھرے رکھے۔ حکم حاکم قائم"۔

میں حسب سابق اس لال بجھکڑ کی باتیں سن کر بھنا گیا اور بولا، کوئی اور بات کر یار تجھے وارث شاہ نے بالکل خراب کر دیا ہے"۔

"اور بات" بی بولا "ملتان میں ایک ٹولی ہے جس میں ایک فقیرنی ہے کوئی —

"پندرہ سولہ سال کی" میں نے لقمہ دیا۔

"نہیں" اس نے اطمینان سے کہا "بائیس پچیس برس کی۔ سونا ہے بالکل سونا"

"تو اڑا لا" میں نے شہہ دی "یہاں تیرا نکاح پڑھوا دیں گے۔ کچھ تیرا دھیان بیوی

بچوں کی طرف لگے گا۔"

اس نے سوچتے ہوئے کہا "اڑا تو لاؤں.... پر ٹولی ہے زبردست۔ ڈھونڈھ لیں گے۔ مار کٹائی ہوگی۔ فقیرنی واپس لے جائیں گے۔"

ببّی کی آنکھوں میں میں نے پہلی مرتبہ یہ اداسی دیکھی۔ وہ فقیرنی کے عشق میں غرق ہو چکا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہا "کوئی بات میرے بس کی ہو تو بتا۔"

اس نے کہا "وہ ڈنڈا ڈولی کرتے شاید دو مہینوں میں یہاں پہنچیں گے۔ اگر وال دھارام پہنچ کر اسے اڑا لیا جائے تو بس پھر میں سمجھ لونگا، پشاور نکل جاؤں گا اور پھر وہاں سے سیدھا حیدرآباد سندھ۔ سندھ میں آجکل بڑی روزگار ہے۔"

میں نے کہا "اس سے تیری بات بھی ہوتی ہے یا نہیں؟"

"ہوتی ہے" اس نے رازدارانہ لہجہ میں کہا "میرا اس کا وعدہ بھی ہے۔ وہ وال دھارام پہنچ کر مجھے خبر دے گی..... پر میں.... میں اکیلا..... سمجھ نہیں آتی.... میں نے کہا "اکیلا کیوں؟ تو مجھے بتا۔ ایک اور ایک گیارہ۔ کہے تو بھائی جان کی کار لے چلیں گے۔"

کار کا نام سن کر اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ کہنے لگا "پھر رہا وعدہ"

میں نے کہا "کمال کرتے ہو ببّی یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے! اپنی بھابھی رانی ہے"

اس نے جوشِ مسرت سے میرے کندھے یوں جھنجھوڑے جیسے ابھی یہیں گرنے لگیں گے۔

میں نے کہا "ببّی ہے کیسی؟"

کہنے لگا "بتا جو دیا سونا ہے نرا سونا — دونوں آنکھوں میں پکّے چٹّے پڑے ہیں۔ ایک لات بھی کٹی ہوئی ہے۔ جس چورا ہے پر بیٹھتی ہے دس پندرہ کی دیہاڑی کر کے اٹھتی ہے۔"

میرے ہونٹوں پر قفل پڑ گئے۔ ببّی کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں اور دس دس

کے مجھ نوٹ اٹھا اٹھا بار بار میز پہ رکھتا تھا اور کہتا تھا دن تہوار پہ اتنی دہاڑی بھی کر لیتی ہے یہ سندھی فقیر اس کے پیچھے لگے ہیں لیکن اس نے میرے ساتھ وعدہ کر لیا ہے۔ پکا وعدہ۔

میں نے بڑے دردناک لہجے میں کہا "یار ہبّی اک بات اپنے سجنوں کی بھی مانے گا"

اس نے کہا "ٹھہر جا ٹھہر جا۔ میں بڑے گھروں کا منگتا رہا ہوں۔ ان کی شادیاں دیکھی ہیں۔ جہیز دیکھے ہیں۔ باجے گاجے سُنے ہیں۔ تُو سولہ جماعت پڑھا ہے اپنی بھابی کا مول ڈالتا لڑکوں والی بات نہ کرنا ——— نہیں تو کسی بجنس میں آدمی کو ساری بات بتا کر اس کی رائے پوچھ لینا اور قرآن پہ ہاتھ رکھ کر مجھے لکھ دینا میں مان لوں گا۔ تیری قسم میں بڑے بڑے مرتبے والوں کا منگتا ہوں۔ میں نے سب کچھ ان موتیوں والوں سے سیکھا ہے۔ جھوٹ کیوں بولوں"۔

میں خاموش ہو گیا اور اس وقت تک خاموش رہا جب تک روم یونیورسٹی سے میرے نام بلاوا نہ آگیا۔

میرے ملک کے لوگ بڑے سیلانی، بڑے سیاح اور بڑے مہم جو ہیں۔ انہیں باہر کے ملکوں سے پیار ہے۔ سیر و سیاحت سے عشق ہے۔ سفر کا جنون ہے۔ پھر یہاں کا یہ دستور بھی ہے کہ سیر و سیاست کی جائے تو اس سرکار کے یا اس سرکار کے پیسے سے کی جائے۔ کوئی وظیفہ مل جائے، کسی کانفرنس میں شرکت کا موقع نکل آئے اور نہیں تو کسی ثقافتی مشن کی رکنیت ہی مل جائے تاکہ اپنے اور بیگانے دونوں ملکوں میں عزت ہو۔ میں نے بھی اسی دستور کے مطابق کوشش کی تھی، مجھے اس سرکار کی طرف سے خرچہ ملا تھا۔ لیکن اس میں ایک قباحت تھی کہ اس سرکار نے یہ لکھ دیا تھا کہ ٹکٹ خرچ کے آ جاؤ۔ ہمارے یہاں پہنچتے ہی ٹکٹ کی قیمت مل جائے گی۔ کام دو چار لب بام والا تھا۔ میں نے اپنی عزت اسی میں سمجھی کہ دستور کے مطابق اپنی کم مائیگی کا اعتراف کر لیا جائے۔ چنانچہ میں نے لکھ دیا کہ ٹکٹ خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ ہم ثقافتی آدمی ہیں ہمارے پاس سکے نہیں ہوتے!

اُس سرکار کی طرف سے ایک بڑے سے لفافے میں بند ہوائی جہاز کا ٹکٹ بذریعہ رجسٹری پہنچ گیا۔

یہاں سے کراچی جانا تھا۔ ایک بکس خریدنا تھا۔ تین قمیصیں سلوانی تھیں۔ کچھ ثقافتی کتابیں خریدنا تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سفر خرچ اور پردیس کے اولیں ایام کے لیے ٹریولرز چیک لینے تھے۔ میں ڈرتا ڈرتا بھائی جان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہیں میرے ولایت جانے کی بڑی خوشی تھی۔ میں نے ان کی خوشی و خرمی کے موقع کا فائدہ اٹھایا اور عرض کی کہ اگر پانچ سو روپے ایک دو سال کے لیے ادھار مل جائیں تو مشکل آسان ہو جائے۔ انہوں نے کہا "کیوں نہیں کیوں نہیں تمہاری بھابی کے کنگن ابھی پڑے ہیں انہیں رکھوا دیتے ہیں کہیں۔"

میں چپ چاپ سیڑھیاں اتر آیا۔

تین دن اور تین راتیں انتہائی کرب میں گزریں۔ چوتھے دن جب بتی بیس روپے جمع کرانے آیا تو میں نے دفتر کی سلیٹی رنگ کی قوی ہیکل الماری کھولی اور اس کے آٹھ سو دس روپے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیئے۔ وہ ٹکر ٹکر میرا منہ دیکھنے لگا۔ میں نے بڑے پیار سے یار کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا "چاند میرے ہم تو یورپ جا رہے ہیں، خدا جانے پھر کب ملاقات ہو۔"

اس نے کب، کیوں، کس طرح، کس لیے کی ایک باڑھ مار دی۔ میں نے کہا ولایت سے بلاوا آیا ہے کہ یہاں آکر پڑھاؤ اور اپنی صحت بناؤ۔"

"وہاں جا کر بھی یہی کام کرو گے؟" وہ مایوس ہو گیا اور سر ہلا کر بولا "میرا خیال تھا کسی اچھے کام کے لیے جا رہے ہو کوئی فیکٹری فکٹری کی پڑھائی پڑھنے۔"

"اوں ہوں" میں نے مایوس ہو کر کہا "اب فیکٹری فکٹری کہاں اب تو پیٹ پالنا ہے۔"

اس نے میری ہتھیلی پر پڑے ہوئے آٹھ سو دس کے نوٹ دیکھے۔ پھر چہرہ اونچا کر کے میری آنکھوں میں جھانکا اور اپنے بیس روپے بھی ان نوٹوں پر رکھ دیئے۔

سر کھجا کر بولا "میں کیا کروں گا یہ سارے روپے لیجاؤ تمہیں راستے میں ضرورت پڑے گی "
میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں نے حوصلہ کر کے کہا "نہیں نہیں ایسے نہیں ہو سکتا یہ تمہاری امانت ہے "

بتی ہنسا اور کہنے لگا "چھوڑ یار اس امانت دیانت کے قصوں کو۔ میں تو ساری عمر یہ رقم خرچ نہیں کر سکتا۔ تو لے جا تیرے کام آئے گی۔ میں نے رکھ بھی لی تو مجھے کہیں دفن لیجا کر زمین میں دبانی پڑے گی۔ اگر جگہ بھول گیا تو اور دکھ ہوگا۔ بس تو یوں کر اسے لیجا۔ یار کے کام آ گئی تو میرے کام آ گئی۔ میرے کام بھی کیا آئے گی، میرے لیے تو مٹی ہے۔ جیب میں ڈال کر بھوکوں مردانگانہ صدا لگے گی، نہ طبیعت میں مسکینی رہے گی...... نہ....."

میں نے کہا "بس بس.... خدا کے لیے اپنا فلسفہ نہ شروع کر دینا "

بتی ہنس پڑا اور خوش ہو کر بولا "قسم خدا کی میں بھی دو تین مہینوں سے سوچ رہا تھا کہ یہ رقم کروں گا کیا۔ اچھا ہوا تمہارے کام آئے گی۔ یہاں ایک اور دکاندار ہے میرا واقف ہی ہے اب اس کے پاس پیسے جمع کراتا رہوں گا، لیکن اس کے پاس دس جمع کرا کر دس نہیں گنوں گا۔ آٹھ سو چالیس گنوں گا بڑی ٹھنڈک ہے سوؤں والے ہندسوں میں "

میں آبدیدہ سا ہو کر بتی سے لپٹ گیا۔

آدھی رات کے وقت جب نیچے قاہرہ کی روشنیاں نظر آئیں تو میں نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ٹریولرز چیک بک نکال کر دیکھی۔ ہوائی جہاز لینڈ کرنے کے لیے چکر لگا رہا تھا اور میں بتی فقیر کا وظیفہ لے کر قاہرہ کے گنبدوں کے درمیان اتر رہا تھا۔ ابھی آدھا سفر باقی تھا اور مجھے اسی وظیفے پر نہ صرف روم تک پہنچنا تھا بلکہ اس کے بل بوتے پر تنخواہ نہ ملنے تک کا وقت گذارنا تھا۔

میں روم صرف ایک سال کے لیے گیا تھا اور مجھے وہاں پورے تین سال لگ گئے۔ اس دوران میں سب دوستوں نے لکھا، سب کو جواب ملے مگر ایک بتی.... لیکن وہ کیسے لکھتا کیسے جواب پاتا۔ مجھے جاتے ہی تنخواہ مل گئی، اور میں بتی سکالرشپ کے ٹریولرز چیک آہستہ آہستہ

بھنوا کر الٹے تلّلوں میں ضائع کرتا رہا۔

پورے تین سال بعد جب میں وطن لوٹا تو سب دوست حتیٰ کہ دور دراز کے رشتہ داروں تک سے ملاقاتیں ہوئیں، لیکن ایک بتّی نہ مل سکا۔ میرا خیال ہے اسی دن رادھا رام یہ بھابھی کو اغوا کرنے کی کوشش کی ہوگی اور مارا گیا ہوگیا۔ میرا خیال ہے اس نے بھابی اغوا کرلی ہوگی، پہلے پشاور گیا ہوگا، پھر حیدرآباد سندھ اور اس کے بعد وہ دونوں پاپیادہ کوئٹہ کی راہ زیارتوں کو نکل گئے ہوں گے۔ میرا اندازہ ہے کہ بھابی اُسے دغا دے گئی ہوگی اور سندھی فقیر اسے ورغلانے میں کامیاب ہوگئے ہوں گے۔ وہ بتّی کی ساری پونجی بھی اپنے ساتھ لے گئی ہوگی اور بتی نے راوی میں ڈوب کر خودکشی کرلی ہوگی۔ ممکن ہے ان کے یہاں کوئی بچہ ہوگیا ہو جسے کو دوسرے فقیر اٹھا کر لے گئے ہوں اور وہ اس کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہوں۔

بتی کے گم ہوجانے یا مرجانے سے جو دکھ مجھے ہوا ہوگا اس کا کسی حد تک اندازہ آپ بھی لگا سکتے ہیں۔

آج سے چار روز پہلے کا واقعہ ہے۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا سائنٹیفک سٹورز سے سیکھی ہوئی ڈبل انٹری سسٹم کے مطابق آمد خرچ جوڑ رہا تھا کہ ایک بھکارن نے دروازے پر صدا دی: "حکم حاکم، بھلے کو بھلی لاج اللہ۔۔۔ رنگ بھاگ سادے۔۔۔" میرے کان کھڑے ہوگئے۔ میں نے رجسٹر سے نگاہیں اٹھا کر دیکھا بتی اور بھابی ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے کھڑے تھے۔ میں کرسی سے اچھل کر بتی سے لپٹ گیا۔ بتی نے بازوؤں کا شکنجہ ڈال کر میری جان ہی تو نکال دی۔ اور پھر بولا "یہ ہے تیرا دیور محمد اسحاق جو ولایت گیا تھا" بھابھی نے ٹٹول ٹٹول کر میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اور کہا "ٹوٹی ٹانگ سے دوسری بار تیرے دوارے آئی ہوں۔ کل بھی پھر گئی تیرے نوکر نے بتایا تھا' دوپہر کے بعد آتا ہے"۔

میں نے کرسیاں کھینچ کر پیش کیں، لیکن بتی کو تو آپ جانتے ہیں۔ دونوں میرے سامنے فرش پہ بیٹھ گئے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر بتی نے کہا۔

"تیرا نوکر کہتا تھا ایک اخبار چالو کیا ہے اب"۔
"ہاں" میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔
"جب بھی کرے گا گھاٹے کا سودا کرے گا" بجّی نے کہا "کچھ پیسے نکل آتے ہیں؟"
"ابھی تو نہیں" میں نے دبی زبان میں کہا "امید ہے"۔
"توبہ توبہ - کوئی ڈھنگ کا کاروبار کرتا تو شاید- پر خیر- تو اپنا جی راضی کرے" سب بک جائے گی یہ "ٹنڈ پھوڑی"۔

میں کھسیانی سی ہنسی ہنسنے لگا- وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے- میں نے بہت روکا لیکن ان کے کاروبار کا وقت بھانا رکے- دروازے پر مڑ کر بجّی نے کہا" آٹھ سو تیس تیری طرف نکلتے ہیں ناں - پچاس پچاس مہینہ کر کے مجھے دیتا جا.... تیری حالت ذرا پتلی ہے - میں پہلی کی پہلی آجایا کروں گا"۔

"قسطوں میں آسانی ہو جائے گی تجھے" بھابی نے میرا کندھا تھپک کر کہا۔

اور وہ دونوں دفتر سے نکل گئے۔

مہمان بہار

کمرے کی بتی بجھا کر اختر پلنگ پر لیٹ گیا۔ نئے تکیے کو تہرا کر کے اس نے سر کے نیچے رکھا اور تپائی پر ایش ٹرے میں پڑی ہوئی سگریٹ کو غور سے دیکھنے لگا جیسے راکھ کی موٹی سی تہ نے قریباً قریباً گل کر دیا تھا۔ رات کا پہلا پہر تھا۔ اسے بیدل کی غزل یاد آ گئی۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بہ چمن درآ

ایک عرصہ گذرا اس نے لکھنؤ اسٹیشن سے راگ سوہنی میں یہ غزل سنی تھی، متن نال نے اس کے ذہن میں ہیجان پیدا کر دیا اور وہ تکیے کو گود میں ڈال کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ آواز نہ تو باہر سے آ رہی تھی اور نہ اس کے کمرے میں ریڈیو تھا۔ اس پر بھی وہ ایک ایک لفظ صاف سن رہا تھا اور اس کی روح نکلی جا رہی تھی۔ جب مقطعہ پڑھا جا چکا تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سائیڈ بورڈ پر پڑے ہوئے اٹیچی کیس سے اس نے موم بتی نکالی اور جلا کر موم کے دو چار قطرے کرسی کے بازو پر گرا لئے۔ موم بتی کو اس جگہ کھڑی کر کے وہ واپس اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ اچھا بھلا سونے والا تھا۔ لیکن اس غزل نے اس کی نیند "چھو" کر کے غائب کر دی۔ سگریٹ پینے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کتاب پڑھنے کا موڈ نہیں تھا اور گانا وہ سن ہی چکا تھا اس نے آہستہ سے اٹھ کر بغلی غسلخانے کا دروازہ کھولا۔ موم بتی کی دھیمی سی روشنی میں پانی سے بھری بالٹی کو دیکھا پھر بریکٹ سے چینی کا مگ اٹھا کر بالٹی میں چھوڑ دیا۔ مگ بالٹی کے پیندے سے ٹکرایا تو کمر جھم کی ہلکی سی آواز پیدا ہوئی اور بل کھاتا ہوا ننھا سا بھنور غائب ہو گیا۔ آستین چڑھا کر اس نے

مگ باہر نکالا۔ اس کی باہنہ کے سنہرے سنہرے بال سفید جلد کے سینے سے چمٹ گئے اور مگ کے پیندے اور اس کی مٹھی کے نیچے کی چھوٹی سی چونچ سے پانی کے قطرے ٹپکنے لگے۔ مگ کو میز پر رکھ کر اس نے ایک نظر موم بتی کو دیکھا جس کے اردگرد بہت سی لجلجی موم لپٹ گئی تھی۔ اختر نے تولیہ اٹھا کر اپنے بازو کو پونچھا اور موم بتی کرسی سے اکھاڑ کر میز پر جما دی۔ پھر اس نے اپنا شیو کا سامان نکالا اور حجامت بنانے لگا۔ نئے بلیڈ کی تیز دھار نے جلد کے نیچے حرارت پیدا کر دی اور اس نے اپنے ہاتھوں پر سانس کے لمس کو پہلے قدرے گرم محسوس کیا۔ جھاگ چہرے سے بالکل چھٹ چکی تھی لیکن وہ سیٹی چلائے جاتا تھا۔ کھونٹی بلوری سی نکل آئی تھی پر اس کا ہاتھ تھمتا نہیں تھا اتنے میں ہوائیں میوزک کی دھن بجانے لگیں۔ گٹار کہیں قریب ہی جھنجھنا رہی تھی اور باقی ساز بہت دور سے ساتھ دے رہے تھے۔ بڑی دیر تک سیٹی چلتی رہی۔ گٹار بجتی رہی اور سانس بھانپ دیتی رہی کہ بی بی سی سے ٹوٹیک! ٹوٹیک!! ٹوٹیک کا سگنل ہوا۔ بگ بین نے آدھا بجایا اور صوتی طلسم ٹوٹ گیا۔ اسی تولیئے سے منہ پونچھ کر اختر پھر اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ موم بتی بڑی تیزی سے گھلنے لگی تھی۔ بیسین سے لتھڑے ہوئے برش کی جھاگ کم ہوتی جا رہی تھی اور مگ میں پڑے ہوئے دودھیا پانی کی سطح نیلگوں سی ہو رہی تھی جس پر سفید راکھ کی پھٹکیاں سی تیرنے لگی تھیں۔ موم بتی کے ختم ہونے سے پیشتر اختر نے سونے کی کوشش کی اور وہ اس کے سنبھالا لینے سے ایک آدھ منٹ پہلے زور لگا کر سو ہی گیا۔

آج سے چند ماہ پیشتر اختر لاہور کا ایک تاجر تھا۔ اس کی اپنی دوکان تھی اور اس دکان کے پچھواڑے اس کا اپنا ایک کمرہ تھا جس میں ایک پرانے سے پلنگ اور میز کرسی کے علاوہ ایک سٹوو لیمپ بھی تھا۔ دوپہر کو وہ بڑی باقاعدگی سے دکان دو گھنٹے کے لیے بند کرتا۔ نوکر کو چھٹی دے دیتا اور خود اس کمرے میں آ کر چائے تیار کرنے لگتا۔ ایک کپ چائے تیار کرنے کے لیے وہ کیتلی میں ہمیشہ تین کپ پانی ڈال کر سٹوو لیمپ چڑھایا کرتا۔ پانی کھولنے لگتا لیکن وہ بڑے

مزے سے اپنے جھلنگا پلنگ پر لیٹا امریکن رسالے پڑھتا رہتا۔ اُسے پانی کی سُوں سُوں سال سیال سننے میں بڑا مزہ ملتا تھا اور وہ ایک ماہر جلترنگ بجانے والے کی طرح بھانپ جاتا تھا کہ اب کیتلی میں کس قدر پانی رہ گیا ہے۔ ایک پیالی پانی رہ جانے پر اس کا رسالہ خود بخود بند ہو جاتا اور وہ ایک دم اٹھ کر چائے بنانے میں مصروف ہو جاتا اور جب تک چائے پسیج کر رنگ چھوڑتی وہ انگلی سے ڈبے کا دودھ نکال کر چاٹتا رہتا۔ ایک دوپہر اختر اس کرسچن چھوکری کو جو اس کی دکان پر سینڈل خریدنے آئی تھی اپنے کمرے میں یہی جلترنگ سنانے کی غرض سے لے آیا۔ اس مرتبہ چونکہ اس کے ہاتھ میں امریکن رسالوں کی بجائے کرسچین لڑکی تھی۔ اس لئے کھولتا ہوا پانی ایک پیالی سے کم ہو کر ایک چمچی رہ گیا اور جب وہ چمچی بھر پانی بھی سڑ گیا تو کیتلی کا پیندا جل گیا اور اس کے ٹانکے کھل گئے اور جب اختر اس لڑکی کے ساتھ واپس اپنی دکان پر آیا تو اس نے سات روپے تیرہ آنے کا سینڈل سات روپے تیرہ آنے میں دے دیا اور جلترنگ سنانے کا ایک پیسہ بھی نہ لیا!

اختر اس کے نوکر اور مالک مکان کے علاوہ کسی کو بھی اس کمرہ کا علم نہ تھا جو ایک سیلی سی ڈھلوان گلی کے آخری سرے پر واقع تھا اور جس کی ایک دیوار اختر کی دکان کی پشت تھی۔ اس گلی میں ایسے بہت سے کمرے اور کوٹھڑیاں تھیں جہاں براہ راست درآمد کرنے والے تاجروں کے سامان جملہ فروشی کے انبار لگے ہوئے تھے۔ اس گلی میں رہائش کرنے والا میم، صاحب کا ایک بڈھا جوڑا رہتا تھا جن کا اکلوتا بیٹا ہندوستان کی بحری فوج میں ملازم تھا جو ان کے طویل خطوں کا جواب مختصر سے تار میں دیا کرتا اور کبھی کبھار پاپا کو سگریٹوں کا ایک ڈبہ پارسل کر دیا کرتا تھا۔ جسے بوڑھا ہمیشہ اختر کی دکان میں آ کر کھولا کرتا۔

لاہور کی اس کوٹھیوں ماری سڑک پر اختر کی دکان کے سوائے دُور و نزدیک کوئی بڑی دکان نہ تھی اور چونکہ ایسے مقام پر بکری کا کوئی امکان نہیں ہوتا اس لیے اختر کے ابا جی اسے ہمیشہ فہمائش کرتے رہتے کہ اگر بزنس کرنی ہے تو شہر کے کسی بازار میں جگہ لے کر کرو جہاں چار گاہک آئیں بھی۔ لیکن بازار کی دکانوں میں یہ نقص ہوتا ہے کہ اوّل تو ان کے پیچھے کوئی کمرہ نہیں

ملتا اور اگر ملے بھی وہ کسی ڈھنڈار گلی میں واقع نہیں ہوتا - اختر زیادہ گاہکوں کی ریل پیل کے حق میں نہیں تھا - وہ تو دن بھر میں ایک گاہک کی آمد کا خواہاں تھا جسے وہ کینوس کا ایک جوتا دے کر اس کی کھال اتار لے۔

اختر کے اباجی خاندانی سوداگر تھے۔ لکڑی منڈی میں ان کی بہت بڑی دوکان تھی اور وہ نسل ہا نسل سے تجارت کرتے کرتے اس پیشے سے تنگ آ گئے تھے اور جس طرح ہر شخص اپنے پیشے سے نفرت کیا کرتا ہے اور اپنے بیٹے کو ہرگز ہرگز اس کی سفارش نہیں کرتا - اختر کے اباجی بھی بزنس کے بہت خلاف تھے - ان کی دلی تمنا تھی کہ اختر کوئی اچھی سی نوکری کرے اور اپنے چچا سے بازی لے جائے - جو بمبئی کسٹمز کے محکمے میں ایک بڑے افسر تھے - اختر کی متعلمانہ زندگی بڑی امید افزا تھی اس نے میٹرک کے امتحان میں ایک مرتبہ فیل ہو کر اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا اور کالج کے زمانے میں اپنی علمیت کے لیے ایسے ایسے مظاہرے کیے تھے کہ اباجی کی آس بندھ گئی تھی - بی اے میں نفسیات اور سیاسیات کا طالب علم ہونے کے باوجود اس نے فرسٹ کلاس حاصل کی اور آرٹس کے طلبا میں کالج بھر میں اول رہا - لیکن بی - اے کر لینے کے بعد اس نے نوکری کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور اباجی سے چار ہزار روپے لے کر بوٹوں کی یہ دوکان کھول لی۔

دوپہر کو جلترنگ سننے کی طرح اس کا ایک مشغلہ اور بھی تھا - وہ ہر روز باقاعدگی سے لائبریری جاتا، اخبار پڑھتا اور رسالے دیکھتا اور اپنی فائل نکال کر دوستوں کو چٹھیاں لکھا کرتا - اختر کے خیال میں خطوط نویسی کے لیے لائبریری سے بڑھ کر کوئی اور جگہ نہ تھی - ایک صفحہ لکھ کر وہ کاغذ فائل میں رکھتا - کور کو بڑے اہتمام سے باندھتا اور باہر برآمدے میں آ کر سگریٹ پینے لگتا - چپڑاسی کے پاس سیڑھیوں پر بیٹھ کر سگریٹ پینے میں اسے بڑا لطف آتا - کیونکہ لائبریری میں داخل ہونے والے ہر شخص کی نگاہیں اس سفید پوش آدمی پر پڑتیں اور چند لمحوں کے لیے اس کے وجود پر گڑ کر رہ جاتیں اور اختر کی یہ سب سے بڑی خواہش تھی کہ کوئی اسے دیکھے اس پر توجہ دے اور اس کا تماشہ کرے اس خواہش کے پیش نظر اسے اکثر بہت عجیب وغریب حرکات کرنا پڑتیں۔

ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے وہ ہمیشہ اپنا دایاں پاؤں کرسی پر رکھ کر بیٹھا کرتا اور اگر اس کے ساتھ فیشن ایبل قسم کی خواتین ہوتیں تو وہ کوئی چیز کھانے سے پہلے بیرے کو "بھائی بیرے صاحب" کہہ کر پکارتا اور اس سے پوچھتا" یار اس چیز کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں ؟ بیرا ہنستا اور اس کو کچھ بتائے بغیر اسی طرح مسکراتا دوسرے بیروں کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا۔ کٹلس یا شامی کباب انگلیوں میں پکڑ کر کھاتے ہوئے وہ اپنی ساتھی لڑکی سے پوچھتا۔

" یہ کانٹا تمہارے حلق میں نہیں چبھتا، مجھے تو اس سے بہت ڈر لگتا ہے اور پھر میں اس کی مدد سے کوئی چیز بھی نہیں اٹھا سکتا۔ ایک دفعہ استعمال کر بیٹھا تھا۔ سالن کی پلیٹ میں چھوٹے سے گول آلو پہ کانٹا مارا تو وہ گولف کی گیند ایسا ابھرا اور سامنے بیٹھے ہوئے ایک شریف آدمی کے سر پہ لگا۔ سچ مجھے تو اس سے بہت ڈر لگتا ہے"۔

لڑکیاں اختر کی ایسی باتوں پہ ناخوش نہ ہوتیں بلکہ خوب ہنستیں!

رات وہ ہوائین گٹار سنتا ہوا سویا تھا۔ نیند میں اس نے ساحل کے آس پاس کارک کی کشتی میں بیٹھ کر سیر کی۔ غزالی آنکھوں والی ہسپانوی لڑکیاں سمندر کے کنارے زور زور سے قہقہے لگا کر اسے شرارتیں کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ چپو ار سے ٹانگیں لٹکا کر اس نے سمندر کے نیلے پانی پر بچوں کی طرح پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ بڑی دور جہاں سمندر اور آسمان ملتے ہیں۔ خوب صورت زاویئے بن کر اڑنے والے ایلبیٹروس پیر رہے تھے، اختر کشتی کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر انہیں اپنی زبان میں زور زور سے پکارنے لگا "بھائی ایلبیٹروسو ادھر آؤ۔ اپنی کہو ہماری سنو" پھر اس نے کان پہ ہاتھ رکھ کر الاپنا شروع کر دیا۔

چاروں اور ہے پانی پانی۔
ایک بھی قطرہ پی نہ سکوں۔
تم ہی بتاؤ ایلبیٹراسو

مر جاؤں یا زندہ رہوں!

رعنا غزال لڑکیاں اور زور زور سے ہنسنے لگیں اور وہ اسی طرح گیت گاتا واپس ساحل پر ان کے پاس آگیا۔ ازوبیلا نے کہا" آج اگلا سبق لینے نہیں چلو گے۔ سویلا کا میلہ سر پر ہے "۔
اختر نے اپنے نچلے ہونٹ پر انگلی چلا کر اکتارہ بجاتے ہوئے کہا "ضرور! ضرور!" اور ساری پارٹی ہنستی کھیلتی چلنے لگی۔

استاد روجر جوترے کے ایک کنارے پر کھڑا نوجوانوں کو مشق کرتے دیکھ رہا تھا۔ اختر نے اپنا مجینٹا سلک کا پارچہ اٹھا لیا اور استاد کو جھک کر سلام کیا۔ تنگ پتلون اور بہت سے بٹنوں والی بنڈی پہنے ملازم کمان ایسے سینگ لے کر آگے بڑھا اور حلق سے ارنے بھینسے کی سی آواز نکال کر اختر کو بھانسے دینے لگا۔ اختر اپنے پارچے کو ہوا سے جھٹک کر پہلو بدل لیتا اور ملازم خنوڑخنوڑ کرتا آگے نکل جاتا۔ استاد روجر دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اسے خوشی ہو رہی تھی کہ اختر نے اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں جلد ترقی کرلی ہے۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے استاد اختر کے پاس آیا اور اس کے ہاتھ سے پارچہ لے کر کہنے لگا: "کبھی کبھی پارچہ تمہارے جسم سے لگ جاتا ہے۔ جلدی میں تم اپنی کہنیوں کا زاویہ غلط کر جاتے ہو یہ ٹھیک نہیں دیکھو" ملازم اسی طرح نتھنوں سے آواز نکالتا استاد کی طرف بڑھا اور استاد نے ہر وار خالی دیا۔ پارچہ اختر کو لوٹاتے ہوئے روجر نے کہا۔
"یہ کبھی نہ بھولو کہ بل لوٹ کر پھر حملہ کرنے آرہا ہے۔ اپنا فن دکھانے کے لیے لاپرواہی کے مظاہرے جسمانی حرکتوں سے کرو۔ لیکن اپنی توجہ ہمیشہ بل پر مرکوز رکھو — چلو شاباش چلو"
اور مشق شروع ہوگئی۔

سعید نے لحاف کا کونہ ذرا سا اٹھایا اور اختر کی ناک چٹکی میں پکڑ کر ہولے ہولے ہلاتے ہوئے کہا:
"منوتہوجی اتوجی دن تل آیا"۔ اختر نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھا اور چھڑانے کی غرض سے اپنی ناک سکوڑ کر کہا۔

"ستیاناس کر دیا۔ سارا کھیل بگاڑ دیا۔"

"کیوں؟" سعیدہ نے پوچھا۔

اختر نے کہا: "میں بل فائیٹنگ کر رہا تھا اور تم نے آ کر میری توجہ ہٹا دی۔ اگر سینگ میرے پہلو میں گھس جاتا تو؟" سعیدہ نے حیرانی سے کہا: "بل فائیٹنگ؟"

"ہاں۔ ہاں بل فائیٹنگ" اختر نے جھوٹ موٹ تنک کر کہا۔

"یہاں بستر میں؟" سعیدہ نے پوچھا۔

"یہ اوہو" اختر نے سنجیدگی سے کہا: "بستر میں لیٹ کر تو میں اپنی حرکات سے لاپرواہی کا اظہار کر رہا تھا ورنہ میری ساری توجہ تو بل پر ہی مرکوز تھی۔"

اس کی بات سعیدہ کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس نے جھنجھلا کر کہا: "پتہ نہیں کیا فارسی بول رہے ہیں آپ —— اٹھیئے امی بلا رہی ہیں۔ چائے ٹھنڈی ہو جائے گی" اختر نے اس کی باتوں کا جواب دیئے بغیر سعیدہ کو کندھوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اس کا منہ چوم لیا۔ سعیدہ گھبرا کر چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اختر نے پوچھا: "تم ابھی ابھی آلو بخارا کھا کر آئی ہو؟"

سعیدہ نے کوئی جواب نہ دیا تو اختر نے آپ ہی آپ کہا: "اوہ بھلا آجکل آلو بخارا کہاں ہوتا ہے۔ اچھا تو چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے؟"

"ہاں" سعیدہ نے جھینپ کر کہا۔

اختر نے اٹھ کر کہا "تم چلو میں منہ پر ایک چھپاکا مار کر ابھی آتا ہوں۔"

غسلخانے میں جا کر اختر نے رات کے باسی پانی سے چہرے پر پے در پے کئی تریڑے دیئے اور تولیے سے دونوں گال رگڑتا بڑے کمرے میں چلا آیا۔

چچی نے کہا "صدقے جاؤں چائے کب سے بنا کر رکھی ہے اور تم خیر سے اب اٹھے ہو۔"

اختر نے جھوٹ موٹ جمائی لے کر کہا: "اٹھا کہاں ہوں چچی اٹھا دیا گیا ہوں۔ میں نے تو جب سے دوکان چھوڑی ہے ساڑھے گیارہ بجے سے پہلے نہیں اٹھتا۔"

اس پر سعیدہ ہنسنے لگی۔

اختر نے منہ پکا کر کے کہا: خدا کی قسم چار مہینے سے سورج نکلتا نہیں دیکھا۔ پتہ نہیں اب کیسے نکلتا ہے۔ پہلے تو بے چارہ زرد سا چہرہ لے کر طلوع ہوا کرتا تھا اور پھر اس نے سعیدہ کی طرف دیکھ کر کہا: ایمان سے مجھے تو اس کی فکر کھائے جاتی ہے۔"

"کس کی؟" چچی نے چونک کر کہا۔

"سورج کی۔" اختر نے شاہی ٹکڑے میں انگلی گڑو کر کہا۔

" اس پر چچی بھی ہنسنے لگیں۔

اختر نے پوچھا: چچی شاہی ٹکڑے کیسے بنتے ہیں؟

چچی نے پنیر کی ٹکیا کاٹتے ہوئے کہا: کیوں تو کیوں پوچھ رہا ہے۔ اب ہوٹل کھولنے کا ارادہ ہے کیا؟

اختر نے مسکرا کر کہا: ہوٹل تو خیر اب میں کیا کھولوں گا۔ لیکن اگر ولایت میں میرا دل شاہی ٹکڑے کھانے کو چاہا تو یہ نعمت کہاں سے لوں گا۔"

مجھے لکھ دینا۔ میں بھیج دوں گی۔" چچی نے بڑی سنجیدگی سے کہا: پارسل کر دوں گی۔"

"تو میرا پتہ لکھ لو۔" اختر نے سعیدہ کو مخاطب کر کے کہا: "انگلستان کے وزیر اعظم کی معرفت ۱۰، ڈاؤننگ سٹریٹ لندن بھجوا دینا۔"

چچی نے یقین مان کر کہا: "یاد رکھنا بیٹی چائے پی کر کسی کاغذ پہ لکھ لینا تیرے ہاتھ کے بنے ہوئے شاہی ٹکڑے اگر انگریز کھائیں گے تو اس موٹی پیسٹری کو منہ تک نہ لگائیں گے۔"

سعیدہ نے اثبات میں ہلکا سا سر ہلایا اور چائے پیتی رہی۔ چچی اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئیں تو سعیدہ نے آہستہ سے پوچھا۔

"آج آپ باہر جائیں گے کہ گھر پر ہی رہیں گے۔"

اختر نے کہا "کیوں تمہاری کیا رائے ہے؟"

سعیدہ نے جواب دیا "گھر پہ ہی رہیے۔ میں پہلے دو پیریڈ پڑھ کر آجاؤں گی۔ پھر ہم جگ سا پزل جوڑیں گے۔ میں نے آپ کے لیے بارے والا کی دکان سے خرید اتھا۔"

"اور اسے آج تک جوڑا نہیں۔"

"جوڑنے کی کوشش تو کی پر وہ مجھ سے جوڑا نہ جا سکا۔"

"تو مجھ کو تم نے جگ سا سمجھ لیا ہے۔"

"اور کیا۔"

"بھلا جڑائی کیا ملے گی۔"

سعیدہ خاموش رہی۔

اختر نے سیدھی انگلی کھڑی کر کے کہا "بس ایک۔ صرف ایک۔"

سعیدہ نے اس کا بھی کوئی جواب نہ دیا اور اپنی نگاہیں پیالی میں ڈال دیں تو اختر نے پوچھا۔

"اچھا اگر میں آج سارا دن گھر سے باہر رہوں اور شام کو واپس آؤں تو کیسے رہے؟"

"تو میں آپ سے ساری عمر نہ بولوں۔"

"ساری عمر!"

"ہاں۔"

"اچھا تو پھر ہم آج سارا دن گھر سے غائب رہیں گے۔ شام کو لوٹیں گے اور تمہیں منا بھی لیں گے۔"

"توبہ میں تو کبھی بھی نہ بولوں۔"

"چاہے میں کتنی منتیں کروں۔"

"ہاں۔"

"اچھا تو پھر ہو گیا سودا۔" اختر نے ہاتھ بڑھا کر کہا "آج تمہارا دم خم بھی دیکھ ہی

لیں گے۔"

سعیدہ نے اس کے ہاتھ سے اپنی انگلیاں چھڑا کر کہا۔"منظور ہے۔"

"چچی آگئیں تو سعیدہ نے اپنی پیالی میز پر ڈالتے ہوئے کہا۔"امی دیر ہو گئی ہے میں تو چلتی ہوں۔"

اختر نے بھی اپنی پیالی واپس رکھتے ہوئے کہا۔"چچی میں بھی چلتا ہوں۔ مجھے بھی دیر ہو رہی ہے۔"

"چچی مسکراتے ہوئے بولیں۔"تجھے جا کر کونسی عدالت لگانی ہے۔ چپکا بیٹھا رہ۔"

"عدالت نہیں لگانی" اختر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔"منصف صاحب سے ملنا ہے۔ این ڈی

وامق صاحب سے۔"

"چچی نے کہا۔"ہاں سچ تمہارا وامق صاحب ایک مرتبہ یہاں بھی آیا تھا اور گگو کو دوربین میں لگا کر

دیکھنے والی بہت سی فلمیں دے گیا تھا۔"

"بس بس" اختر نے یوں ہی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔"اسی منصف سے ملنا ہے۔

بڑے کام کا آدمی ہے چچی۔ لیکن ہے ذرا غصہ ور۔ ایک مرتبہ روٹھ جائے تو منتا نہیں۔ اگر اسے

پتہ چلا کہ میں یہاں آیا ہوں اور پہلے ہی دن اس سے نہیں ملا تو وہ ساری عمر نہیں بولے گا اور آج

کل جو ایک بار روٹھ جاتا ہے وہ ساری عمر نہیں بولتا۔"

"چچی نے کہا۔"شکل سے تو ایسا نہیں لگتا۔"

اختر نے گوشۂ چشم سے سعیدہ کو دیکھ کر کہا۔"چچی مصیبت تو یہی ہے کہ میرے سارے دوست

شکل کے اور ہیں اور دل کے اور۔"

"چچی نے کہا۔"ہمیں تو آج تک تیری طبیعت کا پتہ نہ چل سکا۔ تیرے دوست تو پھر غیر ہیں۔"

اختر نے جواب دیا۔"میری طبیعت کا کیا ہے رنگ رنگیلی مہندی جیسی لال سرخ بیر بہوٹی۔"

"چچی نے بڑے پیار سے تنگ کر کہا۔"ہرے ہٹ تیری باتیں تو خاک بھی پلے نہیں پڑتیں۔"

اختر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔"چچی میری باتیں خاوند تھوڑی ہیں۔"

اس پر چچی کو ہنسی آگئی۔ اور انہوں نے اختر کی کمر میں تھپڑ مار کر کہا" بکے جاتا ہے"۔
سعیدہ کتابیں اٹھائے اس کمرے کے سامنے سے گزر گئی۔ اختر کے دروازے سے گذرتے ہوئے اس نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی اور سر کو دروازے کی مخالف سمت میں پھیر لیا۔ اختر صوفے میں دراز سگریٹ پی رہا تھا۔ سعیدہ کو اس طرح گذرتے ہوئے دیکھ کر اختر کو ہنسی آگئی۔ وحیدہ نے بھی ایک بار ایسے ہی غصے کا مظاہرہ کیا تھا۔ بڑے سالوں کی بات ہے جب وہ ساتویں جماعت کا طالب علم تھا تو سارا خاندان آجی بھیا کی شادی پر جہلم میں اکٹھا ہوا تھا۔ وحیدہ اس سے عمر میں دو سال بڑی تھی۔ لیکن قد میں چھوٹی تھی۔ اور اختر اس لحاظ سے اسے اپنے سے چھوٹی ہی تصور کرتا رہا۔ ایک دوپہر جب وہ سنگار میز کے سامنے کھڑی پاؤڈر لگا رہی تھی تو اختر باہر صحن سے توے کی سیاہی ہاتھ پر لگا کر اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ کمرے میں لڑکیاں اور عورتیں آجا رہی تھیں اور وہ موقع کی تلاش میں مٹھار مٹھار کر وحیدہ سے باتیں کر رہا تھا۔ جب چند لمحوں کے لیے کمرے میں کسی کا داخلہ نہ ہوا اور وحیدہ پاؤڈر لگا چکنے کے بعد ناخن پینٹ کرنے لگی تو اس نے سیاہی بھرا ہاتھ اس کے چہرے پر مل دیا۔ وحیدہ نے برش پھینک کر ایک زور کا تھپڑ اختر کے منہ پر مارا اور پھر رونے لگی۔ اختر ہنستا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ غسلخانے میں جا کر اپنا ہاتھ دھویا اور پانی بھرا لوٹا اور صابن دانی لے کر پھر اسی کمرے میں آگیا۔ ایک لفظ بولے بغیر اس نے وحیدہ کا منہ دھلوایا اور جب وہ اٹھنے لگی تو اختر نے ٹونٹی کی دھار سے تھوڑا سا پانی اس کے گریبان میں ڈال دیا۔ وہ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی اور اختر بھاگ گیا۔ اس کے بعد سارا دن اس کے سامنے سے گذرتے ہوئے وحیدہ دوسری طرف منہ پھیر لیتی۔ شام کو وہ اکیلا دریا کی طرف نکل گیا اور مچھوے میں بیٹھ کر رات ڈھلنے تک جہلم کی سیر کرتا رہا۔ اس کی غیر موجودگی میں بنارسی لنگڑے کا ایک ٹوکرا گھر پر آیا۔ سب نے خوب آم کھائے اور صحن میں جگہ جگہ چھلکوں اور گٹھلیوں کے انبار لگا دیئے۔ گھر پہنچ کر اسے شادی میں پکنے والے شوربے کی ایک پلیٹ چار پانچ باہر ایسی روٹیوں اور آموں کی خوشبو کے علاوہ اور کچھ نہ ملا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ صحن کے آخری

سرے میں اپنی کھری چارپائی پر تکیہ دوہرا کر کے لیٹ گیا۔ وحیدہ صحن میں ادھر ادھر چکر کاٹ رہی تھی اور جب وہ اس کی چارپائی کے قریب سے گذرتی تو غصے اور نفرت سے منہ ادھر پھیر لیتی۔
رات چھا گئی اور حقہ بجانے والوں نے اپنے فرشی حقوں کو چارپائیوں سے پرے دھکیل کر ان کی منہالیں اوپر آسمان کی طرف کر دیں اور خود کروٹ بدل کر نیند کی لپیٹ میں آنے لگے تو اختر کو اپنے سرہانے کسی کی موجودگی کا ہلکا سا احساس ہوا۔ لنگڑے کی جانفزا خوشبو کا ایک بھبکا اس کے نتھنوں سے جیسے معدہ میں اتر گیا اور پیشتر اس کے کہ وہ سر اٹھا کر دیکھ سکے ایک بڑا سا آم اس کے گال سے رگڑ کھا کر کندھے سے لگ گیا۔ اس نے ایک دم کہنی کا سہارا لے کر سر پھرا کر دیکھا۔ وحیدہ جا رہی تھی۔ اسی طرح منہ موڑے غصہ سے تنی ہوئی! اور ابھی جب سعیدہ اس کے سامنے سے گذری تھی تو وہ سوچنے لگا کہ دونوں بہنوں کی غصیلی حرکات کتنی مشترک ہیں۔

سٹوڈیو پہنچ کر اختر نے این۔ ڈی وامق صاحب کا کمرہ دریافت کیا۔ اس وقت دن کے گیارہ بجے ہوں گے۔ وامق صاحب اپنی میز پر جھکے ہوئے نئی فلم کا سینریو لکھ رہے تھے۔ سگریٹوں کا ایک ڈبہ ان کے سامنے پڑا تھا اور اندھے شیشے کی اتھاہ ایش ٹرے میں کنارس تک بیڑیوں کے ٹکڑے مردہ ٹڈیوں کی طرح پڑے تھے۔ کمرے میں داخل ہو کر اختر نے کہا: "بدلہ سنجی کی جے ہو"۔
وامق نے چونک کر دیکھا اور خوشی سے زور کا ایک نعرہ لگایا۔ گلے ملنے کے لیے وہ تیزی سے آگے بڑھا تو میز کے نوکیلے کونے نے اس کے کولہے پر ایک ہچکچاتا ہوا بوسہ دیا۔ وامق ادھر توجہ دیئے بغیر اختر سے چمٹ گیا اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح گتھ گئے کہ بات کرنی اور سانس لینا دشوار ہو گیا۔ چند لمحوں تک یہی کیفیت رہی اور جب گرفت ڈھیلی ہوئی تو وامق نے بایاں ہاتھ نکال کر آہستہ آہستہ کولہا سہلانا شروع کر دیا۔ اسے ایک ہلکا سا دھکا دے کر اختر نے کہا۔
"لن ترانی کے بچے پچھلے دنوں تو لاہور آیا اور مجھے اطلاع تک نہ دی"۔
وامق نے خفت سے ہنستے ہوئے کہا: "اطلاع کیوں کر دیتا چاچا۔ ایک رات ہال

رہا۔ اگلے دن سیٹھ کا تار آگیا۔ اور میں شام کی گاڑی سے بمبئی چل دیا۔"

"اور تو ایک دن میں مجھ سے نہیں مل سکتا تھا۔"

"مل تو سکتا تھا اگر جی پر گھر سے نکلنا ہی نصیب نہ ہوا۔ دن بھر اماں اور بھابیوں سے شادی کے معاملے پر تکرار ہوتی رہی۔"

اختر نے تیوری چڑھا کر کہا۔ "جیس بیس کے گھوڑے! تجھے اپنی شادی ہم سے پیاری ہو گئی۔"

وامق ہنسنے لگا تو اختر نے سنجیدگی سے کہا۔ "دیکھ تو نے بجو تیرے دفتر میں سب کو بتاتا ہوں کہ تو میٹرک فیل ہے اور تیرا نام نیاز درکی کی بجائے نظام دین ہے۔ آخر سالے یہ کیا اسسٹنٹ بنا رکھا ہے؟"

وامق نے ہنسی میں اضافہ کر دیا اور سر ہلا کر کہا "لالے ایسے ہی کام چلتا ہے۔ یہ بمبئی ہے بمبئی۔"

اختر نے کہا۔ "یہ بمبئی ہے تو چل چل کر بیئر پیتے ہیں۔"

وامق نے کہا "اور یہ سنیریو؟"

"اوہ سنیریو کی ماں کا ڈائیلاگ" اختر نے اس کا ہاتھ کھینچ کر کہا۔

کاغذوں اور فائلوں کو سمیٹ کر وامق نے دراز میں بند کیا اور اختر کو ساتھ لے کر ڈائریکٹر کے کمرے میں آگیا۔ ڈائریکٹر ڈانس ماسٹر سے باتیں کر رہا تھا سامنے کے بڑے صوفے پر ایک مارواڑی نوجوان سویا ہوا تھا اور اس کے ساتھ پائپ کی آرام کرسی پر ایک سانولی سی لڑکی اپنے پرس کو کھولنے اور بند کرنے میں مصروف تھی۔ وامق نے ہاتھ اٹھا کر اسے سلام کیا اور لڑکی نے سر کی جنبش سے مسکرا کر جواب دیا۔ اختر کی طرف جھک کر وامق نے آہستہ سے کہا۔

" اس لڑکی کو اچھی طرح سے دیکھو لو۔"

ڈانس ماسٹر اپنی تقریر ختم کر چکا تھا اور تین مرتبہ سلام کرنے کے باوجود ابھی تک وہیں تھا ہر سلام کے بعد ڈائریکٹر پھر اس سے بے معنی سی گفتگو شروع کر دیتا۔ جب چوتھی مرتبہ سلام کر کے ڈانس ماسٹر واقعی کمرے سے باہر نکل گیا تو ڈائریکٹر نے وامق کو دیکھ کر کہا "اچھا فرماؤ"۔

وامق نے بڑی لجاجت سے کہا "عرض یہ ہے کہ میرے یہ دوست پنجاب سے تشریف لائے ہیں اور شاپنگ کے لیے مجھے اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ان کے ساتھ چلا جاؤں۔ لنچ کے بعد آ جاؤں گا"۔

"لنچ کے بعد آ جائے گا نا؟" ڈائریکٹر صاحب نے ایک چٹھی پڑھتے ہوئے پوچھا۔

ضرور آ جاؤں گا" وامق نے وثوق سے کہا "بلکہ اس سے پہلے ہی پہنچ جاؤں گا"۔

ڈائریکٹر نے کاغذ سے نظریں اٹھائے بغیر کہا "تو جاؤ"۔

اور دونوں اس کے کمرے سے باہر نکل آئے۔

بار کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وامق نے کہا "لاے بیئر پی کر مجھے رونا آ جاتا ہے۔ آج میں حتی الامکان ضبط کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر میرے پانچ چھ آنسو نکل پڑیں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا"۔

اختر نے کہا "پانچ چھ تو کیا مجھے پچاس ساٹھ آنسوؤں پر بھی اعتراض نہ ہوگا"۔

گھٹیا سی بار تھی۔ متوسط طبقے کے نچلے درجے والے لوگ یہاں آ کر سستی قسم کی شراب پیا کرتے تھے۔ وامق اور اختر بھی ایک کیبن میں بیٹھ گئے۔ وامق نے دیسی بیئر کا آرڈر دیا اور جب لڑکا گلاس اور بوتل لے کر آ گیا تو وامق نے پوچھا۔

"اختر تم نے کب پینی شروع کی"۔

اختر نے مسکرا کر جواب دیا "ابھی تک تو منہ نہیں لگایا۔ اس وقت سے پینی شروع کروں گا"۔

وامق نے کہا "دفتر میں تو تُو نے ایسے کہا تھا جیسے ازل کا شرابی ہو"۔

اختر نے کھنکار کر کہا۔" دفتروں میں ایسے ہی کہا جاتا ہے پیارے۔"

جب دونوں گلاس بھر چکے اور بیئر کا جھاگ کناروں سے اُمڈ کر میز پر پھیل گیا تو وامق نے کہا۔" تو نے وہ لڑکی دیکھی ہے؟"

" ہوں"

" کیسی ہے تیرے خیال میں؟"

" جیسی لڑکیاں ہوا کرتی ہیں۔"

" پھر بھی۔"

" بھئی جیسی ہوا کرتی ہیں، پھر بھی کیا۔"

وامق نے کہا۔" یار یوں تو نہ کہو۔ وہ تو ایک چیز ہے۔ ایک ایسی چیز جسے قدرت نے سوندھی سوندھی مٹی سے بنا کر سوکھنے کے لیے رکھا ہو اور جو ابھی ٹھیک سے نہ سوکھی ہو۔"

اختر کو ہنسی آ گئی۔ اس نے گلاس منہ سے لگا کر دو بڑے بڑے گھونٹ بھرے اور کہا۔

" سالے یہ تیرے سیٹھ کا سٹوڈیو نہیں۔ لڑکی کی بات کر۔ ڈائیلاگ نہ بول۔"

وامق نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔" میں ڈائیلاگ بول رہا ہوں ظالم! میں تو اس پری وش کا ذکر کر رہا ہوں۔ سیدھے سادے الفاظ میں اس کا نقشہ کھینچ رہا ہوں۔"

" تجھے اچھی لگتی ہے وہ لڑکی؟" اختر نے پوچھا۔

" اچھی!" وامق نے زور دے کر کہا۔" اختر تمہاری قسم میں جب اسے دیکھتا ہوں تو میرا نماز پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔"

اختر نے کہا۔" خیر پھر تو ایسی کوئی بات نہیں۔ لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کسی دن اسے دیکھ کر تجھے سنکھ بجانے کا شوق نہ چرانے لگے۔ اور تو گلی میں سکاؤٹوں کی طرح بگل ڈالے لفٹ رائٹ کرتا پھرے۔"

وامق نے گلاس ختم کر کے کہا۔" تو بھی میرا مذاق اڑانے لگا۔ میری محبت کی تذلیل کرنے لگا۔"

اختر نے اس کا گلاس بھر کر بوتل کو زور سے میز پہ مارا اور کہا۔" او نظام دین! او بچے سقے کی اولاد! اس محبت کی رٹ لگانے والا آدمی مجھے اس ریکارڈ کی طرح لگتا ہے جس کا گروو خراب ہو گیا ہو اور —— ساؤنڈ بکس کی سوئی اس ایک ہی ایک چکر میں گھوم کر محبت محبت پکارنے لگی ہو۔ میں نہ تو محبت کا قائل ہوں اور نہ بھٹ کھایا اور کھسکے کو جائز سمجھتا ہوں۔ محبوب بن سکتے ہو تو عاشق بننے کی کوشش نہ کرو۔ چکور سے چاند بھلا۔ ایسے پھول بنو جس پہ ہزاروں بلبل اپنی جان لڑا دیں۔"

وامق نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔" اور اگر کوئی پھول نہ بن سکتا ہو تو؟"

" تو وہ نقلی پھول بن جائے۔" اختر نے کاگ دباتے ہوئے کہا" رنگ برنگے کاغذ کا۔ پتے کی کترنوں کا شوکیس بن جاؤ۔ نظام دین شوکیس۔ بلبل خوشبو کا دیوانہ نہیں ہوتا۔ جلوے بازی پہ مرتا ہے۔ جیسے تم نے این ڈی۔ وامق والی ڈمیش چلا رکھی ہے ایسے ہی محبوبیت کی کوئی بزنس چلا لو۔"

وامق نے اپنے سینے پر زور سے گھونسہ مار کر کہا۔" مرد بھی کبھی محبوب ہوا ہے۔"

" جبھی تو میں کہتا ہوں۔" اختر نے ہنس کر کہا۔" مرد ازل سے آج تک عاشق ہی بنا رہا۔ دنیا بنے ہزاروں سال گذر گئے۔ ہر چیز بدل گئی لیکن اس نے اپنی فطرت نہ بدلی۔ عورتوں نے اس کی کمزوری سے خوب فائدے اٹھائے۔ لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی طبیعت پر ذرا سا جبر کر کے ان سے دو دو ہاتھ کریں اور تم کیا جانو نظام دین جب یہ کڑیاں چڑیاں ہجر کی ایک کالی رات کاٹینگی تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔"

نظام دین یہ باتیں سن کر زار زار رونے لگا۔ اس نے اپنے سامنے پڑے ہوئے گلاس کی بیئر زمین پر گرا دی اور میز پہ سر رکھ دیا اختر نے اسے ہلا کر کہا۔

" سن بیٹا، جس ایکسٹرا لڑکی کے لیے تو یوں ہلکان ہو رہا ہے وہ سیٹھ کے بیٹے کے ساتھ

ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہوگی۔ اس کو اپنی طرح بیقرار بنانا ہے تو لوگوں کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر لیکن اس سے کھنچ کر رہ اس کی موجودگی میں محفل کا دولہا بن جا لیکن اس کی طرف توجہ نہ کر اور اگر——

وامق نے میز سے سر اٹھا کر بات کاٹتے ہوئے پوچھا "اور اگر وہ پھر بھی نہ چاہے تو؟"

اختر نے کہا: "الو کے پٹھے! وہ نہ چاہے تیری بلا سے۔ پر تو چاہے جانے کے انداز پیدا کیے جا۔"

وامق نے اختر کو اس کی جنس بدل دینے والی گالی دے کر کہا: "اگر تیری شکل میرے جیسی ہوتی پھر دیکھتا تو کسی کو یہ نسخہ کیسے بتاتا۔"

اختر ہنس پڑا۔ اس نے وامق کے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا "نظام دینا! تنگ ہونے کی کوئی بات نہیں۔ یہ لیلیٰ تیری پھوپھی کوئی حور یا پری تو نہ تھی کہ بھائی صاحب کو خاک چھنوا کر مار دیا اور وہ شیریں ہوگی کوئی کوتاہ جبین، پکوڑا سی ناک والی لڑکی جس کے وصال کی جھوٹی خبر سن کر حضرت صاحب تیشے سے سر پھوڑ کر فوت ہو گئے اور آخر میں یاران سب کی مرشد وہ کلو پیٹرا۔ تم نے توت عنخ کی تصویریں تو دیکھی ہی ہوں گی۔ کیا ہوگی بھلا وہ بھی؟"

وامق چپ رہا۔

اختر نے اس کا شانہ ہلا کر پوچھا: "دیکھی ہیں نا ان کی تصویریں؟"

"دیکھی ہیں۔" وامق نے اسی طرح جواب دیا۔

"تو کیا ہوگی بھلا وہ؟"

"چاند کا ٹکڑا" وامق نے روہانسی آواز میں جواب دیا۔

"اختر نے ہنس کر کہا "بس جی لیا تینے تو مورے لال۔"

اس کے بعد ان کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ ایک بوتل بیئر کی اور منگوائی گئی اور وہ

دونوں اپنے اپنے خیالات میں گم چھوٹی چھوٹی چسکیاں لگا کر تلخ مشروب پیتے رہے۔ جب بار کے کلاک نے دو بجائے تو وامق نے رومال سے اپنا منہ پونچھ کر کہا: "اچھا لالے میں تو چلتا ہوں"

"کھانا نہیں کھائے گا کیا؟" اختر نے پوچھا۔

"اوں ہوں"

"تو آج بھوکا ہی رہے گا؟"

"نہیں۔ دفتر میں منگوا لوں گا۔ تو یہ بتا کہ جا کب رہا ہے؟"

اختر نے ذرا دیر سوچنے کے بعد کہا: "جانے سے ایک روز پیشتر تجھے اطلاع کر دوں گا"

وامق نے پوچھا: "اور اگر تو بھول گیا تو؟"

"تو سیدھی بات ہے" اختر نے تبسم کرتے ہوئے کہا۔ "سمجھ لینا کہ لاہور آکر تو نے مجھے جو اطلاع نہ کی تھی اس کا بدلہ چک گیا"

"اوں ہوں" وامق نے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا "وہ بدلہ پھر کبھی سہی۔ اس مرتبہ مجھے ضرور اطلاع کرنا"

"بہت اچھا" اختر نے اپنی دونوں ٹانگیں میز پر رکھ لیں اور ڈبیہ سے آخری سگریٹ نکال کر سلگالی۔

جب اختر گھر لوٹا تو بتیاں جل چکی تھیں۔ لمبے برآمدے کے آخری کونے پر سعیدہ پھولوں کی کیاری کی طرف منہ کیے کھڑی تھی۔ اختر پنجوں کے بل چلتا ہوا آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچا اور اسے بازوؤں میں لے لیا۔ وہ بجلی کی طرح تڑپی اور کیاری میں کود گئی۔ اختر نے آہستہ سے اسے آواز دی۔ لیکن وہ تیزی سے کچن کی طرف چلی گئی۔ اسی کونے کے ساتھ والے کمرے میں بتی جل رہی تھی اور پنکھے کے نیچے چچا جان، چچی جان اور گگو کھانے کی میز کے ارد گرد اس کا انتظار کر رہے تھے۔ کمرے میں داخل ہو کر اختر نے معذرت کے طور پر دو چار جملے کہے اور اپنا تھیلا چھوٹی میز پر ڈال

کر ایک کرسی پر ڈٹ گیا۔ چچا جان نے بیرے کو آواز دی اور جب وہ کھانے کی ٹرے لے کر اندر آیا تو اس کے ساتھ سعیدہ بھی داخل ہوئی۔ کھانا کھا چکنے کے بعد اختر نے اپنا تھیلا اٹھایا اور چاکلیٹ کا ایک بڑا سا پیکیٹ نکال کر میز کے نیچوں بیچ رکھ دیا۔

"اوہ نیلسلز" چچا جان نے خوش ہو کر کہا "گڈ۔ ویری گڈ"

گگو نے لالچ بھری نگاہوں سے اپنے ابا کو پیکٹ کھولتے ہوئے دیکھا اور اختر کی طرف دیکھ مسکرانے لگا۔ چاکلیٹ نکال کر چچا جان نے اسے درمیان سے توڑا اور آدھا اپنی بیوی کو دے کر باقی خود کھانے لگے۔ چچی نے ایک ٹکیہ توڑ کر گگو کو دی اور تین ٹکیوں والی ایک قاش اختر کو دے کر باقی آپ کھانے لگیں۔ اختر نے ایک ٹکیہ توڑ کر دانتوں میں دبالی اور دو ٹکیاں سعیدہ کو دیتے ہوئے کہا "تم بھی دیکھو سعیدہ بڑے معرکے کی چیز ہے"۔

سعیدہ نے بڑے تصنع کے ساتھ کہا "جی شکریہ! میرا گلا خراب ہے"۔

"پھر تو اور بھی اچھی بات ہے" اختر نے سفارش کرتے ہوئے کہا "اس میں چند اجزا ایسے ملائے جاتے ہیں جو گلے کی ہر بیماری کا علاج ہیں نیلسلز کھا کر تو آدمی خواہ مخواہ پکا گانا گانے لگتا ہے"۔

"چچا جان زور زور سے ہنسنے لگے۔ سعیدہ ہچکچائی تو چچی نے کہا" لے لو بیٹا"

سعیدہ نے منمناتے ہوئے کہا "امی میرا جی نہیں چاہتا"

"پھر ٹھیک ہے" اختر نے دونوں ٹکیاں ایک ساتھ چباتے ہوئے کہا "جی نہ چاہتا ہو تو یہ چیز بے حد نقصان پہنچاتی ہے۔

اختر غسلخانے میں کھڑا ہاتھ دھو رہا تھا کہ سعیدہ تولیہ لینے کے لیے اندر داخل ہوئی۔ اختر نے ہاتھ بڑھا کر مضبوطی سے اس کی کلائی پکڑ لی۔

"چھوڑیئے" سعیدہ نے ... لگاتے ہوئے کہا۔

"اوں ہوں" اختر نے نفی میں سر ہلایا۔

سعیدہ نے تیوری چڑھا کر کہا: چھوڑیئے میں نہیں بولتی۔"

اختر نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا: "ایک بات تو سنو۔"

"نہیں۔ میں نہیں سنتی" سعیدہ اسی طرح زور لگاتی رہی۔

"ایک بات۔ چھوٹی سی بات۔"

"اوہنوں۔ میں نہیں سنتی۔"

"اچھا ننھی سی بات۔"

"کہہ جو دیا میں نے۔ نہیں سنتی۔"

اختر نے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا: "نہیں سنتی تو جاؤ، نہ سنو" اور بڑبڑاتا ہوا غسلخانے سے باہر نکل گیا۔

سگریٹ سلگا کر اختر اپنے کمرے میں آکر پلنگ پر لیٹ گیا۔ جوں ہی سگریٹ ختم ہوئی اس نے اٹھ کر بتی بجھائی اور بستر پر دراز ہو کر تکیہ دہرا کر کے سر کے نیچے رکھ لیا۔ چند لمحوں بعد اختر نے دیوار کی طرف کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے اٹیچی کیس میں دو پوری موم بتیاں پڑی تھیں۔ لیکن آج اس نے انہیں روشن کرنا مناسب نہ سمجھا اور اسی طرح اندھیرے میں سونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن موم بتی کا سفید سفید وجود اور اس کی مدہم مدہم روشنی اختر کے لیے لوری کی تاثیر رکھتی تھی اور آج وہ لوری سے محروم ہو کر اندھیرے میں ٹکریں مار رہا تھا۔ اچانک اس نے اپنے کندھے پر ایک ہاتھ کی ہلکی سی گرفت محسوس کی۔ اختر نے پلٹ کر دیکھا۔ سعیدہ اس پر جھکی کھڑی تھی اور اس کا دوپٹہ کندھے پر سے ہوتا ہوا اختر کے بستر پر ماتھا رگڑ رہا تھا۔

"روٹھ گئے": سعیدہ نے دبی زبان میں پوچھا۔

"ہاں": اختر نے پھر دیوار کی طرف منہ کر لیا۔

"بس اتنی سی بات پر۔"

"ہاں اتنی سی بات پر": اختر نے اسی طرح جواب دیا۔

سعیدہ نے اپنا ماتھا اختر کی کنپٹی پہ رکھ دیا اور اس کی زبان سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کا دھارا بہہ نکلا۔

"میں مر جاؤں گی اتر جی میں مر جاؤں گی۔ تم مجھ سے روٹھے کیوں ہو۔ بولو اتر جی بولو۔ اتر جی تم مجھ سے بولتے کیوں نہیں"

اختر نے آہستہ سے اس کا کندھا تھپتھپانا شروع کر دیا اور کہنے لگا۔

"بولتا ہوں۔ بولتا کیوں نہیں۔ تم ہی تو مجھ سے بیگانگی برتنے لگی ہو۔ تمہیں تو میں اچھا ہی نہیں لگتا۔ سعیدہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اپنے نتھنوں اور منہ سے ایک ہی سانس چھوڑ کر بولی۔

"لگتے ہو، اتر جی لگتے ہو۔ تم تو میرے چاند ہو۔ میری دنیا ہو۔ اتر جی مجھ سے روٹھا نہ کرو۔ چندے جی مجھ سے ناراض نہ ہوا کرو۔ بتاؤ بولتے ہو نا؟"

اختر نے اس کو اسی طرح تھپتھپاتے ہوئے کہا: "بولتا ہوں۔ بولتا ہوں۔ تم سے نہیں بولوں گا اور کس سے بولوں گا۔ تم تو میری سعیدہ ہو۔ میری ہو نا؟"

سعیدہ نے کوئی جواب نہ دیا اور اسی طرح سر رکھے لمبی لمبی سانسیں لینے لگی جب آنسوؤں کے چند موٹے موٹے قطرے ایکدم اس کی آنکھوں سے پھسل کر اختر کی کنپٹی پر پھیل گئے تو وہ تڑپ کر اٹھا۔ اس نے سعیدہ کو اپنی آغوش میں لے لیا اور اس کی آنکھیں چوم کر کہنے لگا۔

"یہ تم رونے کیوں لگی ہو۔ میں روٹھا ہی تھا مر تو نہیں گیا تھا۔"

مرنے کا نام سن کر سعیدہ نے پھر اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا اور دھیمی دھیمی سسکیاں بھرتے ہوئے کہا: "ایسے نہ کہو اتر جی میں مر جاؤں گی۔ تم سے کبھی نہ بولوں گی۔ مرنے کا نام لو گے تو میں روٹھ جاؤں گی۔"

اختر نے مسکراتے ہوئے کہا: "اچھا پھر نہیں کہتا۔"

سعیدہ اس کی گود میں آرام سے پڑی تھی۔ چند سیکنڈ اسی طرح گذر گئے۔ اختر نے آہستہ

سے پوچھا: "سب لوگ کہاں گئے"۔

سعیدہ نے اسی طرح اپنے خیالات میں گمن جواب دیا: "بچے اور نوکر لوگ سو گئے ہیں اور امی ابا جان کی ٹانگیں دبا رہی ہے"۔

اختر نے کہا: "اور تمہیں ڈر نہیں لگ رہا؟"

"لگ رہا ہے"۔ سعیدہ نے معصومیت سے جواب دیا۔

"تو تم جاکر سوتی کیوں نہیں؟" اختر نے پوچھا۔

"مجھے نیند نہیں آتی"۔ سعیدہ نے بھولپن سے کہا۔

اختر نے پوچھا: "تمہیں آیتہ الکرسی آتی ہے؟"

"آتی ہے"۔

"تو تین مرتبہ پڑھ کر اپنے سینے پر دم کر دو۔ آپ ہی آپ نیند آجائے گی"۔

سعیدہ نے اختر کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنی طرف کھینچا اس کی پیشانی، دونوں آنکھوں اور ٹھوڑی کو بوسہ دے کر بولی۔

"اب آجائے گی نیند"۔

وہ اٹھ کر جانے لگی تو اختر بھی چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ دروازے کے پاس اس نے سعیدہ کو اپنے ساتھ لپٹا لیا اور اس کے کان کے پاس منہ لے جاکر بولا۔

"مجھے بھول تو نہ جاؤ گی سعیدہ؟"

سعیدہ نے رکتے ہوئے کہا: "تم بھول جاؤ گے ــــ تم ہی بھلا دیتے ہو اترجی۔ میں تو تمہیں ہر وقت یاد کرتی رہتی ہوں۔ میں تو ہر روز تمہارا انتظار کیا کرتی ہوں۔

اختر نے کہا: "اور تمہارا خیال ہے کہ میں تمہیں یاد نہیں کرتا؟"

"ہاں"۔ سعیدہ نے یقین سے کہا: "اترجی تم دوستوں میں پہنچ کر مجھے یاد نہیں کرتے، اپنی سہیلیوں سے مل کر مجھے بھلا دیتے ہو۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ان سب کو زہر دے دوں۔ ان

سب کا گلا گھونٹ دوں۔"

اختر نے ہنس کر اسے زور سے بھینچ لیا اور کہا: "پھر وہی بات۔"

تیسرے دن وامق اختر کے یہاں آیا۔ اس نے آتے ہی گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ اور اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ اس نے خواہ مخواہ اختر ایسے آدمی کو اپنا مصلاح کار بنا کر وقت ضائع کیا۔ اختر ہنس ہنس کر گنواروں کی طرح سگریٹ پی رہا تھا اور وامق کہہ رہا تھا۔

"الو کے تاؤ تو نے مجھے بال دھوا کر دیا۔ مس ابلیکر پہلے مجھ سے ہنس کر بات کیا کرتی تھی لیکن جب سے میں نے محبوبیت کے مظاہرے شروع کیے ہیں وہ مجھے وش بھی نہیں کرتی اگر چند دن اور یہی حال رہا تو میں کچھ کھا کر سو رہوں گا۔"

"تو کوئی انوکھی بات نہیں کرو گے۔" اختر نے اس طرح کش لگاتے ہوئے کہا۔ "پہلے مرد بھی اسی طرح کرتے آئے ہیں۔ مزا تو جب ہے کہ اسے کچھ کھا کر سونے پر مجبور کر دو۔"

وامق نے تنک کر کہا: "بکواس نہ کر۔ کبھی شیشے میں اپنی صورت دیکھی ہے۔ باپ دادا ساری عمر ہلدی کا بیوپار کرتے رہے اور صاحبزادے کو یوسف بننے کا شوق چرایا ہے۔"

اختر نے کہا: "یوسف بننے کا شوق تو مجھے جب چراتا اگر میں یوسف نہ ہوتا۔ ارے میں یوسف بر قیمت اول خریدہ ہوں۔"

وامق نے آہ بھر کر کہا: "ٹھیک کہتے ہو سالے۔ سفید رنگ ہے۔ کنجی آنکھیں اور بھورے بھورے بال معشوق نہ بنو گے تو کیا تھانیدار بنو گے۔"

"یہ بات نہیں" اختر نے کرسی اس کے قریب کھینچ لی۔ "محبت کے کھیل میں شکل و صورت بے معنی سی چیز ہے۔ یہاں تو اور ہی طرح کے گل بوٹے بہار دکھاتے ہیں۔"

"کہاں سے ملتی ہے ایسے گل بوٹوں کی نیری؟" وامق نے بات کاٹ کر پوچھا۔

اختر مسکرا دیا اور چٹکی بجا کر راکھ جھاڑتے ہوئے بولا: "یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔ پر ایسی نیری ہوتی ضرور ہے کبھی کبھار تو یہ بوٹے انسان کی فطرت میں خود رو گلاب کی طرح پنپ جاتے ہیں اور کبھی ان

کی قلمیں لگا کر بھی انہیں پروان چڑھایا جاتا ہے "۔

وامق نے کہا "تیرے پاس دو چار ایسی قلمیں ہوں تو مجھے بھی دیدے ۔ آخر تم کس دن میرے کام آؤ گے "؟

"پتہ نہیں "۔ اختر نے کہا "کہ میرے پاس ایسی قلمیں ہیں کہ نہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ایک نہ ایک دن کسی لڑکی کو کرب کی اندھیری راتوں میں دھکا دے کر اس کی جان لے لوں گا "۔

"جان لے لوں گا "؟ وامق نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں " اختر نے منہ پکا کر کے کہا "جب بڑے بڑے جگردار سورما سینے میں چھری بھونک کر ختم ہو گئے تو ان کڑیلیں چڑیوں کا کیا ہے "۔

وامق چپ ہو گیا۔

اختر نے کہنا شروع کیا : "آخر ان کے سینوں میں بھی تو دل ہوتا ہے ۔ وہ بھی تو ہم جیسی آنکھیں اور ہمارے ایسی کیفیات رکھتی ہیں ۔ پھر وہ بھلا عاشق کیوں نہیں ہو سکتیں ۔ یہ کیا کہ ہر بار مرد ہی اقدام کرے "!

پھر اس نے ذرا سوچ کر کہا "یاد رکھنا وامق میری زندگی کا وہ کامیاب ترین دن ہو گا ۔ جب کوئی چڑیا مجھ سے والہانہ محبت کرنے لگے گی اور کسی نہ کسی وجہ سے مجبور ہو کر زہر پھانک لے گی ۔ اس کے بعد چاہے میں سمندر میں کود جاؤں یا گلے میں پھندا ڈال کر لٹک جاؤں مجھے ذرا بھی ملال نہ ہو گا ۔ آخر وہ بھی تو محبت کریں ۔ وہ بھی تو تکالیف اٹھائیں "۔

وامق چپکے سے اٹھا ۔ میز پر پڑے ہوئے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکالا اور بولا ۔

"یار تمہاری یہ باتیں میری سمجھ سے بالا ہیں "۔ پھر ماچس کی تلاش میں اپنی جیبیں ٹٹولتا اسی طرح کمرے سے باہر نکل گیا ۔

روانگی سے ایک دن قبل اختر کو ایک نئی گھڑی خریدنے کی ضرورت محسوس ہوئی ۔ اس نے ایک ٹیکسی پکڑی اور ہار نبی روڈ کی طرف نکل گیا ۔ دو دو دکانیں بیننے کے بعد اس نے آخر کار ایک معمولی سی

گھڑی انتخاب کی، یہ نئی گھڑی اس کی پرانی گھڑی سے کافی گھٹیا تھی لیکن چونکہ نئی تھی اور جدید طرز پر بنی ہوئی تھی اس لیے اختر نے اسے انتخاب کیا۔ سیلز گرل کوئی پارسی لڑکی تھی۔ جب اس نے کیش میمو کے ساتھ ڈبیا اسے دینا چاہی تو اختر نے اسے ہاتھ میں لینے کی بجائے اپنی کلائی آگے بڑھا دی اور کہا۔

"تکلیف نہ ہو تو اسے یہاں باندھ دیجئے۔"

لڑکی مسکرائی اس نے کیش میمو شوکیس پر رکھ کر ڈبیا کھولی اور اختر کی آستین کافی دور تک ہٹا کر گھڑی اس کی کلائی پر باندھ دی۔ گھڑی بندھوا چکنے کے بعد اختر نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنی پرانی گھڑی جیب سے نکال کر کہا۔ "تم برا نہ مانو گی۔ اگر یہ گھڑی میں تحفے کے طور پر تمہیں دے دوں؟"

لڑکی نے مڑ کر پرے کونے میں بیٹھے ہوئے سیٹھ کو دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

"نو تھینکس۔"

اختر نے کہا: "آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ یہ گھڑی مجھے بہت عزیز ہے۔ اور میں لندن جا رہا ہوں۔ اگر خدانخواستہ جہاز راستے میں ڈوب گیا تو مجھے اس گھڑی کے غرق ہونے کا بہت صدمہ ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ ہندوستان ہی میں رہے۔" لڑکی ہنس پڑی۔ اس نے جواب دینے کے لیے اپنے لب کھولے بھی لیکن اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ اور اس نے گھڑی اختر کے ہاتھ سے لے لی۔ اختر نے کہا۔

"میری وصیت ہے کہ یہ گھڑی ہندوستان سے باہر نہ جائے۔"

گھڑی کو غور سے دیکھتے ہوئے لڑکی نے آہستہ سے اچھا کہا اور اختر ہاتھ لہراتا دکان سے نکل گیا۔

واپسی پر اختر نے سوچا کہ چلو لگے ہاتھوں چچا جان کے دفتر کا بھی ایک چکر ہو جائے۔ اس دفعہ اس نے وکٹوریہ کی سواری کو ترجیح دی اور اپنی نئی گھڑی کو بار بار کان سے لگاتا ہوا ایک

وکٹوریہ میں بیٹھ گیا۔

چچا جان نے عینک اتار کر کہا: تم کل جا رہے ہو۔

"جی" اختر نے گلا صاف کر کے کہا۔

چچا جان نے گھنٹی بجا کر اپنے پی۔اے کو بلایا اور کہا: مسٹر درما کل میرا بھتیجا انگلینڈ جا رہا ہے۔ میں دفتر نہ آ سکوں گا۔ کوئی ضروری کاغذ ہو تو ابھی لے آؤ۔"

مسٹر درما نے سر کھجا کر کہا "جی کوئی ایسا ضروری کاغذ تو ہے نہیں۔ اگر ہوا تو میں کل بنگلے پہ آ کر دستخط لے لوں گا۔" پی۔اے چلا گیا تو چچا جان نے کہا: میری رائے تو یہ تھی کہ تم شادی کرا کے انگلینڈ جاتے۔ لیکن خیر اب چونکہ اتنی جلدی یہ بندوبست نہیں ہو سکتا۔ یوں ہی سہی۔"

اختر سر جھکا کر ہنستا رہا۔

چچا جان نے پھر کہنا شروع کیا: بات یہ ہے بیٹا کہ ہم مشرقی لوگ کنوارے آدمی کا ولایت جانا مناسب نہیں سمجھتے۔ یہ فرنگنیں کم بخت ایسی ہوائی دیدہ ہوتی ہیں کہ بھولے بھالے ہندوستانیوں کو یوں پھانس لیتی ہیں — آخر بھائی صاحب نے تمہارے لیے کوئی لڑکی انتخاب بھی کی؟

"ابھی تک تو نہیں جی" اختر نے دلہن کی طرح شرماتے ہوئے کہا۔

"آخر کیوں؟" چچا جان نے ذرا رعب سے پوچھا۔

"بس جی یوں ہی —— مجھے تو معلوم نہیں۔"

چچا جان کہنے لگے: "یہ خوب ہے۔ بھائی صاحب بھی کمال کرتے ہیں — لیکن خیر مجھے کیا۔ انہیں تو اپنے دوستوں کی لڑکیاں اپنے گھر کی بیٹیوں سے اچھی لگتی ہیں۔ ان میں سے ہی کسی کیساتھ کر دی ہوتی۔ وہ ٹھاکر صاحب کہاں ہوتے ہیں آج کل۔"

"پنڈی میں ہیں جی شاید۔"

اختر نے شاید کو حذف کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

"تو پھر؟"

"کچھ نہیں جی" اختر نے گھبرا کر کہا۔

بات کا رُخ بدلنے کے لیے چچا جان نے کہا: "اچھا بھئی تمہارا جہاز کس وقت جا رہا ہے؟"

"کل شام کے چھ بجے"

"تو ٹھیک ہے۔ پھر تو وحیدہ کی امی بھی تمہیں سوار کرانے چل سکتی ہیں"

اس کے بعد چچا جان خاموش ہو کر اپنے کاغذوں پر جھک گئے۔

اختر ان سے اجازت لے کر سیدھا گھر پہنچا۔ چچی کہیں گئی ہوئی تھیں۔ گگو ایک کمرے میں اکیلا بیٹھا لوڈو کھیل رہا تھا اور سعیدہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اختر کپڑے بدلنے کے لیے اپنے کمرے میں داخل ہوا تو سعیدہ کو اپنی کرسی پر بیٹھے پایا۔ وہ دروازے کی طرف پشت کیے ٹھوڑی ناخنوں پر ٹکائے گم سم بیٹھی تھی۔ اس نے دونوں پاؤں چارپائی کی پٹی پر رکھے ہوئے تھے اور اس کے سفید کبوتروں جیسے سینڈل زمین پر اُلٹے پڑے تھے۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اختر اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا اور اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ سعیدہ کی آنکھیں اور گال بھیگے ہوئے تھے۔ اختر نے فوراً اپنا ہاتھ ہٹا کر اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ منا منا شاردنا تیوں آ گیا؟"

سعیدہ زور لگا کر اپنی ٹھوڑی نیچے کرنے لگی۔ اختر نے اسے مضبوطی سے تھامے رکھا اور برابر کہے گیا۔

"تیوں جی! تیوں جی!! منا منا شاردنا تیوں آ گیا؟"

اس پر بھی سعیدہ اسی طرح بیٹھی رہی تو اختر نے اس کے گدگدیاں کرنی شروع کر دیں۔ پر آج نہ جانے اس نے بے ہوشی کی کون سی دوا پی لی تھی کہ اتنی ساری گدگدیوں کا اس پر کوئی اثر ہی نہ ہوا۔ اختر نے اپنی ٹھوڑی سعیدہ کی مانگ پر ٹکا کر سر زور زور سے جھلانا شروع کر دیا۔

"بولو جی۔ سعیدہ جی بات کرو۔ بولو نا کیا ہوا ہے۔ بتاؤ جی، نہیں تو ہم تم سے ناراض ہو

جائیں گے۔" بھلا اس میں پوچھنے کی کیا بات تھی! اختر اچھی طرح سے جانتا تھا کہ سعیدہ کیوں رو رہی ہے، لیکن وہ اس کے منہ سے سب کچھ کہلوا کر اپنی تسکین چاہتا تھا۔ اپنے کانوں کو سعیدہ کی بعد دیا خود اس کے منہ سے سنوا کر جی خوش کرنا چاہتا تھا اور جب اختر نے آخری فقرہ "نہیں تو ہم تم سے ناراض ہو جائیں گے" کہہ کر ٹھوڑی سعیدہ کے سر سے اٹھالی تو سعیدہ تڑپ کر اٹھی اور اپنے مخروطی ہاتھ اختر کے سامنے جوڑ کر کہنے لگی۔

"یوں نہ کہا کرو اختر جی۔ ایسے الفاظ سن کر میری جان نکل جاتی ہے۔ کاش میں تمہیں ناراض دیکھنے سے پہلے ہی مر جاؤں۔ اختر جی مجھے پتہ ہے تم مجھ سے کبھی ناراض نہ ہو گے۔ تم صرف مجھے ڈراتے رہتے ہو اور میں ڈرتی رہتی ہوں۔"

اختر نے سعیدہ کو اپنے ساتھ لگا کر بچے کی طرح تھپکتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو رو کیوں رہی تھی؟"

سعیدہ نے کہا: "تم کل چلے جاؤ گے۔ اور میں اکیلی رہ جاؤں گی تم وہاں کسی میم سے شادی کر لو گے اور میں ساری عمر تمہیں یاد کرتی رہوں گی۔"

اختر نے کہا: "تو چلو! میرے ساتھ کیوں نہیں چلتی ہو۔"

سعیدہ نے کہا "تم مجھے لے جاتے ہی کہاں ہو۔"

"چلو" اختر نے یقین دلاتے ہوئے کہا "خدا کی قسم چلو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"اسی طرح چلیں؟" سعیدہ نے پوچھا۔

"نہیں اسی طرح کیوں۔ تم اپنے سینڈل پہن لو۔" اختر نے جواب دیا۔

سعیدہ کی نمناک آنکھوں اور بھیگے ہوئے گالوں کے نیچے دو پتلے پتلے ہونٹ مسکراہٹ سے پھیل گئے: "بتاؤ نا" سعیدہ نے اس کی چھاتی پر ہولے سے سر مارتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" اختر نے پوچھا۔

"یہی

"بس یہی"

"اوہو۔ تم تو شاید شادی کے بارے میں کہہ رہی ہو ــــ کیوں ہے نا؟"

"ہاں۔"

"تو بھائی عرض یہ ہے کہ تمہارے والدین نہیں مانتے۔"

"جھوٹ"۔ سعیدہ نے آنسو پونچھ کر کہا۔

"کیوں؟"

"تایا جان نہیں مانتے کہ میرے ابا جان۔"

"ایک ہی بات ہے تمہارے ابا کیا اور ان کے بڑے بھائی کیا۔"

"لیکن تایا جان کو میں ــــ اتنی بری کیوں لگتی ہوں"۔ سعیدہ نے چین بہ جبیں ہو کر پوچھا۔

"بری تو کوئی ایسی نہیں لگتی ہو"۔ اختر نے جواب دیا۔ "وہ صرف تمہیں ناپسند کرتے ہیں"۔

"تم تو مجھے پسند کرتے ہو نا اترجی"۔ سعیدہ نے بے چینی سے پوچھا۔

اختر نے اسے زور سے بھینچ لیا۔"کیسی باتیں کرتی ہو۔ ابا جان چاہے مانیں یا نہ لیکن میں تمہیں سے شادی کروں گا۔ تم ہی تو میری سعیدہ ہو۔ بتاؤ میری ہو نا"۔

سعیدہ نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن اس کے حلق میں کوئی چیز اٹک گئی۔ اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہہ نکلے جس قدر اختر اسے چپ کرانے کی کوشش کرتا اسی قدر ان کی روانی میں تیزی پیدا ہو جاتی۔ اس کے کوٹ کا کالر بھیگ گیا۔ رومال تر ہو گیا۔ حتیٰ کہ ان کھاری چشموں نے اس کے ہونٹوں کو ٹھوڑی تک لتھیڑ دیا۔

گینگ وے اٹھا دیا گیا۔ جہاز نے ایک مرتبہ پھر بھیانک آواز نکالی۔ سارے مسافر ریلنگ کے پاس جمع ہو گئے اور رومال ہلا ہلا کر ساحل کے لوگوں کو الوداع کہہ رہے تھے۔ چچا جان اور چچی دونوں بڑے مغموم نظر آ رہے تھے۔ سعیدہ نے گگو کی انگلی تھام رکھی تھی اور اس کا نقاب ہوا میں پھر پھڑا رہا تھا۔ ڈکس نے آہستہ آہستہ جہاز دھکیلنا شروع کر دیا۔ سبزی مائل نیلی لہریں

جاتا ہوا جہاز رینگنے لگا۔ اختر کو آج پہلی مرتبہ احساس ہوا جیسے کوئی اس کے کلیجے کو آہنی پنجوں میں پکڑ کر لٹک گیا ہو۔ اس نے سعیدہ کے پھڑپھڑاتے ہوئے سیاہ نقاب کو آبدیدہ نگاہوں سے دیکھا اور آہستہ سے ہاتھ لہرایا۔ برفیلے تودے کی طرح پھسلتے ہوئے جہاز پر اسے یوں دکھائی دیا جیسے سعیدہ لہروں پر اس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے اور پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔

" اترجی واپس آؤ گے نا۔ اترجی مجھے یاد رکھو گے نا؟ — تم شعبدہ بازوں کے دیس میں جا رہے ہو۔ کافروں کے ملک کو جا رہے ہو۔ یہ لوگ سحر کئے بغیر مسحور کر لیتے ہیں۔ سفید چمڑی دکھا کر لوگوں پر کالا علم کر دیتے ہیں۔ بھول نہ جانا اترجی۔ تم مجھ سے وعدہ کر کے جا رہے ہو۔ مجھ سے اقرار کر کے جا رہے ہو۔ بولو! تم آؤ گے نا؟ بتاؤ اترجی مجھے خط لکھتے رہو گے نا؟ مجھے ڈر لگ رہا ہے اترجی۔ تم شعبدہ بازوں کے دیس میں جا رہے ہو۔ عیاروں کے طلسمات میں جا رہے ہو۔ بولو! بولو!! اترجی تم بولتے کیوں نہیں؟"

ڈکس نے جہاز کو دھکیلنا چھوڑ دیا تھا اور اب وہ اپنے آپ چل رہا تھا۔ اس کی رفتار میں ذرا سا فرق آگیا تھا۔ سائرن زور زور سے بجنے لگا تھا۔ مسافر اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ گئے تھے اور جہازی چھوٹے بڑے رسّے لے کر ادھر ادھر گھومنے لگے تھے۔ اختر نے لہروں پر بھاگنے والی لڑکی سے نگاہیں ہٹا کر دور ساحل کی طرف دیکھا۔ سعیدہ کا نقاب ہوا میں پھڑپھڑا کر الوداع کہہ رہا تھا۔ اس نے ریلنگ سے ہاتھ اٹھا کر کان کے پاس اسے ہلکی سی جنبش دی اور اپنے کیبن میں آگیا۔

۲

اگلی صبح اختر کی آنکھ بڑی دیر سے کھلی۔ اس کے تینوں ہمراہی اپنے اپنے بستر سمیٹ کر باہر چلے گئے تھے اور کیبن خالی پڑا تھا۔ بستر پر آلتی پالتی مار کر اختر نے پورٹ ہول سے باہر جھانک کر دیکھا، نیلے سمندر پر چمکتے ہوئے سورج کی تیز دھوپ آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ جہاز کی روانی سے اردگرد بہت سی لہریں پیدا ہو رہی تھیں جن کے آگے پیچھے دھوپ غوطے مار کر ابھری چلی آتی تھی۔ وہ رات گئے تک ایک ایک کر کے اپنے گھر والوں کو یاد کرتا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے گھومتے ہوئے ایک چاک پر اس کی امی، ابا، بھائی، بہن، چچا، چچی اور سعیدہ چپ کھڑے تھے۔ چاک گھومتا رہا اور اس پر ایستادہ موجود آہستہ آہستہ بھٹکتی ہوئی روح کی طرح تحلیل ہونے لگا۔ آخر میں صرف سعیدہ رہ گئی۔ اختر دبے پاؤں اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ میز پر چھوٹی سی موم بتی جل رہی تھی۔ اس کے آس پاس چند بے ترتیب کتابیں پڑی تھیں، اور ان کے بیچوں بیچ نیلے رنگ کا ایک پیڈ کھلا پڑا تھا۔ سفید بستر پر سعیدہ اوندھے منہ لیٹی تھی اور اس کے ریشمی بالوں کا تکیئے پر ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اختر نے دونوں ہاتھوں سے اس کے جھولی بھر بالوں کو سمیٹا۔ بھینچ سا ایک بل دیا اور اس کے دونوں کندھوں پر بوجھ ڈال کر اپنا گال اس کے سر پر پھر رکھ دیا۔ سعیدہ بچوں کی طرح پھسک پھسک رو رہی تھی اور ساٹن کا براق تکیہ بھیگ کر ہلکا سا موتیا رنگ اختیار کر گیا تھا۔ اختر نے اس کے شانے ہلا کر کہا۔

"سعیدہ روتی کیوں ہو۔ میں لام پر تو نہیں جا رہا۔ چند مہینوں ہی کی بات ہے جلد لوٹ آؤں گا اور آئندہ سے ہم اکٹھے سفر کیا کریں گے۔" سعیدہ اسی طرح تکیئے میں منہ چھپائے زور زور سے سسکیاں

بھرنے لگی۔ اس کا سارا بدن ہلکورے لینے لگا اور تکیئے کے رگ و ریشہ میں پانی دور دور تک سرایت کر گیا۔ اختر نے چمکار کر کہا۔

"دیکھو تم سے وعدہ جو کیا ہے کہ جلد آؤں گا اور ضرور آؤں گا۔ پھر تم روتی کیوں ہو؟ —— تمہاری جان کی قسم سعیدہ، میں امتحان ختم ہوتے ہی آ جاؤں گا۔ ضرور آ جاؤں گا۔ خواہ میری راہ میں جہنم ہی کیوں نہ حائل ہو۔" سعیدہ کے کرب میں اضافہ ہو گیا۔ دردناک سسکیوں نے اس کا بدن جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ چاک تیزی سے گھومنے لگا اور سعیدہ کا وجود بھی اختر کی آنکھوں میں نیند کی طرح تحلیل ہو گیا اور اب اختر سمندر میں غوطے مار کر ابھرتی ہوئی دھوپ کو دیکھ رہا تھا جو ہر غوطے کے بعد نکھرتی چلی جاتی تھی۔

غسل خانے میں جا کر اختر نے شیو بنائی۔ کھاری پانی سے بھرے ٹب میں غوطہ لگایا اور کپڑے بدل کر سموکنگ روم میں آ گیا۔ ایک بوڑھا ڈچ پائپ سلگائے موٹی سی کتاب پڑھ رہا تھا اور اس کے ساتھ نیلی آنکھوں والی ایک دھان پان سی لڑکی استنبول کا چپٹا سگریٹ پی رہی تھی۔ اختر نے صوفے پر بیٹھ کر جیب سے بیڑی نکالی۔ لائٹر کے چکر کو زور سے رگڑتے ہوئے اس نے معنی خیز نگاہوں سے لڑکی کو دیکھا اور بیڑی سلگا کر کھینچنے لگا۔

عمل خاں نے کمرے میں داخل ہو کر زور سے کہا۔ "صبح تو آپ بڑی دیر سے اٹھا۔" بوڑھے ڈچ اور نیل چشم لڑکی نے چونک کر عمل خاں کو دیکھا تو اختر نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تشریف رکھیئے۔ میں صبح دیر سے اٹھنے کا عادی ہوں۔"

"چلیئے، چائے تو نہیں پیا ہوگا آپ نے؟" عمل خاں نے پوچھا۔

"نہیں۔" اختر نے راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ "میں چائے پابندی سے نہیں پیتا۔"

عمل خاں نے ہنس کر کہا۔ "اچھا خوب اے۔ صبح صبح تو چوتھے بچے کو بی چائے طلب ہوتا۔"

"ہوتا ہوگا۔" اختر نے بے پروائی سے کہا۔ "مجھے تو کسی چیز کا بھی طلب نہیں ہوتا۔"

عمل خاں پھر ہنسا اور ذرا ذرا سے وقفوں کے بعد دیر تک ہنستا رہا۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"آپ ذرا میرے ساتھ آؤ۔ ایک ضروری کام ہے جس کو آپ کے بعد اور کوئی نہیں کر سکتا۔"

کیبن میں پہنچ کر عمل خاں نے اپنے بکس سے ایک رجسٹر نکالا اور اسے کھولے بغیر اختر کو اپنے بارے میں بتانے لگا کہ وہ کھالوں کا ایک بہت بڑا بیوپاری ہے اور سرحد کے علاقے سے جتنی کھالیں باٹا کمپنی خریدتی ہے وہ اسی کی معرفت خرید کی جاتی ہیں اور اب وہ کمپنی کا بڑا دفتر دیکھنے کے لیے چیکوسلواکیہ جا رہا ہے۔ عمل خاں نے بتایا کہ یہ دعوت اسے کمپنی کی طرف سے دی گئی ہے اور اس کے ساتھ کمپنی کا ایک کارندہ مسٹر شمو کا بھی جا رہا ہے جو رات اختر کے سامنے والی برتھ پر سویا تھا۔

"اور اب" عمل خاں نے کہا: "اور اب بڑی مصیبت ہے۔ مجکو انگریزی نئیں آتا۔ اور اُدر ولایت میں سب انگریزی بولے گا۔ یخوتو کا فکر نئیں۔ اور کوئی اُردو بولے تو ہم بی بولے۔"

پھر اس نے رجسٹر کھول کر کہا "اسی لیے ام نے یہ کاپی تیار کیا ہے۔"

اختر نے دیکھا کاپی کے دس بارہ صفحوں پر اُردو میں مختلف قسم کے سوال لکھے ہوئے تھے۔ آپ کا نام کیا ہے؟ آپ کی گھڑی میں کیا بجا ہے؟ یہ راستہ کدھر جاتا ہے؟ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ میں پٹھان ہوں۔ ہمارا وطن صوبہ سرحد ہے۔ میں کھالوں کی تجارت کرتا ہوں۔ اوّل اوّل تو یہ سوال چھوٹے چھوٹے تھے لیکن آخری صفحات پر کوئی سوال بھی دس بارہ سطروں سے کم نہ تھا۔ عمل خاں نے کہا۔

"بس اتنا مہربانی آپ کرو کہ ان کے جواب انگریزی میں بنا کر اردو میں لکھ دو۔"

اختر نے کہا: "یہ کام دس بارہ دن سے کم کا نہیں۔ آپ خواہ مخواہ تکلف کرتے ہیں۔ جب تک میں ان کا ترجمہ کروں گا۔ جہاز جنوا پہنچ جائے گا۔"

عمل خاں نے کچھ سوچ کر کہا۔ "اچا یہ آپ ضروری سوالوں کا جواب لکھ دو۔"

اختر نے کاپی عمل خاں سے لے کر اولیں سوالوں کے انگریزی جواب اُردو رسم الخط میں لکھ

دیئے، جب وہ کیبن سے نکلنے لگے تو مسٹر شمو کا اندر داخل ہوا۔ عمل خاں نے دونوں کا تعارف کرایا اور وہ دونوں اپنی شناسائی کو تقویت پہنچانے کے لیے ٹوپ ڈیک پہ چلے گئے۔

دوپہر کے کھانے پہ جب وہ سیلون میں داخل ہوئے تو شمو کا نے آخری کونے کی طرف آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے اختر سے پوچھا: "اس لڑکی کو رات دیکھا تھا؟"

اختر نے بے پرواہی سے کہا: "میں لڑکیوں کو غور سے دیکھنے کا عادی نہیں۔ چلتے پھرتے کوئی عین نگاہوں کے سامنے آجائے تو دیکھ لیتا ہوں ورنہ مجھ سے تردّد نہیں ہوتا۔"

شمو کا نے کہا: "تو تم بڑے ٹھنڈے آدمی ہو۔"

"بس کچھ ایسے ہی سمجھو" اختر نے اطمینان سے جواب دیا: "میں ایسے گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ جہاں سارا سال برف پڑتی ہے۔"

کھانے کی میز پہ مسٹر راؤ اپنی بیوی سے گھڑی گھڑی اس کی عافیت پوچھ رہے تھے وہ دونوں اپنے اپنے آپریشن کروانے وائنا جا رہے تھے، اور اختر کو بدقسمتی سے اسی جہاز میں جگہ ملی تھی جس میں وہ سوار تھے اور اسی کیبن میں برتھ نصیب ہوئی تھی جس میں یہ دائم المریض جوڑا سفر کر رہا تھا۔ اور اب ستم ظریفی یہ کہ اختر کھانے کی میز پہ بھی انہی لوگوں کا ساتھ دینا پڑا۔ میز پہ جتنی دفعہ مسٹر راؤ نے اپنی بیوی سے اس کی لحظہ بہ لحظہ بدلتی ہوئی طبیعت کے بارے میں پوچھا اتنی مرتبہ اختر نے گھور کر اسی لڑکی کی طرف دیکھا جس کی گردن کے نیچے سرخ سنہرا خون جھلکیاں مار رہا تھا اور میز سے اٹھتے وقت جب مسٹر راؤ اپنی بیوی کی بیمار پرسی کرنا بھول گئے تو بھی اختر نے اس لڑکی کو غور سے دیکھ ہی لیا کیوں کہ اسے علم تھا کہ اگر راؤ کا رومال فرش پہ نہ گر پڑتا اور وہ اسے نہیں اٹھاتے تو وہ ضرور اپنی ڈارلنگ سے اس کا احوال پوچھتے۔

چودھویں رات کا چاند اپنا معصوم سا چہرہ لے کر مسکرا رہا تھا۔ سمندر کی لہریں اسے چھونے کے لیے بیتاب ہوئی جاتی تھیں۔ جہاز اپنی مخصوص آواز نکالتا آگے بڑھ رہا تھا۔ بس کی دیواروں سے سر ٹکرائے جاتی تھیں اور اختر آہستہ آہستہ سگریٹ پیتے ہوئے

سوچ رہا تھا کہ یوریپن لڑکیوں کے بال اور آنکھیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں ؟ شموکا نے ڈھونڈتے ڈھونڈتے آخر اس کا کھوج نکال ہی لیا۔ اختر کے کندھے پر اس نے زور سے ہاتھ مار کر کہا :" یہاں کیا کر رہے ہو چلو چل کر ڈانس دیکھیں۔ وہاں وہ لڑکی بھی ہو گی۔ اسے غور سے نہ دیکھنا۔ یوں ہی دیکھ کر چلے آنا۔"

جب وہ بی ڈیک پر ناچ کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہی لڑکی ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کے ساتھ ناچتی ہوئی دروازے کے قریب سے گزر رہی تھی۔ اختر نے اسے بھرپور نگاہوں سے دیکھا اور اپنی نظریں اس پر گاڑ دیں، جیسے جیسے وہ گھومتی رہی اختر کی نگاہیں اس کے ساتھ ساتھ چکر لگاتی رہیں۔ اس نے ایک مرتبہ گھور کر اختر کو دیکھا اور پھر اپنی توجہ ادھر سے ہٹا لی۔ شموکا نے پوچھا۔

"آخر اسے یوں غور سے کیوں دیکھا جا رہا ہے ؟"

اختر نے اپنی نگاہیں ہٹائے بغیر جواب دیا :" میں سوچ رہا ہوں بھلا اس چھوکری میں ہے کیا جو سارے لوگ اس میں ایسی دلچسپی لے رہے ہیں :" شموکا نے جواب دیا :" اس میں کیا نہیں۔ یہ سمندر کی نیلاہٹ، چاند کی چاندنی۔ موسیقی کی دھن، ماں کی ممتا اور جلاد کا کڑا پن، بھلا اس میں کیا نہیں :"

اختر نے ہنسنے کی کوشش کی لیکن اس سے مسکرایا بھی نہ جا سکا اور وہ شموکا کو لے کر ٹوپ ڈیک پر آگیا۔ سیڑھیوں کے قریب ہی دو چھوٹی چھوٹی کرسیاں پڑی تھیں جہاں وہ آرام سے بیٹھ کر سگریٹ پینے لگے۔ ان کے سروں کے پیچھے سفید سفید کشتیاں لٹک رہی تھیں اور ان کے سامنے موٹے موٹے رسوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ دور دور تک جہاں پانی نظر آتا تھا چاند کی چاندنی اس سے لپٹی ہوئی تھی اور اونچی اونچی لہریں شور مچا مچا کر اپنے دامن جھٹک رہی تھیں۔

سیڑھیوں پر ہلکی سی آہٹ ہوئی اور چشم زدن میں وہ لڑکی ان کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی اس نے بڑی ملائمت سے کہا۔

"میں تھک گئی ہوں اور میرا سر چکرانے لگا ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں چند لمحوں کے لیے آپ کے پاس بیٹھ جاؤں۔"

دونوں نے اپنی اپنی کرسیاں پیش کیں لیکن وہ ادھر ادھر دیکھ کر کہنے لگی۔

"آپ تکلیف نہ کیجیے۔ رسوں کا یہ ڈھیر بھی کرسی سے کم نہیں۔"

اختر نے اس کے تاکے ہوئے ڈھیر پر بیٹھ کر کہا۔ "بہتر تو یہی تھا کہ آپ کرسی پر بیٹھیں، لیکن خیر! آپ کی مرضی نہیں تو نہ سہی۔"

وہ ذرا سی مسکرائی اور اختر کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایک لمبی جمائی لے کر اس نے پوچھا۔

"آپ لوگ کیا پئیں گے؟"

"لیمونیڈ۔" اختر نے منہ پھاڑ کر جواب دیا۔

"گیملٹ نہیں؟"

"گیملٹ" اختر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ کیا ہوتا ہے؟"

"ایک مشروب۔"

"شراب تو نہیں ہوتی؟" اختر نے پوچھا۔

"تھوڑی سی" اس نے چٹکی کھول کر کہا۔

"توبہ توبہ۔" اختر نے کان چھو کر کہا۔ "ہمارے مذہب میں تو شراب کا نام لینا بھی حرام ہے آپ پینے کو کہہ رہی ہیں۔"

"تو تم نہ پینا۔" اس نے شموکا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "آپ کیا پیئں گے؟"

شموکا نے بڑے ادب سے کہا۔ "وہسکی۔"

اس نے شموکا پر ایک مسکراہٹ ڈال کر کہا۔ "بار خاطر نہ ہو تو ذرا بیرے کو بلا لائیے۔"

اور شموکا بجلی کی طرح سیڑھیوں سے نیچے لپک گیا۔

ٹانگوں کی قینچی پر اس نے اپنی کہنی لگا کر ٹھوڑی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"تم کل سے مجھے گھور رہے ہو اور بات کرنے کے متمنی ہو۔ میں بھی اسی دن سے تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ پر میرے جی میں تم سے بات کرنے کی خواہش آج پیدا ہوئی ہے لیکن تم چونکہ بزدل تھے تمہیں جرأت نہ ہوئی اور میں اس لیے کہ بے باک ہوں تم سے باتیں کرنے چلی آئی۔"

اختر نے کہا۔ "آپ کو وہم ہو رہا ہے۔ میرے دل میں تو آپ سے بات کرنے کی تمنا کبھی بھی نہیں ہوئی۔"

اس نے مسکرا کر کہا۔ "یہ باتیں بمبئی کے ساحل تک ہی ٹھیک تھیں۔ اب تم عین سمندر میں ہو۔ یہاں تو اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو۔"

"دھوکا؟" اختر نے حیرانی سے کہا۔ "اور وہ بھی اپنے آپ کو! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔"

"خدا کی قسم میں ٹھیک کہتی ہوں" اس نے اردو میں جواب دیا۔

"تمہیں اردو آتی ہے؟" اختر نے اور حیران ہو کر پوچھا۔

"کچھ کچھ" اس نے پھر اسی طرح چٹکی کھولی۔

اتنے میں شمو کا بیرے کو ساتھ لے کر آ گیا۔ اس نے دو گیملٹ اور ایک بوتل وہسکی کا آرڈر دیا تو اختر نے کہا۔

"میرا لیمونیڈ؟"

"تم لیمونیڈ نہیں پیو گے۔" اس نے چمکار کر کہا۔

جب بیرا گیا تو اس نے پھر اسی لجاجت سے شمو کا سے کہا۔ "میرا پرس نیچے ڈانس روم میں رہ گیا ہے.....!"

اور فقرہ ابھی مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ شمو کا پھر سیڑھیاں میں غوطہ لگا گیا۔

اس نے کہا۔ "ہندوستان والی باتیں چھوڑو۔ اپنے گھر میں تم سب کی آنکھوں کے تارے تھے ٹھیک ہے! لیکن یہ عرشہ جہاز ہے اور تم یورپ جا رہے ہو۔"

اختر نے کہا: "میں تو تمہیں چھیڑ رہا تھا ورنہ گیملٹ تو میں ہزار مرتبہ پی چکا ہوں۔"

"گیملٹ" اس نے بڑے اطمینان سے کہا: "اپنی دانست میں تو شاید تم نے لاکھ مرتبہ پی ہو، لیکن اس وقت تم اسے پہلی مرتبہ چکھو گے۔"

اختر خاموش ہو گیا تو اس نے کہا: "رسوں کے ڈھیر پر بیٹھے بیٹھے تھک گئے ہو گے۔ یہاں آجاؤ۔ تمہارا ساتھی تمہاری جگہ بیٹھ جائے گا۔"

"نہیں میں بڑے مزے میں ہوں" اختر نے جواب دیا: "آپ تردد نہ کریں۔"

"میری مانو" اس نے سنجیدگی سے کہا: "یہاں آجاؤ تم تھک جاؤ گے اور رات بھر مجھے کوستے رہو گے۔"

اور جب شمو کا پرس لے کر واپس آیا تو اس کی جگہ پر اختر بیٹھا ہوا تھا بیرا آرڈر لیکر آگیا۔ اختر اور وہ لڑکی چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر کر گیملٹ پینے لگے اور شمو کا فہمکی کے جرعے چڑھانے لگا۔ آدھی بوتل کے بعد اس کی حالت خراب ہو گئی اس نے زور زور سے اپنے ملک کے لوک گیت گانے شروع کر دیئے اس لڑکی نے شمو کا کا کندھا تھپک کر کہا: "نیچے جا کر سو رہو۔ تمہیں ٹھنڈ لگ جائے گی۔"

"ٹھنڈ!" شمو کا نے خوف زدہ ہو کر کہا "اف خدایا کتنی ٹھنڈ ہے! مجھے سردی لگ رہی ہے۔ میں تمہاری بوتل اپنے ساتھ لے جاؤں؟"

"شوق سے" اس نے مسکرا کر کہا: "چاہو تو ایک بوتل اور منگا دوں۔"

"نہیں نہیں شکریہ، شکریہ!" کہتا شمو کا لڑکھڑاتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ اور وہ رات گئے تک ریلنگ پر کہنیاں ٹیکے باتیں کرتے رہے اور لہروں کو تملاتے ہوئے دیکھا کئے!

صبح صبح وہ لڑکی اختر کے کیبن میں آئی تو اختر نے عمل خاں سے اس کا تعارف کرایا۔ عمل خاں نے سرحدی ساخت کی انگریزی میں پوچھا: "آپ کا نام کیا ہے؟"

"ایستھر" اس نے مسکرا کر کہا۔

"آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟" عمل خاں نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

ایستھر نے کہا: "میں جرمن ہوں اور میونک کی رہنے والی ہوں۔"

عمل خاں نے سوچ کر بڑی مشکل سے کہا: "میں سرحد کا باشندہ ہوں اور کھالوں کا تاجر ہوں۔"

ایستھر نے پوچھا: "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

عمل خاں نے فوراً کہا: "چیکوسلواکیہ۔"

ایستھر نے سوال کیا۔ "آپ تجارت کے سلسلے میں چیکوسلو دیکیہ جا رہے ہیں یا سیاحت کی غرض سے گھر سے نکلے ہیں۔" چونکہ ایسے سوال کا جواب عمل خاں کے رجسٹر میں نہیں تھا اس لیے وہ پریشان ہو کر ٹکر ٹکر اختر کا منہ تکنے لگا۔

اختر نے مسکراتے ہوئے ایستھر سے کہا: "تم نصاب سے باہر کا سوال پوچھ رہی ہو۔ یہ واجب نہیں۔ عمل خاں نے ابھی اپنا پہلا سبق بھی ٹھیک سے یاد نہیں کیا۔"

اس کی بات ایستھر کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس نے مزید استفسار کیا تو اختر نے خان کے سمندری سفر پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ عمل خاں انگریزی سیکھ رہا ہے اور چند بندھے ٹکے سوالوں کے علاوہ اور کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ اس پر ایستھر کو ہنسی آ گئی اور عمل خاں بھی بہروں کی طرح سر ہلاتا اس کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔

جب انہوں نے سٹوارڈ کی مٹھی گرم کر کے کھانے کے کمرے میں ایک علیحدہ میز حاصل کر لی تو اختر نے کہا۔

"مجھے سمندر کے سفر میں ذرا بھی لطف نہیں آ رہا۔ ابھی تک نہ تو مجھے سمندری بیماری نے گھیرا ہے اور نہ ہی بحری قزاقوں نے جہاز پر حملہ کیا ہے۔"

ایستھر نے کہا: "کمال ہے تم میں محسوس کرنے کا مادہ سرے سے مفقود ہے۔ بحری قزاق

نے تم پر حملہ کیا، تم گھائل ہو گئے لیکن گرتے گرتے تم نے اسے بھی ہلاک کر دیا۔ حیران ہوں تمہیں اتنے بڑے حادثے کا ابھی تک علم کیوں نہیں ہوا۔"

"اور سمندری روگ کیا ہوا۔" اختر نے مسکرا کر پوچھا۔

"سمندری روگ؟" الیستھر نے دہراتے ہوئے کہا۔ "سمندری روگ تو تمہیں اس وقت لگے گا جب تم ساحل پہ اتر کر گاڑی میں سوار ہو جاؤ گے۔"

اختر نے سیانوں کی طرح کہا۔ "دیکھو الیستھر تم نے ڈاکٹریٹ تو نفسیات میں کی ہے اور باتیں خلیل جبرانی فلسفے میں کرتی ہو۔ یہ فلسفہ تمہارے منہ سے اوپرا اوپرا سا لگتا ہے۔"

الیستھر نے کہا۔ "واقعی چھوٹوں کو بزرگوں کی ہر بات فلسفہ معلوم ہوتی ہے — عزیز من میری تو ہر بات سیدھی ہے۔ یہ تو تمہاری سعادت مندی ہے کہ تم اسے فلسفے سے منسوب کرتے ہو۔"

اختر جھینپ سا گیا اور اس نے بات کا رخ پلٹتے ہوئے پوچھا، "بھلا الیستھر کے معنی کیا ہوئے؟"

الیستھر نے کہا۔ "الیستھر ستارے کو کہتے ہیں جو......"

"کمال حادثہ ہے۔" اختر نے بات کاٹ کر کہا۔ "اختر کے معنی بھی ستارے کے ہوتے ہیں۔"

"حادثہ نہیں۔" الیستھر نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ تو ہونے ہار حقیقتیں ہیں۔ ستاروں کی جوڑ ہ جالیں ہیں۔"

اختر نے بے چینی سے کہا۔ "ہونے ہار حقیقتوں کو چھوڑو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم ہندوستان کس غرض سے آئی تھیں؟"

الیستھر نے جواب دیا۔ "یہ مجھے خود بھی معلوم نہیں۔"

"اردو سیکھنے آئی تھیں؟"

"اونہوں۔"

"کسی کی محبت کھینچ لائی؟"

"بالکل نہیں۔"

"کسی نفسیاتی مطالعے کے سلسلے میں زحمت کی؟"

"نہیں۔"

"تو پھر تم ادھر کیسے چلی آئیں؟"

الیستھر نے کہا: "میرے ہاتھ پر سمندر کے سفر کی ریکھا تھی اور جنوا سے جو تیار جہاز مجھے ملا وہ بمبئی آرہا تھا۔ میں ہندوستان چلی آئی ـــــ کیا میں نے بُرا کیا؟"

"ہرگز نہیں۔" اختر نے وثوق سے کہا: "تم نے بہت ہی اچھا کیا۔"

الیستھر کا قد لمبا تھا۔ بال بالکل سیاہ اور بڑی بڑی آنکھوں میں موتی کوٹ کوٹ کر بھرے تھے۔ چلتی تو ایسے لگتا جیسے راج ہنس تیر رہا ہو۔ نہ پاؤں کی چاپ ہوتی نہ قدم تیزی سے اٹھتے ایک لہر ہوتی جو ساگر کی چھاتی پر ہولے سے ابھرتی اور ابھری چلی جاتی۔ دم رفتار کوئی چیز اسے ادھر ادھر دیکھنے پر مائل نہ کر سکتی۔ اس نے پیچھے مڑ کر کبھی نہ دیکھا تھا اور اگر کوئی اسے آواز دیتا تو وہ اپنی جگہ پر اسی طرح رک جاتی حتیٰ کہ پکارنے والا اس کے پاس پہنچ کر سامنے کھڑا ہو جاتا۔ راستہ چلتے لوگوں کو ہیلو کہہ کر متوجہ کرنا اس کا شعار نہیں تھا وہ تو اپنے قریب سے گذرنے والوں پر ایک ہلکی سی متبسم نگاہ ڈال کر سر کی خفیف سی جنبش سے وِش کیا کرتی تھی۔

میونک کے ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھنے والی اس لڑکی نے تعلیمی حلقوں میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ وہ جرمنی کی سب سے کم عمر پی۔ ایچ۔ ڈی تھی اور اپنی مادری زبان کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی میں بھی دستگاہ رکھتی تھی۔ عمر خیام کی رباعیات وہ فارسی رسم الخط میں اچھی طرح سے پڑھ سکتی تھی اور آسانی سے ان کے مطالب بیان کر لیتی تھی اور اب اس نے اردو میں بھی مُمل خاں کی طرح کے سوال پوچھنے شروع کر دیئے تھے۔ ان دنوں الیستھر میونک یونیورسٹی میں خطِ میخی پر ایک مقالہ لکھ رہی تھی اور یہ اس کی تکمیل کا آخری سال تھا۔ تصویر کشی اس کا ایک ہی مشغلہ تھا اور وہ

خالی اوقات میں جہاز پر بھی خاکے بنا بنا کر اپنی فائل میں ٹانکے جاتی تھی۔ ایک دن جب اختر نے اسے بتایا کہ وہ قریباً سال بھر تک جوتے فروخت کرتا رہا ہے تو اس نے لپ اسٹک سے اخبار پر بے شمار جوتوں کی اشکال بنا کر اپنا خیال ظاہر کیا تھا کہ فراعنہ مصر اس قسم کے پاپوش پہنتے ہوں گے۔ جوتے پرانی وضع کے تھے اور ایک سے ایک کا انداز نہیں ملتا تھا۔

یہ پورٹ سعید پر پہنچنے سے ایک رات پہلے کا واقعہ ہے۔ اختر اور ایستھر ٹوپ ڈیک پر رسوں کے ڈھیر کے پاس بیٹھے تھے۔ چاند ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ سطح آب آئینے کی طرح ہموار تھی اور جہاز اپنی منزل کی جانب ہولے ہولے کھسکتا جا رہا تھا۔ اختر نے کہا۔

" ایستھر! یوں لگتا ہے جیسے عرصے سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور ایک دوسرے کے دل کی گہرائیوں سے واقف ہیں۔" اس نے ایستھر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔

" میرا جی چاہتا ہے کہ یہ سفر کبھی بھی ختم نہ ہو۔ یہ جہاز یوں ہی چلتا رہے اور اچانک کسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے یا اسے بحری قزاق لوٹ لیں اور ہمیں حلقہ بگوش بنا کر عمر بھر کیلئے اپنی چاکری میں لے لیں۔ لیکن مجھے معلوم ہے یوں نہ ہو سکے گا۔ آخر ایک دن یہ جہاز اپنی منزل پر پہنچ جائے گا تم میونک روانہ ہو جاؤ گی اور مجھے لندن جانا پڑے گا ــــ ایسے نہیں ہو سکتا ایستھر کہ میں بھی تمہارے ساتھ میونک چلا چلوں۔

ایستھر نے اپنا ہاتھ کھینچ کر کہا: "نہیں! میں نہیں چاہتی کہ تم سکول سے بھاگ جانے والے بچوں کی طرح میرے ساتھ میونک چلے آؤ اور اپنی زندگی پنسلین بنانے والے کاریگر کی طرح گذار دو۔ میری تمنا ہے کہ تم اپنے امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کرو۔ میں تمہیں مبارکباد کا تار بھیجوں اور تم اپنے وطن واپس پہنچ کر مجھے اسی طرح بھلا دو۔ جیسے اپنی زندگی میں تم نے اور بہت سی لڑکیوں کو بھلا دیا ہے۔" اس نے اختر کے قریب سرکتے ہوئے کہا۔

" مجھے اپنی زندگی میں کبھی بھی ڈر محسوس نہیں ہوا، لیکن اس وقت میں اپنے آپ کو

خوفزدہ اور پریشان سی پا رہی ہوں۔ مجھے ایسے لگ رہا ہے کہ تم میری کمزوری ہوتے جا رہے ہو اور میں نہیں چاہتی کہ ایک آدمی میری کمزوری بن جائے۔ ایک اجنبی کی خاطر میرے اصول پاش پاش ہو کر رہ جائیں اور میری انفرادیت ایک ناواقف کے سامنے چکنا چور ہو جائے۔ میں نہ تمہیں اپنے ساتھ میونک لے جاؤں گی اور نہ ہی وہاں سے بلاوا بھیجوں گی اور اگر فرض کرو میں تمہیں وہاں سے بلاوا بھیج بھی دوں تو تم ہرگز نہ آنا۔ بولو میرے ساتھ وعدہ کرتے ہو؟"

اختر نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور نفی میں سر ہلا کر کہا۔ "مجھے یہ وعدہ منظور نہیں لیکن تمہیں اس قدر یقین دلاتا ہوں کہ اگر تم نے مجھے نہ بلایا تو میں ہرگز نہ آؤں گا نہ ہی تمہیں خط لکھوں گا اور نہ ہی آئندہ کبھی ملنے کی کوشش کروں گا۔"

ایستھر نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "ہندوستان جانیوالے جہاز میں داخل ہوتے وقت میرے قدم ڈگمگاتے تھے۔ میری روح لرز رہی تھی اور میں کچھ سہم سی گئی تھی۔ میری تمہاری ملاقات حادثہ نہیں۔ یہ ستاروں کے کھیل ہیں اور میں تقدیر کی بڑی معتقد ہوں۔"

اختر نے ایستھر کو بازوؤں میں لے کر اس کی سیاہ آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور ایستھر رک رک کر پوچھنے لگی۔ "اختر تم مرو گے تو نہیں؟ تم زندہ رہو گے نا اختر، ہاں تم زندہ بھی رہو گے۔ تمہیں کوئی مار نہ سکے گا۔ تمہاری ٹوٹی ہوئی لائف لائن بھی تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔ تم زندہ رہو گے اور اپنے وطن پہنچ جاؤ گے۔ وائیلڈ لینڈ چلے جاؤ گے۔ تم مرنا مت اختر۔ اور اگر کوئی تمہیں مارنا بھی چاہے تو بھی مت مرنا! مجھے زندگی بڑی اچھی لگتی ہے مجھے زندگی سے بڑا پیار ہے۔"

اختر نے اس کے فراخ ماتھے اور ابریشمی بالوں کو چومتے ہوئے کہا۔ "کیسی باتیں کرتی ہو۔ ایسے موقع پر یوں کہا کرتے ہیں کیا؟"

اگلی صبح جب اختر اس کے کیبن میں داخل ہوا تو وہ برتھ پر اوندھے منہ لیٹی ہوئی تھی۔ اختر کے قدم اندر رکھتے ہی وہ آنکھیں ملتی اٹھ بیٹھی اور اسے دیکھے بغیر بولی۔ "اختر!"

اختر نے پوچھا۔ "تم نے مجھے دیکھے بغیر کیسے اندازہ لگا لیا کہ کیبن میں میں ہی داخل

ہوا ہوں؟

ایستھر نے کہا: "پتہ نہیں۔ ایک نامعلوم حس مجھے فوراً بتا دیتی ہے کہ کمرے میں کون داخل ہوا ہے اور جوں ہی کوئی کمرے میں داخل ہوتا ہے میری آنکھ فوراً کھل جاتی ہے"۔

اختر نے کہا: "ایسی اولیائی کی باتیں کبھی ہم بھی کیا کرتے تھے لیکن اب سیانے ہو گئے ہیں اور ایسے دعوے ترک کر دیئے ہیں"۔

"دعوے نہیں"۔ ایستھر نے مسکرا کر کہا: "یہ حقیقت ہے کبھی آزما دیکھنا"۔

اختر نے کہا: "ایسی باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ چلو تھوڑی دیر سموکنگ روم میں چل کر بیٹھیں۔"

ایستھر نے اس بات کا جواب دیئے بغیر اختر کا ہاتھ تھام کر کہا: "میں تمہارا تھوڑا سا خون چکھ سکتی ہوں؟"

"تھوڑا سا!" اختر نے ہنس کر جواب دیا: "تم چاہے میرا سارا خون پی لو"۔

ایستھر نے اس کی کلائی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور جب اختر اپنے پتلون کی بائیں جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالنے لگا تو اس نے اختر کی جلد کو زور سے کاٹ کھایا۔ خون کی ایک سست رو دھار جلد پر پھیلی اور ایستھر نے اس لکیر کو اپنی کھردری زبان سے چاٹ کر کہا: "بالکل میرے خون کا مزہ ہے۔ ویسی ہی خوشبو ہے۔ وہی رنگ ہے"۔

اختر نے زخم دیکھتے ہوئے کہا: "میں تو سمجھا تھا تم مذاق کر رہی ہو۔ لیکن تم نے تو سچ مچ کاٹ کھایا، یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

ایستھر نے اٹھ کر اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے پٹی اور دوائی کی شیشی نکالتے ہوئے کہا: "مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔ تمہیں ہی کچھ ہو گیا ہے۔ آخر تم اس جہاز پر سوار ہی کیوں ہوئے؟" پھر اس نے اختر کی کلائی کے گرد آہستہ آہستہ پٹی لپیٹتے ہوئے کہا: "تمہارا خون بالکل میرے جیسا ہے اور یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ نہایت ہی خطرناک بات — جس طرح اب میں محسوس کر رہی ہوں کہ مجھے اپنے وطن سے باہر نکلنا نہیں چاہیے تھا تمہیں بھی آہستہ آہستہ احساس

ہونے لگے گا کہ ہندوستان چھوڑ کر تم نے غلطی کی ۔ ہم جیسے انسانوں کو سمندر کا سفر راس نہیں آتا ہے ۔ مجھے تو اس نے تکلیف میں ڈال ہی دیا ہے ۔ تم بھی عنقریب کرب میں مبتلا ہو جاؤ گے ۔"

اختر نے تنگ آکر کہا : "خدا کے لیے یہ نجومیوں والی کتھا چھوڑ دو ۔ ایسی باتیں سن کر میری طبیعت مالش کرنے لگتی ہے ۔ چلو باہر چل کر سمندر کا نظارہ کریں ۔"

جب وہ کیبن سے باہر نکلے تو عمل خاں نے بڑے مغربی انداز میں گڈ مارننگ کہا اور اپنے لہجے کو سنوارتے ہوئے الیستھر سے پوچھا : "وہاٹ از دا ٹائم بائی یور واچ ؟"

الیستھر نے ٹائم بتایا تو عمل خاں نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈال کر ذرا سا مسکرایا ۔ جھک کر رکوع میں چلا گیا اور تھینک یو کہہ کر آگے چل دیا ۔

کونٹی راسو پورٹ سعید پر قیام کرنے کے بعد روانہ ہو چکا تھا اور اب پھر اسی طرح ڈولتا ہوا جنوا کی جانب بڑھ رہا تھا ۔ پورٹ سعید پر اختر اور الیستھر نے کسی مقام کی سیر نہیں کی ۔ وہ سارا دن بندرگاہ پر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بلا مقصد ادھر ادھر گھومتے رہے ۔ اپنے گھر والوں کو چٹھیاں لکھیں ۔ ساحل کے کنارے رنگ برنگی چھتریوں کے نیچے بیٹھ کر چائے پی اور شام کو سمندر کی چڑھتی ـــــ اترتی لہروں کے بیچ کھڑے ہو کر بیئر پیتے اور خالی بوتلیں دور دور تک سمندر میں پھینکتے رہے اور اب وہ اسی جہاز میں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اسی سمندر پر آگے بڑھ رہے تھے اور انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ پورٹ سعید کبھی ان کی راہ میں آئی ہی نہ تھی ۔

شموکا نے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلفی سے پیش آتے دیکھ کر اختر سے بول چال ترک کر دی تھی ۔ مسٹر راؤ اور ان کی بیوی دونوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے اور جب کبھی الیستھر اختر سے ملنے ان کے کیبن میں آتی تو وہ سیدھے منہ اس سے بات بھی نہ کرتے ۔

اس رات جب ڈانس ختم ہوئے ایک گھنٹہ بیت گیا ۔ مسافر اپنے اپنے بسیروں میں دبک کر سو گئے اور باورچی خانے سے برتنوں کے بجنے کی آوازیں آنی بند ہو گئیں تو اختر یہ جانتے ہوئے بھی کہ رات کے وقت کسی خاتون کے کیبن میں جانا جہازی قواعد کی خلاف ورزی ہے

دبے پاؤں ایستھر کے کیبن پر چلا گیا۔ اس نے دروازے کو انگلی سے بجائے بغیر آہستہ سے دھکیلا۔ پٹ کھل گیا اور ایستھر شب خوابی کے لباس میں آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اختر کا نام لے کر ہولے سے سرگوشی کی اور اپنے بازو آگے پھیلا دیئے۔ اختر اس کے ساتھ بستر پر بیٹھ گیا اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر تھپکنے لگا۔ ایستھر اس کی گود میں سمٹ کر ہولے ہولے کراہ رہی تھی: "تم یہاں کیوں چلے آئے اختر۔ تمہیں معلوم نہیں کہ رات کو کسی عورت کے کیبن میں نہیں جاتے۔ اگر کیپٹن کو پتہ چل گیا تو آفت آجائے گی۔ تم سے باز پرس ہوگی۔ سارے جہاز پر تشہیر ہو جائے گی اور میں مر جاؤں گی تم کیوں آئے اختر! بتاؤ نا اس وقت کیوں آئے؟"

اختر نے اس کے کان کی لو کو ہونٹوں میں پکڑ رکھا تھا۔ ایستھر کی باتوں کا جواب دینے کی بجائے اس نے ہونٹوں پر دانتوں کا دباؤ دے کر نرم گوشت کو زور سے دبا دیا۔

ایستھر نے کہا "جاؤ اختر۔ خدا کے لیے چلے جاؤ۔ میرے ذہن میں قدموں کی صدائیں گونج رہی ہیں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے دروازے کے قریب سے گھڑ سوار دستے گذر رہے ہیں اور وہ تمہیں اپنے ٹاپوں کے نیچے کچل دیں گے وہ تمہیں مار دیں گے اور تمہاری روح مینونک کے باغوں میں بھٹکتی رہے گی۔ تم ہر جگہ ہر موڑ پر میرا پیچھا کرتے رہو گے۔ مجھے ڈراتے رہو گے —— میں بھاگنے کی کوشش کروں گی اور مجھ سے بھاگا نہ جائے گا۔ میں مرنا چاہوں گی اور مجھے موت نہ آئے گی۔ وہ دیکھو: ایستھر نے تڑپ کر علیحدہ ہوتے ہوئے کہا۔ کسی نے دستک دی ہے اب وہ لوگ تمہیں پکڑ کر لے جائیں گے اور سامان اٹھانے والے جال میں لپیٹ کر سمندر میں پھینک دیں گے" اختر نے اس کی باتوں کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور اسی طرح اس کا سر تھپکتا رہا۔

وصل کے دن لمحوں کی صورت میں اڑتے رہے۔ نیپلز آیا اور گذر گیا جہاز نے دن بھر یہاں قیام کیا اور پھر جنیوا کی جانب چل پڑا۔ جوں جوں منزل قریب آ رہی تھی اختر خاموش

ہوتا جا رہا تھا۔ وہ گھنٹوں ریلنگ کا سہارا لے کر سمندر کا نظارہ کرتا رہتا۔ ایستھر اس کے پاس کرسی ڈال کر گود میں کتاب رکھے اس کا منہ تکتی رہتی اور ان کے قریب سے گذرنے والے مسافر ان دونوں کو بڑے غور سے دیکھا کرتے۔ ایستھر نے کبھی بھی اختر کو اپنی طرف متوجہ نہ کیا وہ اسے ہر حال میں دیکھ کر خوش تھی اور اس کو کسی صورت میں بھی اپنے ڈھب پر لانے کی متمنی نہ تھی۔ اگر وہ چپ ہوتا تو اسے اس کی خاموشی اچھی لگتی اور اگر وہ باتیں کرنے کی ترنگ میں ہوتا تو ایستھر اسے بلا لوٹ کے سب کچھ کہہ گزرنے دیتی۔ منزل سے قربت کا احساس اور ایک دوسرے سے بچھڑ جانے کا غم دونوں کو کھائے جاتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے لگے تھے۔ کچھ کہے بغیر کسی کی سنے بنا اور ایک دوسرے کو دیکھے بغیر دونوں دل ہی دل میں اس خاموشی کا مطلب اچھی طرح سے سمجھتے تھے۔ دونوں اپنے اپنے دل کے ساتھ دوسرے کی واردات سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے اور انہوں نے بات کرنے کی کوشش شاید اس لیے ترک کر دی تھی کہ الفاظ ان کی کیفیات کو اس حسن اور خوبی سے ادا نہ کر سکیں گے جیسے کہ خاموشی کر رہی تھی۔ اگر ان کے درمیان کوئی بات ہوتی بھی تو وہ یا تو موسم کے بارے میں ہوتی یا روکھی پھیکی سیاسیات کے بارے میں اور ایسی باتیں کرتے ہوئے انہیں ایک دوسرے کے دل کا اچھی طرح علم ہوتا کہ دراصل وہ کوئی اور بات کہنی چاہتا ہے۔

صبح سات بجے کونٹی راسو جنوا پہنچ گیا۔ اختر کی گاڑی ساڑھے گیارہ بجے پیرس کے لیے روانہ ہوتی تھی اور ایستھر کو شام کے تین بجے سوار ہونا تھا۔ جنوا میں اس مختصر سے قیام کیلئے انہیں سیوائے میں ایک کمرہ مل گیا۔ دونوں کا سامان ان کی ایجنسیوں کی معرفت سٹیشن پر پہنچ گیا تھا اور اب وہ اپنے کمرے میں اسی طرح چپ چاپ بیٹھے تھے۔ انہوں نے ایک ساتھ چائے پی۔ وقت گزارنے کے لیے اپنے بیگ الٹ کر انہیں صاف کیا۔ دیر تک قرینے سے ان میں چیزیں رکھتے رہے اور پھر اپنی اپنی جگہ پر اسی طرح خاموشی سے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایستھر اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی اور اختر نے اس کی کھلی ہوئی کتاب کو اپنی گود میں ڈال لیا۔

اس نے ایک آدھ سطر پڑھنے کی کوشش بھی کی لیکن مردہ چیونٹیوں ایسے حروف اس سے اٹھ نہ سکے۔ اور وہ یوں ہی ورق الٹنے لگا۔ اس میں چند بے معنی خاکے سے تھے۔ لمبی لمبی رقموں والی جدولیں تھیں اور ہر باب کے آخر میں ٹیڑھے حروف کا ایک مختصر سا گوشوارہ تھا۔ ایسِتھر نے اوراق پلٹنے کی صدا سن کر پیچھے مڑ کر دیکھا اور آہستہ سے کھنکار کر کہا۔ "تم نے میرا صفحہ گم کر دیا۔"

"ہاں" اختر نے دیکھے بغیر کہا اور کتاب بند کر کے میز پر رکھ دی۔ ایسِتھر ہولے ہولے قدم اٹھاتی پھر اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی اور کتاب اٹھا کر صفحہ تلاش کرنے لگی۔

جب ویٹر نے اندر داخل ہو کر اختر کو بتایا کہ اس کی ٹیکسی آ گئی ہے۔ تو وہ اسے جواب دیئے بغیر جمائی لینے کی کوشش کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ بیگ سے اپنا پاسپورٹ نکال کر اس نے کوٹ کی جیب میں ڈالا اور بیگ کو تالہ لگاتے ہوئے اس نے کنکھیوں سے ایسِتھر کی طرف دیکھا جو ذرا سی آہٹ کیۓ بنا اپنی جگہ پر اُٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اختر کو اپنی طرف اس طرح دیکھتے ہوئے پا کر وہ دوڑ کر اس سے چمٹ گئی اور کہنے لگی۔

"میں تمہیں الوداع کہنے سٹیشن نہیں جا رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے یہ انتہائی بدتہذیبی ہے لیکن میں تمہیں گاڑی میں کسی اور سمت جاتے دیکھنا برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں مجھ سے وہاں ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے جس کے لیے بعد میں تمہیں پچھتانا پڑے — بولو! مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟"

"ناراض!" اختر نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "میں تم سے کبھی بھی ناراض نہیں ہو سکتا۔ مجھے اپنے اور تمہارے درمیان ناراضگی کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ لیکن تم ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو۔ بتاؤ مجھے خط لکھا کرو گی نا؟"

"ضرور لکھوں گی۔" ایسِتھر نے ضرور پر زور دے کر کہا۔ "جب تک تم لندن میں رہو گے میں تمہیں اکثر لکھتی رہوں گی۔"

"اور جب میں ہندوستان چلا جاؤں گا تو؟" اختر نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"پھر نہیں۔" ایستھر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہرگز نہیں —— پھر تو میں تمہارا کسی سے ذکر بھی نہ کروں گی۔"

"وہ کیوں؟" اختر نے پوچھا۔

ایستھر نے کہا: "مجھے اس کی وجہ معلوم نہیں اور شاید میں عمر بھر اس کا سبب معلوم نہ کر سکوں۔"

اختر نے اسے الوداعی بوسہ دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ ایستھر پھر دریچے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ جوں ہی پرانی وضع کی ٹیکسی گیئر بدلتی اس دریچے کے نیچے سے گزری تو اختر نے اپنی سیٹ پر جھک کر اوپر کھڑکی کی طرف دیکھا اور ہاتھ لہرایا۔ ایستھر نے کوئی جواب نہ دیا اور جب ٹیکسی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو اس نے سفید ڈوری کھینچ کر سبز جھلملیوں کو بند کر دیا اور پلنگ پر گر گئی۔

دو تین دن وائی ایم سی۔ اے میں گذارنے کے بعد اختر کو آئی۔ ایس۔ یو ہوسٹل میں کمرہ مل گیا۔ یہ شام اختر کے لیے بڑی کٹھن تھی۔ اسے سعید کی بھولی بھالی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اس کے موتیوں جیسے آنسوؤں کا تانتا دکھائی دے رہا تھا اور وہ کچھ کہے بنا اختر کے بازو سے لگی سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایستھر کا چہرہ اختر کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ وہ بے حد مغموم تھی لیکن اس کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ جھڑ سکا تھا۔ اس کی آنکھوں کے پیچھے گہری جھیلیں ساگر کی طرح بھری تھیں۔ لیکن وہ ضبط کیے بیٹھی تھی اور اس کا یہی ضبط اختر کو مارے ڈالتا تھا۔ سانس لیتے ہوئے اختر کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ارادی طور پر ہوا اندر باہر کھینچ رہا ہے اور اس کے جسم کے اندر کچھ بھی نہیں۔ خالی ڈھول کی طرح اس کا پنجر اندر سے بالکل کھوکھلا ہو رہا تھا۔ ایک آدھ مرتبہ کھانس کر اس نے اپنے ڈھانچے کو چھوٹے چھوٹے جھٹکے دیئے۔ لیکن اسے اپنے ٹھوس ہونے کا یقین نہ آیا۔ اس کا کوئی خاص عضو درد میں مبتلا نہیں تھا۔ اس پر بھی اسے بڑی تکلیف ہو رہی تھی اور وہ بغیر آواز نکالے کراہ رہا تھا۔ سیویاں بٹنے والی مشین کی لٹھ اندر ہی اندر بل کھا رہی تھی اور اختر کی جان نکلی جاتی تھی۔ اس نے ٹوپی اٹھائی اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ گوج سٹریٹ سے ٹیوب میں سوار ہوتے وقت اس نے سوچا کہ چلو سٹرینڈ چل کر ضروری اشیاء خریدتے ہیں اور واپسی پر گیرک ہوٹل میں تلخ اوقات کو بتانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سٹرینڈ پہنچ کر اس نے کسی دکان میں داخل ہونے کی بجائے

بڑے بڑے شوکیس اور رنگ برنگے پوسٹروں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ ہر شوکیس میں بیسیوں چیزیں ایسی دکھائی دیتیں جنہیں اختر نے اس سے پہلے کہیں نہ دیکھا تھا۔ اور جن کے استعمال سے وہ قطعی بیگانہ تھا۔ سڑکوں پر بسوں اور ٹیکسیوں کے ہارن تانیں اڑا رہے تھے اور وہ ایک دوسرے کے پیچھے دیوانے کتوں کی طرح دوڑ رہی تھیں۔ پورٹر بھاری بھاری بکس اٹھائے دوکانوں کے اندر آ جا رہے تھے اور دور دور تک سارا ہجوم طلسماتی پتلیوں کی طرح حرکت کر رہا تھا۔ اختر کھسیانے بچے کی طرح نیلی پیلی تصویروں والے اشتہار دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کی ساری توجہ اس گہما گہمی پر مرکوز تھی۔ جس سے اس نے اپنی نگاہیں جان بوجھ کر پھیر رکھی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہر تیز رو اس کے کندھے سے کندھا بھڑا کر معاف کیجئے گا۔ کہتا ہوا آگے نکل جاتا۔ اختر نے ایک دکان کے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر غور سے ان سب لوگوں کا جائزہ لیا جو آگ بجھانے کی مہم پر جاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اسے اپنے دیس کی بارونق انار کلی یاد آ گئی۔ جہاں لوگ ایک دوسرے سے باتیں کرتے دوکانوں میں جھانکتے اور سلام دعا کہتے بڑے آرام سے ہنستے کھیلتے گزر جاتے ہیں اور کسی کو نہیں کھلتا۔ اسے یہ نہ ختم ہونے والا ہجوم لوگوں کے اٹوٹ گروہ اور موٹروں کا لامتناہی سلسلہ ذرا بھی اچھا نہ لگا اور وہ گھبرا کر ایک دکان میں داخل ہو گیا۔ یوں تو سب چیزوں کے انتخاب میں اسے کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن پیڈ منتخب کرتے وقت تو اس نے حد ہی کر دی۔ موجودہ طرز کے پیڈوں پر نگاہ ڈالے بغیر اس نے سیلزمین کو بتایا کہ وہ پرانی وضع کا پیڈ نسبتاً زیادہ پسند کرتا ہے جس سے لائبریری کی سی بو آیا کرتی ہے اور جس کا کاغذ خستہ تو نہیں ہوتا لیکن رنگ سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ بہت پرانا اور گداز ہے۔ سیلزمین نے اسے پرانی قسم کے بہت سے پیڈ دکھائے لیکن ان میں سے ایک بھی اسے پسند نہ آیا۔ دراصل وہ ایستھر کو خطِ میخی کی ریسرچ کی نسبت سے بھوج پتر پر خط لکھنا چاہتا تھا اور بھوج پتر کی اسے انگریزی نہیں آتی تھی۔ پیڈ خریدے بنا جب وہ اپنی چیزوں کا پیکٹ بغل میں داب کر باہر نکلا تو اندھیرا چھا چکا تھا اور گیس کی روشنی کے گرد دھند کی شبنمی

چادریں لہرا رہی تھیں۔ قریبی ریستوران میں جا کر اس نے کافی کا آرڈر دیا اور پیکٹ کی ڈوری پیٹتے کھولتے ہوئے خط کا مضمون سوچنے لگا اور جب خط کا آخری فقرہ بھی اس کے ذہن میں تشکیل پا گیا تو اس نے دستخط کر کے کافی کا ایک گھونٹ بھرا اور اس کے سارے جسم میں برفاب کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ویٹر کو نئے سرے سے آرڈر دے کر اختر نے اپنے دستخطوں کے نیچے پی ایس کا سہارا لے کر پھر پیرڑں کے پیرے ڈھالنے شروع کر دیئے۔ اس خطوط نویسی اور کافی نوشی نے اتنا وقت لیا کہ گیرک میں دوسرے شو کا پہلا سین بھی ختم ہو گیا۔

کمرے میں پہنچ کر اختر ابھی پیکٹ کھول ہی رہا تھا کہ اس کے پڑوسی نے دھیمے سروں میں :-

ع نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں

گانا شروع کر دیا۔ پیکٹ کی ڈوری کھلتے کھلتے وہیں رہ گئی اور اختر اپنی کرسی میں دراز ہو گیا اور جب وہ قافیے پر پہنچتا تو لے میں ایسی مرکیاں ڈالتا کہ شعر نئے نئے مطالب بیان کرنے لگتا اور

ع دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

تو اس نے اتنی مرتبہ گایا کہ سجا سجایا کمرہ ویران ہو گیا۔ جھکڑ چلنے لگے اور خزاں رسیدہ درختوں کی ننگی شاخیں سیٹیاں سی بجانے لگیں۔ وہ گا رہا تھا اور اختر کرسی کے بازوؤں کو مضبوطی سے پکڑے ڈھنڈار آنکھیں کھولے اس کی تانیں سن رہا تھا اور اس کا سگریٹ راکھ دان میں سلگ سلگ کر ختم ہو چکا تھا۔ مقطع پر پہنچ کر گانے والا قریباً قریباً گنگنانے لگا اور درد کی شدت کو تلخی سے دبا کر اپنی دھن میں گائے جاتا تھا ؎

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریٔ یاران وطن یاد نہیں

اس نے گاتے گاتے "یاد نہیں" کو ایک بار تحت اللفظ میں ادا کر کے اختر کو تڑپا دیا اور وہ چپکے سے اٹھ کر اس کے دروازے پر پہنچ گیا۔ گیت ختم ہو رہا تھا۔ شروع کے بول ڈوبے جا رہے تھے اور گانے والے نے گنگنانا شروع کر دیا تھا۔ اختر نے دروازے

کو انگلی سے بجایا: "چلے آؤ" - اندر سے آواز آئی اور اختر دروازہ کھول کر مسکراتا اندر آگیا۔ ایک ثانیے کے لیے دونوں خاموش رہے۔ ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اختر نے کہا۔

"میرا نام اختر ہے۔ لاہور سے آیا ہوں اور آپ کا پڑوسی ہوں"۔

"میرا نام شفیع ہے" اس نے پنجابی میں جواب دیا "اور میں راولپنڈی کا رہنے والا ہوں"۔

"تو آپ راجہ شفیع ہیں" اختر نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا "پنڈی کا تو ہر شخص راجہ ہوتا ہے"۔

"جی" شفیع نے سنجیدگی سے کہا "لیکن آپ کب تشریف لائے اور کب سے میرے پڑوسی ہیں؟"

اختر نے کہا: "مجھے لندن آئے آج چوتھا دن ہے اور ہوسٹل میں آج شام ہی کو پہنچا ہوں"۔

شفیع نے کہا: "آپ کے کمرے میں پہلے ایک مدراسی رہتا تھا۔ میری اس سے معمولی علیک سلیک بھی چونکہ وہ ہر وقت کتابوں میں کھویا رہتا تھا اس لیے میں نے اسے کبھی زحمت نہیں دی تھی۔ اچھا ہی ہوا کہ آپ آ گئے"۔

اختر نے ہنس کر کہا: "آپ کو یہ اندازہ کیسے ہوا کہ میں کتابی کیڑا نہیں ہوں"۔

"یہ تو آپ کے بشرے سے ظاہر ہے" شفیع نے اسے سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا "آدمی چہرے مہرے سے جھٹ پہچانا جاتا ہے"۔

اختر نے کہا: "میں آپ کو اپنے سرٹیفکیٹ دکھا کر یقین دلا سکتا ہوں کہ میں نے اپنی عمر ایک محنتی طالب علم کی طرح گذاری ہے اور اب یہاں بھی اسی غرض سے آیا ہوں"۔

"میں بھی اسی غرض سے یہاں آیا تھا" شفیع نے ایک لمبا کش لیا "لیکن لندن کی زندگی آدمی کو سست بنا دیتی ہے اور اب میں خدا کے فضل سے اچھے خاصے کاہل طالب علموں میں شمار

ہوتا ہوں۔"

اختر ہنسنے لگا اور میز سے ایک کتاب اٹھاتے ہوئے اس نے پوچھا "آپ کو یہاں رہتے ہوئے کتنا عرصہ گذر چکا ہے۔"

"پرسوں دو سال پورے ہو جائیں گے۔" شفیع نے اطمینان سے جواب دیا۔ "لیکن اس مرتبہ یہ آخری امتحان ہے اور اکتوبر میں واپس ہندوستان چلا جاؤں گا۔"

اختر نے کہا۔ "تو آپ بھی آئی۔سی۔ایس کا امتحان دے رہے ہیں؟"

"دے تو رہا ہوں۔" شفیع نے جواب دیا۔ "لیکن پاس ہونے کی امید کم ہی ہے۔ جب دلّی میں رہ کر یہ امتحان پاس نہ ہو سکا لندن ایسے دلچسپ شہر میں بھلا کب ہو سکے گا۔ پھر بھی کوشش کی جا رہی ہے۔ سنتے ہیں حرکت میں برکت ہوتی ہے۔"

"ہوتی ہوگی۔" اختر نے بے پروائی سے کہا۔ "ہمیں تو ہمیشہ بغیر حرکت کے ہی برکت ملتی رہی ہے۔"

شفیع نے کہا۔ "پھر آپ کا سلسلہ مرشدوں سے ملتا ہوگا۔"

اختر کو ہنسی آگئی اور وہ اس کرب انگیز شام کے بارے میں بالکل بھول گیا جس نے اس کے کلیجے میں اپنے ٹیڑھے پنجے گاڑ دیئے تھے۔

شفیع اور اختر کی دوستی مہینوں کی منزلیں دنوں میں طے کر گئی اور وہ جلد ہی ایک دوسرے کو پنجابی کی موٹی گالی دے کر مخاطب کرنے لگے۔ ایستھر کا خط آیا تھا کہ وہ بخیریت تام میونک پہنچ گئی ہے اور راستے میں کوئی غیر معمولی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ سعیدہ نے لکھا تھا کہ وہ اختر کو برابر اسی طرح یاد کر رہی ہے اور اس کے لیے ایک اونی ٹی کوزی بنا رہی ہے جس کے ایک طرف رنگ برنگی تیتری کی تصویر ہے اور دوسری جانب مٹیالے رنگ کا ایک پھول بنایا جا رہا ہے۔ اباجی کی چٹھی آئی تھی کہ بیٹا ہر گھڑی علم کے لیے کوشاں رہو اور اگر اس کی تلاش میں تمہیں چین کا سفر بھی اختیار کرنا پڑے تو ہرگز ہرگز گریز نہ کرنا۔ یہی وہ چیز ہے جس سے

انسان دیگر جانداروں سے ممتاز ہوتا ہے اور خاندان میں نام پیدا کرتا ہے۔ آخر میں انہوں نے لکھا تھا کہ عزیزم تمہارے ایک دوست خلیل صاحب تشریف لائے تھے انہوں نے مجھ سے پچاس روپے کی رقم کا مطالبہ کیا جو تم نے ان سے کسی زمانے میں ادھار لی تھی۔ میں نے رقم انہیں دے کر رسید لے لی ہے اور اس کی نقل تمہیں بھیج رہا ہوں ۔۔۔ رسید کی نقل اباجی کی لکھائی میں نہیں تھی بلکہ منشی نے اسے روکڑ پر لکھنے والی روشنائی سے رقم کیا تھا۔ شفیع نے ایستھر اور سعیدہ کے خط پڑھے لیکن اباجی کا خط پڑھنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یار میرے پاس بھی ایسے بہت سے خط آیا کرتے ہیں لیکن میں نے انہیں کبھی نہیں پڑھا۔ بند کے بند ٹرنک میں ڈالے جاتا ہوں۔ گھر پہنچ کر کھولوں گا۔

"اور وہ خط تمہارے والد کے ہوتے ہیں؟" اختر نے پوچھا۔

"ہاں انہی کے ہوتے ہیں۔" شفیع نے کہا۔ "قبلہ گاہی خواہ مخواہ تکلف سے کام لیتے ہیں ان سے کوئی پوچھے کہ راجہ صاحب آپ کو اس کے سوا کوئی اور مشغلہ ہاتھ نہیں آتا؟"

"مشغلہ!" اختر نے حیرانی سے کہا۔ "اولاد کی نگہداشت تو والدین کا فرض ہے اور ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے والدین خطوں کے ذریعے ہی اپنے بچوں کی نگہداشت کر سکتے ہیں۔"

شفیع نے کہا۔ "میں اولاد اور اس کی نگہداشت کا قائل نہیں۔ ہمارے وجود ہمارے والدین کی مالش گری کا نتیجہ ہیں۔ انہیں معلوم بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے شفیع یا اختر پیدا ہو جائے گا۔ وہ فطرت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر محو اختلاط رہتے ہیں اور ایک دن اندھی اور بہری قدرت ان کی گود میں شفیع یا اختر ڈال دیتی ہے اور وہ اس بچے کو اپنی ملک تصور کر کے اسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے لگتے ہیں۔ بچے کا یہ قصور ہوتا ہے کہ وہ ان کے یہاں پیدا ہو جاتا ہے اور والدین کو یہ مان ہوتا ہے کہ یہ ان کی تخلیق ہے۔ جب تک وہ ان کی نگاہوں کے سامنے رہتا ہے اسے طور بے طور نصیحتیں ہوتی رہتی ہیں اور جب وہ دور چلا جاتا ہے تو لمبے لمبے خطوں کے ذریعے ہر گھڑی اسے یاد دلاتے رہتے ہیں کہ دیکھنا اپنے خالق کو نہ بھول جانا ۔۔۔ آج تک شاید ہی کسی باپ نے سوچا ہو گا کہ بچے فطرت کے تقاضوں کی اولاد ہیں۔"

"بس بس"۔ اختر نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "خدا کے لیے جانے دو۔ تم اپنے والد کے خط نہیں کھولتے نہ سہی لیکن مجھے اس طرح بور نہ کرو۔ میں تو تمہارے فلسفے کا بال باندھا غلام ہوں۔"

شفیع نے اختر کو جہاں سارے ہندوستانی اور انگریز دوستوں سے متعارف کرایا۔ وہاں وہ اسے اپنی انسٹیٹیوٹ بھی لے گیا جہاں آئی۔سی۔ایس کے بہت سے امیدوار تعلیم پاتے تھے۔ اختر کو یہ درسگاہ پسند نہ آئی۔ اور اس نے وہاں داخلہ لینے سے انکار کر دیا۔ وہ لندن میں چند مہینوں کی زندگی کو آزادی سے گزارنا چاہتا تھا۔ ایسی زندگی جس میں کسی قسم کی پابندی نہ ہو۔ روک ٹوک نہ ہو اور کوئی احتساب کرنے والا نہ ہو۔ لندن پہنچتے ہی اس نے اپنے ذہن میں یہ ناد دستور العمل پھر وضع کر لیا تھا کہ امتحان سے ایک ماہ پیشتر وہ اپنے آپ کو کمرے میں مقید کر کے روزانہ بیس گھنٹے مطالعہ کیا کرے گا اور کوئی کتاب حرف بحرف پڑھنے سے دریغ نہ کرے گا جو اس کے امتحان سے دور کا بھی واسطہ رکھتی ہو گی۔ کالج میں بھی اس کا یہی طریقہ کار رہا تھا۔ تیئس مہینے وہ ہنس کھیل کر اور سینماؤں میں راتیں بتا کر ضائع کیا کرتا اور آخری مہینے نئی کتابیں خرید کر چوبارے میں اپنے آپ کو مقفل کر لیا کرتا اور امتحان کے دن ہی گھر سے پاؤں باہر نکالتا۔ یہاں پہنچ کر اس نے اتنی رعایت ضرور کی کہ ہر روز باقاعدگی سے ٹائمز کا مطالعہ شروع کر دیا اور شام کو مس مارگریٹ کے گھٹیا سے سکول میں جا کر ناچنے کی مشق کرنے لگا۔ دلی میں سول سروس کے پرچوں کا لندن کے پرچوں سے مقابلہ کر کے اختر کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ پاس ہو گا اور ضرور ہو گا اور ارضی و سماوی کوئی بھی طاقت اسے ڈپٹی کمشنر کے عہدے سے محروم نہ رکھ سکے گی۔ اس نے شفیع کو پرانے پرچے بڑے انہماک سے حل کرتے ہوئے دیکھ کر کئی مرتبہ کہا تھا کہ جن صحیفوں کی گتھیاں سلجھانے میں تم اپنی جان یوں ہلکان کرتے رہتے ہو میں انہیں بائیں ہاتھ سے حل کر سکتا ہوں اور شفیع کو اب اس کی باتوں پر یقین بھی آ چلا تھا کیونکہ وہ جس سوال کی طرف اشارہ کرتا اختر بلا تکلف اس پر ایک تقریر جھاڑ دیتا اور ٹھٹھا کرتا ہوا کمرے سے نکل جاتا۔

ایستھر کے خط برابر آ رہے تھے اور وہ میوزخ یونیورسٹی لائبریری سے تاریخ کی نایاب

کتابوں کے اہم باب ترجمہ کرکے اسے بھیجتی رہتی تھی۔ اختر نے اس کے نوٹس ٹانگنے کے لیے مراکو چمڑے کی ایک نہایت خوبصورت سی فائل خریدی تھی جس کی ضخامت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سعیدہ کی ٹی کوزی اسے مل گئی تھی اور اختر نے یارڈلے سینٹ کی ایک بڑی سی شیشی اس میں رکھ کر اپنے بکس میں محفوظ کر لیا تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ ہوسٹل سے نکل جاتا اور دن بھر پکاڈلی کی کوچہ گردی کرنے کے بعد شام گئے واپس آتا۔ شفیع اپنی کتابوں سے نگاہ اٹھا کر مسکرا کر اسے دیکھتا اور ایک آنکھ میچ کر پوچھتا "کیوں" اور اختر ہنس کر کہتا "بس دیکھتے جاؤ۔"

جین سے اختر کی ملاقات ایزاک والٹنز کی دکان کے باہر ہوئی۔ اس نے ایک پرچی پر کچھ لکھنے کے لیے اپنا پین کھولا اور اس کا کیپ ہاتھ سے چھوٹ کر پٹڑی کے پاس ایک ٹیکسی کے نیچے چلا گیا۔ اختر نے زمین پر گھٹنے ٹیک کر اس کا کیپ اٹھایا اور رومال سے صاف کر کے جین کو پیش کیا اور وہیں سے ان کی دوستی شروع ہو گئی۔ دونوں دکان میں داخل ہونے کے بجائے ایک قہوہ خانے میں جا کر قہوہ پینے لگے۔ جین نے بتایا کہ جس دوکان میں اختر چیزیں خریدنے کے لیے جانا چاہتا تھا وہ وہاں نوکری کی غرض سے آئی تھی۔ لیکن چونکہ پین کا کیپ گر جانے سے بدشگونی ہو گئی تھی۔ اس لیے اس نے مالک سے ملنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ جین چھریرے بدن کی کم عمر لڑکی تھی لیکن اس کے چہرے سے آزمودہ کاری ٹپکتی تھی اور اس کی آنکھوں میں حجاب نہیں تھا جو اس عمر کی لڑکیوں میں عموماً ہوا کرتا ہے۔ وہ بڑی بے تکلفی سے اختر کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔

اور ماں اور سوتیلے باپ کے رویے پر ایمانداری سے تنقید کیے جا رہی تھی۔ اختر نے یہ کہہ کر یہ باپ لوگ خواہ سگے ہوں یا سوتیلے ایسے ہی ہوتے ہیں جین کو رائے دی کہ اگر آج ڈومینین چل کر فلم دیکھا جائے اور اس کے بعد ہائیڈ پارک کی سیر ہو جائے تو کچھ برا نہ ہوگا۔ جین رضامند ہو گئی اور وہ ایک ٹیکسی لے کر ٹاٹنہم کورٹ روڈ روانہ ہو گئے۔ راستے میں اختر نے ہولے سے جین کا ہاتھ دبایا تو اس نے ذرا سی مزاحمت بھی نہ کی۔ اختر کا بازو اس کی کمر کے گرد حمائل ہو گیا اور جین نے

اپنا سراس کے کندھے پر رکھ دیا جس سے باسی سینٹ کی ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی۔ خشکی کی وجہ سے اس کے بال کڑا برڑے سے لگتے تھے۔ اور ان میں زندگی کی چمک ختم ہو چکی تھی۔ اختر نے اس کے کان پر جھکتے ہوئے پوچھا: "میں تمہیں اچھا لگا ہوں؟"

جین نے اس کو اپنے دونوں بانہوں میں جکڑ لیا اور آنکھیں اوپر اٹھا کر کہنے لگی۔

"بہت اچھے لگتے ہو ڈارلنگ۔ تمہاری ناک اور تمہارا ماتھا۔ مجھے یوں لگ رہا ہے۔ جیسے میں خواب میں کسی یونانی دیوتا کو دیکھ رہی ہوں۔ تم بے حد حسین ہو پیارے! کیا ہندوستان میں تمہارے جیسے اور نوجوان بھی ہیں؟"

اختر نے مسکرا کر اس کا پیار لے لیا اور کہا: "کیوں نہیں۔ ہمارے خاندان میں سبھی ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔"

"اسی لیے تو۔" جین نے گرفت کو مضبوط کرتے ہوئے کہا: "تمہیں یہ حسن ورثے میں ملا ہے۔"

اختر نے جواب دیئے بغیر اسے سیٹ سے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیا اور اس کی سفید گردن پر اپنے گرم گرم ہونٹ رکھ دیئے۔

جب وہ فلم دیکھ کر باہر نکلے تو ہائیڈ پارک جانے والی بس تیار تھی۔ اختر اسے کھانے کی دعوت دیئے بغیر ساتھ لے کر بس میں سوار ہو گیا

ماربل آرک کی جانب وہ درختوں کے ایک جھنڈ میں گھاس کے تختے پر ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔ جین نے کل شام سے کچھ نہیں کھایا تھا اور اس وقت وہ بوسوں سے اپنی بھوک مٹا رہی تھی۔ وہ بار بار اختر سے اس کی آنکھوں، اس کے بالوں، اس کی کشادہ پیشانی کی تعریف کر رہی تھی اور اختر اپنے خیال میں محاسن اینگلو انڈین لڑکی کو یاد کر رہا تھا جسے وہ اپنی دکان کے پچھواڑے جلترنگ سنانے لے گیا تھا۔ جین کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے سوچا کہ اصل اور نقل میں کتنا فرق ہے۔ یہ لڑکی چونکہ خالص انگریز ہے اس لیے گھر یلو بلی کی طرح کیا خرخر کر رہی ہے اور اس چھوکری کو چونکہ دیسی پیٹ ملی ہوئی تھی کیسے بھڑک گئی تھی۔ تھوڑی دیر

کے لیے اسے دیس اور دیسی لوگوں سے نفرت ہو گئی اور وہ جی ہی جی میں جین کو اور اس کے ہم وطنوں کو سراہنے لگا۔

ایک بجے کے قریب جب وہ شفیع کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے مسکرا کر فیلٹ کو کونے میں اڑا دیا اور اس کے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہنے لگا "زندہ باد۔"

شفیع نے ایک آنکھ میچ کر کہا۔ "زندہ باد کے بچے سعیدہ کو خط نہیں لکھا۔"

"کیوں؟" اختر کھسیانا ہو گیا۔

"اس کا خط آیا ہے۔"

"تمہیں؟"

"مجھے کیوں آتا سالے۔ تجھے آیا ہے۔"

"کیا لکھا ہے؟" اختر نے اشتیاق سے پوچھا۔

شفیع نے تکیے کے نیچے ہاتھ پھیر کر ایک کھلا لفافہ نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ اختر نے جلدی جلدی سارا خط پڑھا اور جب ختم کر چکا تو خط کو تہہ کر کے شرارت سے چوما اور کہا۔

"یار یہ لڑکیاں بھی بڑی بھولی بادشاہ ہوتی ہیں۔ سیدھی سادی اللہ لوک۔ پتہ نہیں انہیں ڈراؤنے خواب کیوں آنے شروع ہو جاتے ہیں — او پیارے ان کڑیوں چڑیوں سے تو دستانے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ گرم کے گرم اور ملائم کے ملائم۔"

شفیع آنکھ جھپکے بغیر اس کی باتیں سنتا گیا اور جب وہ چپ ہو گیا تو اس نے اختر کو ایک موٹی سی گالی دے کر کہا۔ "اگر اپنی خالاؤں کو ایسا سمجھتا ہے تو انہیں بتے کیوں بناتا پھرتا ہے۔ ایک کو وہاں لارا دے آیا۔ دوسری کو جہاز پر جھانسے دیتا رہا اور اب یہاں پتہ نہیں کتنی چڑیوں کی مانگ میں سیندور بھر کر پھونکیں مار مار کر اڑا تا رہے گا اور اس پر شرم نہیں آتی کمینے کو۔ دانت نکال رہا ہے۔"

اختر نے کہا۔ "ہنسی کی بات تو ہے ہی۔ ہنسوں نہ تو اور کیا کروں۔"

شفیع نے تلخ ہو کر کہا۔ "ادھا تجھ سے تو یہ بھوتھنی دالا لاکھ اچھا ہے ـــ بتا سعیدہ سے شادی کرنے کا وعدہ کر کے نہیں آیا؟"

"ہاں۔" اختر نے ڈٹ کر کہا۔

"اور ایستھر سے شادی کی درخواست نہیں کی؟" شفیع نے پوچھا۔

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔" اختر نے زور دے کر کہا۔ "خدا کی قسم ایسی تو کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔"

شفیع نے کہا۔ "اور یہاں بھی ہر ایک سے مٹھار مٹھار کر باتیں کر کے اسے اس قسم کا یقین نہیں دلائے گا۔"

"تو پھر۔" اختر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں ان کو کیا سمجھتا ہوں۔"

شفیع نے جل کر کہا۔ "مرحرامی! دیکھنا کتے کی موت مرے گا ـــ نہ تو پڑھتا ہے اور نہ بدمعاشی کرتا ہے۔ پتہ نہیں کیا جھک مارتا رہتا ہے۔"

اختر نے جھک کر شفیع کے گال کا چٹاخ سے چوما لیا اور کہا۔ "بس چاچا ناراض ہو گئے۔"

شفیع نے آہستہ سے جواب دیا۔ "ناراض نہیں یا جی۔ مجھے تو سعیدہ کا خیال آتا ہے۔"

اختر ہنس پڑا اور شفیع کو اپنے بازوؤں میں لے کر کہا۔ "کیسی باتیں کرتا ہے یار ـ وہ تو میری جان ہے۔"

صدیقی صاحب نے سب کو اپنی سالگرہ پر گھر بلایا تھا۔ یہاں اختر کی باجی سے ملاقات ہو گئی دوسری ہی ملاقات میں ان کی خوب خوب چونچیں ہوئیں۔ آج سے چھ سال پہلے باجی، باجی نہیں تھی بلکہ مس نعیمہ تھی۔ وہ یہاں ایف، آر، سی، ایس کرنے آئی تھی۔ لیکن پڑھائی کی طرف توجہ دینے کی بجائے وہ اپنے دیس کے نوجوانوں کا زیادہ خیال رکھنے لگی تھی۔ جو لڑکیوں کے پیچھے لندن کی گلیوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ لیکن اگر باجی ذرا سی بھی حسین ہوتی تو شاید یہ نوبت نہ آتی۔ لندن پہنچ کر اس نے اپنے ہم وطنوں کی توجہ جذب کرنے کا یہ طریق اختیار کیا کہ انہیں اپنے دیس اور تمدن کا واسطہ دے کر قدم قدم پر ٹوکنے لگی۔ لڑکے بالے اس کی بات تو خیر کیا مانتے۔ یوں

ہی اوپرے جی سے اس کا ادب کرنے لگے اور وہ مس نعیمہ سے باجی نعیمہ بن گئی۔ رفتہ رفتہ اس کا نام لینا بھی سوئے ادب سمجھا جانے لگا اور وہ صرف باجی ہو کر رہ گئی۔

اختر نے کہا: "باجی اور ساری باتیں چھوڑو۔ اتنا بتاؤ کہ یہ کم بخت ایف آر سی۔ ایس بلا ہو کر آپ سے کیوں چمٹ گیا۔"

"باجی نے منہ پھلا کر کہا: "پتہ ہے کتنا مشکل امتحان ہے یہ! نوے فی صدی امیدوار فیل ہوتے ہیں اور پھر مجھے پڑھنے کو وقت بھی کہاں ملتا ہے۔"

"کیوں؟" اختر نے حیران ہو کر پوچھا: "میرا تو خیال ہے کہ لندن میں اس قدر فراغت ہوتی ہے کہ انسان بے کار بیٹھ بیٹھ کر خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔"

"خوب ہے۔" باجی نے مسکرانے کی کوشش کی: "لیکن یہ فراغت مجھے تو کبھی نصیب نہ ہوئی۔"

"مصیبت تو یہ ہے۔" اختر نے مسکرا کر کہا: "کہ آپ لڑکا نہیں ہیں۔ ورنہ تین چار گھنٹے لڑکیوں کے ساتھ گذارنے کے بعد سارے دن میں اور کرنا ہی کیا ہوتا ہے۔"

باجی نے تنک کر کہا: "تو آپ نے بھی پر پرزے نکال لیے۔"

اختر نے سنجیدگی سے کہا: "پر پرزے تو میں لاہور ہی سے نکال کر چلا تھا۔"

شفیع نے کہا: "لیکن تو تو کہتا تھا کہ تو بحری جہاز سے یہاں پہنچا ہے۔"

"تو بالکل گدھا۔" اختر نے جھوٹ موٹ جھلا کر کہا: "آتی دفعہ پر پرزے بالکل چھوٹے چھوٹے سے تھے لیکن لندن میں رہ کر بڑے بڑے پر و بلیر بن جائیں گے اور ہندوستان لوٹنے کے لیے مجھے بحری جہاز کا ممنون احسان نہ ہونا پڑے گا۔"

صدیقی صاحب کو زور کی ہنسی آ گئی اور ان کے ساتھ مس ہوگن بھی مسکرانے لگیں۔

اختر نے کہا: "باجی! صدیقی صاحب چائے پر ہی ٹرخا دیں گے یا بادہ نوشی اور بادہ پیمائی کا پروگرام بھی رہیگا؟"

باجی نے تیوری چڑھا کر اختر کو دیکھا اور احتجاجاً جواب نہ دیا۔

نرملا نے صدیقی صاحب کے کان میں اختر والی بات پر غور کرنے کے بارے میں کہا اور صدیقی صاحب مسکرانے لگے۔

شفیع نے کہا: "باجی کے سامنے ایسی باتیں کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی؟"

اختر نے سر ہلا کر کہا: "بچو میں مسما نہیں باجی کے سامنے اعتکاف میں بیٹھ جاؤں اور شام کو بیت جا کر اس کلمہ پڑھنے والے منہ میں بیئر انڈیلنے لگوں۔"

مس ہوگن نے کہا: "کسی کی کمزوریوں کو ایسی میٹنگ میں اجاگر کرنا سراسر زیادتی ہے۔"

اختر نے سر جھکا کر کہا: "معاف کیجیے گا، میرا مطلب شفیع سے ہرگز نہیں تھا میں نے تو ایک عام آدمی کی مثال دی تھی جو ایسا کرتا ہے، کیا کرتا ہوگا یا آئندہ کیا کرے گا۔"

اس پر سب ہنس پڑے اور باجی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی رو آتے آتے رہ گئی۔

"ہیلو ایوری باڈی۔" کمرے میں دو یورپین لڑکیاں داخل ہوئیں اور سب اپنی اپنی جگہ پر اٹھ کھڑے ہوئے۔

گول چہرے والی لڑکی نے مسکرا کر کہا: "ہمیں افسوس ہے کہ ہم دیر سے پہنچیں۔ مجھے اپنے والد کو تار بھیجنا تھا اور تار گھر پر اتنی بھیڑ تھی کہ ہماری باری بہت دیر سے آئی۔"

صدیقی صاحب نے "کوئی بات نہیں! کوئی بات نہیں!!" کہنے کی کوشش کی تو اختر نے بات کاٹ کر کہا: "اگر آپ کو تار نہ بھی بھیجنا ہوتا اور پھر بھی آپ دیر سے آتیں تو بھی ہمیں شاید اسی قدر انتظار کرنا پڑتا۔"

اس لڑکی نے مسکرا کر اختر کی طرف دیکھا تو صدیقی صاحب نے ذرا پیچھے ہٹ کر اختر کو مخاطب کر کے کہا۔

"ان سے ملیے — مس سٹیلا! آپ ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کے آخری سال میں ہیں اور یہ ہیں مس ہیزل! ہنٹلے اینڈ پامر کے شعبہ اشتہارات کی انچارج — اور آپ اختر ہیں اور آئی۔ سی۔ ایس

کے امتحان میں شامل ہونے کی غرض سے یہاں تشریف لائے ہیں ؛

اختر نے قدرے جھک کر کہا : آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی — لیکن معاف کیجئے گا اس وقت مجھے بڑی زور کی چھینک آرہی ہے میں ابھی آتا ہوں : اور وہ تیزی سے قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔ مس ہیزل کو یہ بات بڑی ناگوار گزری۔ باجی نے بھی اختر کے اس رویے پہ ناک بھوں چڑھائی — لیکن سٹیلا مسکراتی رہی۔

خادم چائے لے کر اندر داخل ہوئی تو صدیقی نے کشتی اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا : اگر کوئی میرا پتہ پوچھتا ہوا اوپر آئے تو اُسے فوراً کمرے میں بھیج دینا :

کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اختر نے زور سے کہا : غضب خدا کا جب میں باہر تھا تو مجھے چھینک نہیں آئی اور اب جب میں اندر آگیا ہوں تو میری ناک میں پھر سوزش ہونے لگی ہے :

باجی نے چڑ کر کہا : تو پھر آپ باہر ہی رہیئے :

نرملا اور شفیع پنجابی میں باتیں کر رہے تھے اور مس ہوگن اور باجی چائے بنا رہی تھیں، صدیقی ہیزل سے اس کے نئے اشتہاروں کی عبارتیں سن رہا تھا اور وہ اپنی منی سی ناک پر گھڑی گھڑی عینک جما رہی تھی۔

اختر نے سٹیلا کے قریب کرسی کھینچتے ہوئے کہا : میرا دل آپ سے باتیں کرنے کو چاہتا ہے۔ لیکن مجھے باجی سے ڈر لگتا ہے۔ وہ اس بات کی کڑی نگرانی کرتی ہے کہ ہم ہندوستانی لڑکے انگریز لڑکیوں سے گھل مل کر باتیں نہ کریں۔

سٹیلا نے مسکرا کر لب کھولے تو اختر نے اس کا جواب سنے بغیر باجی سے کہا : باجی میں سٹیلا سے چند باتیں کر لوں ؟

باجی نے قہر آلود نگاہوں سے اختر کو گھورا اور ہیزل سے چینی کی مقدار پوچھنے لگی۔

سٹیلا نے رومال سے اپنی گھڑی کا شیشہ صاف کرتے ہوئے پوچھا : آپ ہمیں بُرا کیوں

سمجھتے ہیں؟"

"برا سمجھنے کی بات تو ہے ہی" اختر نے دونوں ہاتھ کھول کر کہا۔ "آپ لوگ ہمارے حاکم ہیں اور ہر بندہ آقا کے خلاف نفرت کے جذبات رکھتا ہے۔"

سٹیلا پھر مسکرائی اور اس کے بھرے بھرے گالوں میں دو ننھے ننھے گڑھے پیدا ہو گئے۔ اس نے اپنے گھنے بالوں کو سنوارتے ہوئے کہا۔

"شکر ہے میں آپ کی حاکم نہیں ورنہ مجھ سے بھی آپ کو خدا واسطے کی دشمنی ہو جاتی۔"

"کیوں؟" اختر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میں سوس جرمن ہوں" سٹیلا نے جواب دیا۔ "میرا باپ سوئٹزرلینڈ کا رہنے والا ہے اور میری ماں جرمن تھی اور مجھے انگریزوں سے دور کا بھی تعلق نہیں۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے" اختر نے خوش ہو کر کہا۔ "اس طرح مجھے آپ سے باتیں کرتے وقت نسلی جھجک نہ ہو گی اور میں....."

"بیشک" سٹیلا نے بات کاٹ کر کہا۔ "مجھے تو ہندوستانی بہت ہی اچھے لگتے ہیں۔ میں نے ہندوستان سے متعلق بہت سی کتابیں پڑھی ہیں اور میرا ارادہ ہے کہ اس ملک کی سیر کروں۔"

"ضرور! ضرور!" اختر نے کہا۔ "آپ لاہور آئیں۔ ہم آپ کو تانگے کی سیر کرائیں گے مغلیہ عمارتیں دکھائیں گے اور سانپ اور نیولے کی لڑائی کا تماشہ کروائیں گے۔"

"کیوں نہیں۔" سٹیلا نے جواب دیا۔ "موقع ملا تو میں ضرور وہاں جاؤنگی مجھے ہندوستان بہت ہی پسند ہے۔"

سٹیلا بھرے بھرے جسم کی بوٹا سی لڑکی تھی۔ میدہ اور شہاب رنگ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور گھنے بال جنہیں وہ موٹے موٹے بل دے کر کانوں کے پاس لٹکائے رکھتی تھی۔ اس کی ستواں ناک آگے سے قدرے اونچی تھی اور نتھنوں کی محرابیں سر کے ذرا سے اٹھ جانے سے نمایاں ہو جاتیں۔ سٹیلا کی ٹھوڑی نوکیلی نہ تھی اور اس کے جبڑے کا خم معدوم سا تھا۔ اس

کے پپوٹے ہر وقت بوجھل رہتے اور جب وہ آنکھ جھپکتی تو یہ بوجھل پردے ایک مرتبہ گر کر بڑی مشکل سے اوپر اٹھتے۔ اس کے بال بالکل سنہری نہ تھے بلکہ چائے کی رنگت رکھتے تھے۔ لیکن ماتھے اور کنپٹیوں کے پاس بے شمار زریں روئیں ان چائے رنگے بالوں کے قدموں سے چمٹے رہتے۔ مسکراتے وقت اس کے گالوں میں دو ننھے ننھے گڑھے پڑ جاتے اور ٹھوڑی ذرا نوکیلی ہو جاتی اس لیے وہ اکثر مسکراتی رہتی۔

اگلے دن شام کو جب اختر شفیع کے کمرے میں ٹوپی کو برش کرنے آیا تو شفیع نے کہا۔

"جاتو بڑے شوق سے رہے ہو لیکن یہ لڑکی ان چھوکریوں میں سے نہیں ہے جو نوکری کی تلاش میں پکاڈلی سکوائر کے آس پاس گھوما کرتی ہیں۔ یہ رئیس زادی ہے۔ اس کا باپ پیرس کا مشہور ڈاکٹر ہے اور یہ اس کی اکلوتی بچی ہے اس سے عشق کرنے کا خیال لے کر کئی فرنگی بچے فوج میں بھرتی ہو گئے اور بہت سے ہندوستانی اس کی تصویریں سینوں سے لگا کر امتحان دیئے بغیر وطن لوٹ گئے۔ یہ کسی چیز پر سنجیدگی سے غور کرنے کی عادی نہیں اور محبت کرنے کے معاملے میں تو بالکل برف ہے۔"

اختر نے کہا: "لیکن تمہیں یہ وہم کیوں ہو رہا ہے کہ میں اس سے محبت کرنے چلا ہوں میں تو صرف اس لیے جا رہا ہوں کہ اس نے مجھے پکچر پہ بلایا ہے اور کسی خاتون کی دعوت سے انکار سراسر بدتمیزی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" شفیع نے ایک لمبا کش کھینچ کر کہا: "خواتین سے اقرار کئے جاؤ اور دو مہینے کے بعد جو امتحان ہو رہا ہے وہاں پر بھی یہ دو دل اور ایک تیر کی تصویر بنا کر چلے آنا۔"

"دو مہینے تو بہت ہوتے ہیں۔" اختر نے ماچس اٹھا کر کہا: "امتحان کی تیاری تو ایک ہفتے میں ہو جاتی ہے۔"

سٹیلا نے اختر کو ٹھیک چھ بجے لندن پیلے ڈیم پر پہنچنے کا وقت دے رکھا تھا لیکن لائی سٹر سکوائر پہ گاڑی کا بدلنا بھول گیا اور سیدھا چیئرنگ کراس پہنچ گیا۔ وہاں سے پہلی

گاڑی میں جگہ نہ ملی اور جب وہ لندن پہ ولٹین پہنچا تو ساڑھے چھ ہو چکے تھے اور سٹیلا ویٹنگ روم کے باہر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اختر نے اپنی ٹوپی اتار کر کہا۔

"سٹیلا! مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں وقت پر نہ پہنچ سکا میرے یہاں چند ایسے ہندوستانی بزرگ آ گئے جنہیں اگر میں یوں چھوڑ آتا تو وہ میرے والد کو جھوٹا سچا خط لکھ دیتے۔"

سٹیلا مسکرائی اور چاکلیٹ کی ٹکیہ اس کی طرف بڑھا کر بولی "کوئی بات نہیں۔ ہم لیٹ شو دیکھ لیں گے۔ تم نے اچھا کیا جو اپنے مہمانوں کو شکایت کا موقع نہ دیا۔ مجھے بزرگ قسم کے لوگ بڑے پیارے لگتے ہیں۔"

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے پکاڈلی سرکس کا چکر کاٹنے لگے اور جب وہ ایک مختصر سے ریستوران کے سامنے سے گذرے تو سٹیلا نے پوچھا "تم نے کھانا تو نہیں کھایا ہوگا اختر؟"

"نہیں۔" اختر نے ہولے سے کہا "لیکن مجھے اس وقت بھوک نہیں اور آج میں فاقہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر قہوہ پیتے ہیں" سٹیلا نے اصرار کیا اور وہ دونوں ریستوران میں داخل ہو گئے۔

قہوہ نوشی کے دوران میں سٹیلا نے اٹل بے جوڑ سی باتیں شروع کر دیں۔

"میرے ڈیڈی" سٹیلا نے فخریہ کہا "اتنے اچھے ہیں کہ تمہیں کبھی یقین ہی نہ آئے کہ والد بھی ایسے ہو سکتے ہیں۔ میری ماں کے مرنے کے بعد انہوں نے شادی نہیں کی اور اپنی فرصت کے اوقات میری تربیت کے لیے وقف کر دیئے۔ میں بھی شادی کا ارادہ نہیں رکھتی۔ لیکن اس طرح میری ماں کی روح کو بڑا دکھ ہوگا۔ میں نے اپنی ماں نہیں دیکھی لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ کیسی ہوگی۔ کس طرح باتیں کرتی ہوگی اور کیسے چلا کرتی تھی۔ تمہاری ماں تو زندہ ہے۔ تم بڑے خوش قسمت ہو۔ تمہارے چہرے پر جو یہ ایک شرارت سی کھیلتی رہتی ہے۔ تمہاری ماں کے زندہ ہونے کی دلیل ہے۔ میرے ڈیڈی مجھ سے بڑا پیار کرتے ہیں لیکن وہ ماں تو نہیں

بن سکتے نا انہوں نے مجھے اپنی مرضی سے شادی کرنے کا پورا اختیار دے رکھا ہے۔ میں چاہے کسی بش مین سے شادی کر لوں وہ بُرا نہیں مانیں گے لیکن میں بیاہ کرنا نہیں چاہتی مجھے شادی سے نفرت ہے اور جب میں ڈاکٹری کی یہ ڈگری لے لوں گی تو پریکٹس بھی نہیں کروں گی۔ مجھے ڈاکٹری بھی اچھی نہیں لگتی۔ دراصل مجھے کوئی چیز بھی اچھی نہیں لگتی۔ پتہ نہیں اچھی چیزیں دنیا کے کس گوشے میں رہتی ہیں؟"

اختر چپ چاپ اس کی باتیں سنتا رہا اور قہوہ پیتا رہا۔ لیکن جب سٹیلا نے دوبارہ کہا کہ مجھے کوئی چیز بھی اچھی نہیں لگتی تو اختر نے اپنی طرف اشارہ کر کے کہا۔

' میں بھی اچھا نہیں لگا؟

سٹیلا نے مسکرا کر کہا " ذرا! ذرا!! اور اس کے گالوں میں ذرا ذرا سے گڑھے پڑ گئے۔

اختر نے اپنی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا " شکر ہے تمہیں کچھ تو اچھا لگا۔ تھوڑا تھوڑا سا ہی سہی"۔

بیچر دیکھتے وقت اختر نے اس کی طرف جھک کر کہا " میں تھک گیا ہوں۔ تمہارے کندھے پر سر رکھ لوں۔

" ضرور" سٹیلا نے اس کی طرف سرک کر جواب دیا اور اختر نے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ کر ہولے سے دبا دیا۔

سٹیلا نے پوچھا " تمہیں نیند تو نہیں آ رہی؟"

ہاں " اختر نے جمائی لے کر کہا " میں سر شام سو جانے کا عادی ہوں۔ لیکن خیر اب تو بیچر دیکھ کر ہی چلیں گے " پھر اس نے اپنا سر اٹھا کر پوچھا " تمہیں بوجھ تو نہیں لگ رہا۔ میرا سر ذرا وزنی ہے۔

نہیں نہیں" سٹیلا نے کندھا اوپر اٹھا کر کہا " سر کا بھی کوئی بوجھ ہوتا ہے "۔

اختر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر انگلیوں کی کنگھی ڈال دی اور آنکھیں بند کر لیں۔

سٹیلا اور اختر کی ملاقاتیں طویل ہونے لگیں اور الیستھر کے خطوں کے جواب میں رخنے پڑنے لگے۔ سعیدہ کے جذباتی خطوط کا شفیع کو بڑا پاس تھا اس نے ایک دن آپ ہی آپ اس کا جواب لکھ دیا کہ اختر چونکہ پڑھائی میں مشغول رہتا ہے اس لیے اس نے خط لکھنے بھی ترک کر دیئے ہیں۔ لیکن وہ تمہیں خط لکھنے کے لیے اکثر کہتا رہتا ہے۔ اباجی کو اختر کبھی کبھار ایک مختصری چٹھی لکھ دیتا اور مہینے بھر کے لیے ان کی تسلی ہو جاتی۔ اختر نے خطوں ہی خطوں میں شفیع کو ایستھر سے اچھی طرح متعارف کرا دیا تھا اور وہ باقاعدگی سے ایک دوسرے کو چھبتے ہوئے فقرے اور سلام بھیجنے لگے تھے۔ لیکن جب الیستھر کے خط کے جواب میں اختر کی بجائے شفیع کا خط گیا تو اس نے لکھ بھیجا کہ اختر اگر عدیم الفرصتی یا سہل انگاری کی وجہ سے مجھے خط نہیں لکھ سکتا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے سرکاری قسم کی چٹھیاں لکھی جائیں جن کا اجرا پرائیویٹ سیکرٹری کے دستخطوں سے ہوا کرتا ہے اور شفیع نے الیستھر کا نام تک لینا چھوڑ دیا۔

سعیدہ نے شفیع کو شکریے کی ایک لمبی ساری چٹھی لکھی تھی اور اس سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنی بہن کو کبھی نہ بھولیں اور ہر آٹھویں دسویں اسے اختر سے متعلق سب کچھ لکھتے رہا کریں۔ اس کے ساتھ ہی شفیع کو ڈی۔ ایم۔ سی سے کاڑھے ہوئے بوسکی کے چھ رمالوں کا ایک پارسل بھیجا تھا۔

سارا لندن کہرے کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا اور سڑکوں پر وہ پہلے والی چہل پہل نہیں رہی تھی کسی کسی گھر میں جہاں ایک آدھ بوڑھا جوڑا رہتا تھا۔ الاؤ بھی روشن ہو گئے تھے اور دریچوں پر دبیز پردے کھینچ دیئے گئے تھے۔ سٹیلا نے اختر کی ٹانگوں پر اپنا سمور دار کوٹ ڈال کر پوچھا: "تمہیں سردی تو نہیں لگتی؟"

اختر نے مسکرا کر جواب دیا: "لگتی تو تھی مگر اب نہیں۔"

سٹیلا نے کہا: "تو تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا۔"

اختر نے سگریٹ کی راکھ میز پوش پر جھاڑتے ہوئے کہا: "مجھ میں ابھی تک ذرا سی قوتِ برداشت باقی ہے۔ اس لیے نہ کہا!"

سٹیلا اس کی کرسی کے پیچھے کھڑی ہوگئی اور اختر کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگی: تم اپنی ہر بات چھپاتے ہو۔ کبھی مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں؟

اختر نے ایک ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑلی اور اسے کھینچ کر اپنی کرسی کے بازو پر بٹھالیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور کہا "میرے پاس کوئی بھی کہنے والی بات نہیں میرے دل میں کوئی بھی راز نہیں اور مجھے ذراسی تکلیف بھی نہیں۔ میں تم سے کہوں تو کیا کہوں"

سٹیلا نے کہا "کوئی بات کرو، کسی قسم کی شکایت کرو۔ میرے خلاف تمہارے دل میں جو کچھ ہے سب کہہ ڈالو، مجھے ذراسا بھی افسوس نہ ہوگا — مجھے پتہ ہے تمہیں اچھی نہیں لگتی اور تم صرف مروت کی وجہ سے میرے یہاں آتے ہو، مجھ سے ملتے ہو اور میرے ساتھ پکچر دیکھنے یا سیر کرنے نکلتے ہو"

اختر نے سگریٹ چٹکی سے اڑا کر ٹھنڈے آتشدان میں پھینک دیا اور سٹیلا کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر کہنے لگا۔

"تمہیں یہ وہم کس طرح ہوا کہ میں تمہیں اچھا نہیں سمجھتا یا مجھے تم سے پیار نہیں اور میں یہاں صرف مروتاً آتا ہوں۔ اگر تم مجھے اچھی نہ لگتیں تو میں اپنا وقت کیوں ضائع کرتا۔ ایستھر کو اس کے خطوں کے جواب کیوں نہ دیتا اور سعیدہ کو شفیع سے چٹھیاں کیوں لکھواتا۔ آخر تم نے یہ کیوں کہا — جاؤ میں تم سے نہیں بولتا" اور اس نے سٹیلا کا چہرہ چھوڑ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

سٹیلا نے تلملا کر اپنی باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں اور کہا۔

"مجھے معاف کرنا اختر، مجھے محبت کرنا نہیں آتا۔ مجھے پتہ نہیں کہ کونسی بات کب کہنی چاہیئے اور کس موقع پر کیسا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ میں نے کبھی محبت نہیں کی۔ پہلے مجھے یہ بہت ہی چھچھورا سا کھیل لگتا تھا لیکن جب میں نے صدیقی کے یہاں تمہیں دیکھا تو میرا یہ فلسفہ اپنا ہیچ ہو کر رہ گیا — تمہیں میری باتیں ناگوار گذری ہوں تو مجھے معاف کردو، میں پھر کبھی بھی یوں نہ کہونگی"

اختر نے مسکرا کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور اس کے سینے پر پیشانی رکھ کر

کہنے لگا۔

"میں تو تمہارا حوصلہ دیکھ رہا تھا۔ سٹیلا! میں تم سے کبھی بھی ناراض نہیں ہو سکتا تم تو میری جان ہو اور میں اپنی جان سے کبھی بیزار نہیں ہوا۔"

سٹیلا نے آہستہ سے پوچھا "تمہیں ایستھر سے محبت نہیں ؟"

"ہے" اختر نے اطمینان سے کہا "مجھے ہر اچھی چیز سے پیار ہے۔"

"تم اس سے شادی کر رہے ہو ؟" سٹیلا نے پوچھا۔

"نہیں" اختر نے سر اٹھا کر جواب دیا "شادی تو میں صرف سعیدہ سے کروں گا میں نے اس سے وعدہ کر رکھا ہے۔"

سٹیلا نے جیسے اپنے آپ سے کہا "کتنا اچھا ہوتا اگر سعیدہ تمہاری چچازاد نہ ہوتی۔ یا میں پیرس میں پیدا ہونے کی بجائے بمبئی میں جنم لیا۔ لیکن ایسا کیوں ہوتا۔ قدرت کا مجوزہ نظام کیونکر بدلتا" پھر اس نے اختر کے کندھے پر کہنی رکھ کر کہا "یوں نہیں ہو سکتا اختر کہ میں تمہارے ساتھ ہندوستان چلی چلوں تم اور سعیدہ شادی کر لینا۔ میں وہاں پریکٹس کیا کروں گی اور کبھی کبھار تم سے ملنے آجایا کروں گی۔"

اختر نے اسے تھپکتے ہوئے کہا "تم انہونی باتیں کیوں کرتی ہو۔ کوئی اتنی ساری زندگی یوں بھی گزار سکتا ہے! پہلے بھی کبھی ایسا ہوا ہے!!"

"نہیں ہوا تو کیا ہے" سٹیلا نے وثوق سے کہا "میں ایسے کر سکتی ہوں۔ مجھے اپنے آپ پر بھروسہ ہے بڑا اعتماد ہے۔ اگر میرا ایک اعتماد مجروح ہو گیا تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میرے سارے مان ٹوٹ جائیں گے۔"

"شاید تمہارا کوئی مان بھی نہ ٹوٹے" اختر نے دکھے دل سے کہا "لیکن ایسی باتیں نہ کرو مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے کیا تم مجھے تکلیف دینا چاہتی ہو؟"

سٹیلا پھر اس کے ساتھ چمٹ گئی اور سرگوشی کرنے لگی "کبھی بھی نہیں اختر! کبھی نہیں۔ خدا کرے میں تمہیں تکلیف دینے سے پہلے ختم ہو جاؤں۔ خدا کرے..."

اختر نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کے بالوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ سٹیلا ہولے ہولے سسکیاں بھرنے لگی اور اختر کا سوئیٹر اور قمیص آنسوؤں سے بھیگ گئی۔ اسے اسی طرح رونے والی سعیدہ یاد آ گئی۔ ایک آنسو نہ بہانے والی ایستھر کا خیال آگیا اور وہ سوچنے لگا کہ کیسا عجیب کھیل ہے۔ کیسی تکلیف دہ بازی ہے لیکن اس کے ساتھ کتنی دلچسپ ہنگامہ پرور حیات بخش اور جانفزا۔ اگر اس کھیل میں کرب کے سارے مہرے پٹ جائیں تو بساط ایک دھویا دھایا دستر خوان بن کر رہ جائے۔ ایک چغتانہ میز پوشی ہو جائے جس پر کاغذی پھولوں کے گلدستے پڑے رہتے ہیں۔ بے جان۔ بے بو!

"کوئی بات نہیں" اختر نے کہا "مجھے کچھ ایسی بھوک بھی نہیں"

"میں بھوک مٹانے کی غرض سے نہیں کہہ رہی" سٹیلا نے ماچس اٹھا کر کہا "چائے پی کر تم ذرا گرم ہو جاؤ گے اور راستے میں تمہیں سردی نہیں لگے گی"

سٹوو لیمپ کے حروف پر اپنی انگلی کیتلی کے پیندے سے لگ کر کناروں تک پھیلے ہوئے تھے اور کمرے میں آگ اور پیرافین کی ملی جلی بو دور تک پھیلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سٹیلا خاموشی سے سر جھکائے سٹوو لیمپ کے حروف پر اپنی انگلی رگڑ رہی تھی۔ اختر اٹھ کر اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور آہستہ سے پوچھنے لگا۔

"میں ان شعلوں کی روشنی میں تمہاری شکل دیکھنی چاہتا ہوں۔ کیا بتی بجھا دوں"

سٹیلا نے کوئی جواب نہ دیا اور اسی طرح ناخن رگڑتی رہی۔ اختر نے آگے بڑھ کر بتی گل کر دی اور نارنجی شعلوں کی روشنی اچک کر سٹیلا کے چہرے اور بالوں پر پہنچ گئی۔ اختر نے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو اب....."

لیکن جب سٹیلا کا چہرہ اوپر اٹھا تو اس کی آنکھیں دھانی آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

"یہ کیا" اختر نے سٹیلا کی ٹھوڑی چھوڑ کر کہا "اگر تم ایسے ہی کرو گی تو میں واقعی تم سے

بولنا بند کر دوں گا۔ اور تمہارے یہاں نہیں آؤں گا۔"

سٹیلا نے جلدی جلدی آنکھیں جھپک کر آنسو گرا دیئے اور رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں روتی تو نہیں۔ یہ تو سٹوو کی گیس کا اثر ہے۔ اگر میں ۔۔۔"

اختر نے بات کاٹ کر کہا: "اچھا تو پھر ہنس کر دکھاؤ۔"

سٹیلا ذرا سا مسکرائی اختر نے کہا: "یوں نہیں اچھی طرح ہنسو۔"

اور جب وہ ہنسی وہی دونوں گڑھے پل بھر کو اس کے گالوں میں نمودار ہوئے اور پھر غائب ہو گئے۔

اختر نے کہا: "ایک بار پھر لیکن زیادہ دیر تک۔"

اور اس مرتبہ جب وہ زیادہ دیر کے لیے ہنسی تو شدت سے سٹوو لیمپ پر ناخن رگڑنے لگی اور رگڑ کی یہ آواز اس کی پھیکی ہنسی سے کہیں نمایاں تھی۔

صبح صبح شفیع نے اختر کو سعیدہ کا ایک لفافہ دیا جس کے منہ پہ لاکھ کی ایک چھوٹی سی مہر لگی ہوئی تھی اور کونے میں "صرف اختر کے لیے" لکھا تھا۔ شفیع نے کرسی کھینچتے ہوئے کہا: "رات میرے سر میں درد تھا اور میں تمہارا انتظار کیے بغیر سو گیا۔"

اختر نے لفافے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا: "بھلا سعیدہ کو یہ کیا سوجھی کہ خط کو ایسا پرائیویٹ بنا دیا۔ اب میں اسے نہیں کھولوں گا تم ہی کھولو اور پڑھ کر سناؤ۔"

"سؤر زادے:" شفیع نے صحیح تلفظ میں گالی دیتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ خط میری نظروں سے گزرنا ہوتا تو سعیدہ اس پہ مہر کیوں لگاتی۔"

اختر نے تکیئے کے نیچے ہاتھ پھیر کر سگریٹ کیس نکالا اور ایسٹ اینڈ والوں کی زبان میں جوابی گالی دے کر کہا۔

"بکواس نہ کیجیے بلکہ وہی کیجیے جو میں عرض کر رہا ہوں۔"

شفیع نے لفافہ کھولا اور خط پڑھنا شروع کیا۔

مینو تہو جی!

تمہیں ایک خبر سناتی ہوں۔ ایسی خبر جسے سن کر تمہیں اس کی سچائی پر یقین نہ آئے گا اور تم بھی میری طرح خوشی سے پاگل ہو جاؤ گے۔ پرسوں تایا جی کا خط ابا جان کے نام آیا تھا جس میں انہوں نے میری اور تمہاری منگنی کے بارے میں لکھا تھا۔ ابا جان نے ہامی بھر لی اور ہماری منگنی ہو گئی ہے۔ امی جان نے ڈھیر ساری مٹھائی اور پھل رکابیوں میں بھر کر ساتھ کے بنگلوں میں تقسیم کئے اور وہاں سے امی کو اور مجھے مبارک باد کے اتنے رقعے آئے کہ مجھے تو سچ مچ شرم سی آنے لگی۔ اب تم مجھے جو چاہو لکھو۔ امی تمہارا خط نہیں پڑھیں گی۔

کل سے میرا جی زور زور سے رونے کو چاہتا ہے اور مجھے اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ پتہ نہیں چلتا میں کیا کروں۔ شفیع بھائی کو اس منگنی کے متعلق بتا دینا انہیں میرا خط نہ دکھانا۔ مجھے بڑی شرم آتی ہے۔

ان دنوں میں تمہارے لیے نسواری رنگ کا سویٹر بن رہی ہوں۔ جب تم جہاز سے اترو گے تو سب سے پہلے یہی تحفہ وصول کرو گے۔ ابا جان چند دنوں کی چھٹی پر لاہور جا رہے ہیں۔ ان کے بعد میں اپنی سہیلیوں کو ایک پارٹی دوں گی۔ اگر تم نے یہاں کوئی تصویر کھچوائی ہو تو مجھے بھیجنا۔ ضرور! ضرور! ضرور!

صرف تمہاری

سعیدہ

شفیع نے خط بند کر کے اختر کی طرف دیکھا تو اس نے مسکرا کر سر ہلایا اور راکھ جھاڑ کر کہا۔

"برخوردار آج سے سعیدہ کو سعیدہ بھابی کہنا پڑے گا۔"

"وہ کیوں" شفیع نے خط اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "سعیدہ جب بھی میری بہن تھی اور اب بھی میری بہن ہی رہے گی ہمارے رشتے میں رخنہ ڈالنے والے تم کون ہوتے ہو۔"

"اچھا جی" اختر نے آنکھیں نچا کر کہا "ہمارا اب کوئی تعلق ہی نہیں رہا۔ میاں صاحبزادے ہمیں نہیں مانو گے تو یہ رشتہ ایک دن بھی نہیں چل سکے گا۔ یہ سب سلسلے ہمارے دم قدم سے ہیں۔ ورنہ تم ایسے کھٹ بڑھئی کو کون پوچھتا ہے "۔

" دیکھ لیں گے" شفیع نے دعوے کیا "کون کھٹ بڑھئی بنتا ہے اور کس کی اہمیت کے جھنڈے گڑتے ہیں "۔

اختر نے کہا "تو راجہ اہم الدین صاحب اسے میری طرف سے ایک خط تو لکھ دو کہ۔۔۔ "

شرم نہیں آتی" شفیع نے بات کاٹی "اس خط کا جواب بھی مجھ سے لکھواتے ہو"

" تو اور کس سے لکھواؤں" اختر نے پوچھا "پرسوں تو میری نظر بندی ہونے والی ہے اور جب تک میں اپنے کمرے میں مقید رہوں گا کسی کو خط نہیں لکھوں گا "

لیکن ابھی تو پورے دو دن بیچ میں ہیں" شفیع نے کہا "تجھے خط لکھنا ہے کوئی مقالہ تو رقم نہیں کرنا"

اختر نے کہا "بھلے آدمی تو پریم پتر کی حقیقت سے واقف نہیں میں تو اباجی کو بھی چار پانچ صفحوں سے کم نہیں لکھا کرتا یہ تو سعیدہ کا معاملہ ہے اور خدا کی قسم تم نہیں جانتے وہ بھولی لڑکی ہے گھنّو ملوتی گڑیا ہے اسے چھوٹا سا خط لکھا تو وہ رونے لگ جائے گی "

" اسی لیے تو کہتا ہوں" شفیع نے جواب دیا "اپنے ہاتھ سے لکھ اور کئی صفحوں کا پتر لکھ اس خط کا جواب وہ تیری لکھائی میں چاہتی ہے "

" میری لکھائی میں چاہتی ہے " اختر نے حیران ہو کر پوچھا "تمہیں کیسے پتہ چلا"

" سؤر کے گھگھو" شفیع نے چڑ کر کہا "اس نے کہا جو ہے کہ اب جو چاہے لکھنا۔ امی تمہارا خط نہیں پڑھیں گی "

" تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں اسے اپنے ہاتھ سے لکھوں" اختر نے سیانوں کی طرح کہا۔

" اور کیا "

"تو بہت اچھا ایسا ہی کریں گے۔ اس میں کونسا تپ کرنا پڑتا ہے۔"

اسی دن دوپہر کو اختر سعیدہ کے خط کا جواب لکھ رہا تھا کہ ایستھر کا لفافہ ملا۔

پیارے ایستھر!

پرسوں سے مجھے ایک ڈراؤنا خواب آ رہا ہے اور مجھے یوں لگ رہا ہے کہ کوئی عجیب سی قوت تمہیں وقت سے پہلے مجھ سے چھیننے لیے جا رہی ہے۔ اگر واقعی یوں ہی ہوا تو میں کیا کروں گی گو میں اچھی طرح سے جانتی ہوں کہ ہماری خط و کتابت کی عمر چند دن اور رہ گئی ہے۔ پھر تم وائیلڈ لینڈ چلے جاؤ گے اور میں جرمنی کے کسی مدرسے میں استانی بن کر زندگی گزار دوں گی۔ لیکن میں کیا کروں میرا جی گھبرا رہا ہے ہر چیز سے ہول آنے لگا ہے اور مجھے نیند آتی ہے تو میں سوتی نہیں کہ پھر وہی خواب اپنے ٹیڑھے پنجے میرے ذہن میں گڑو دے گا۔ اور میں چیخ مار کر بیدار ہو جاؤں گی۔ خدا کے لیے میری مدد کرو میں تمہارے سامنے دو زانوں ہو کر التجا کرتی ہوں کہ صرف ایک دن کے لیے میونخ آ کر مجھے اپنی صورت دکھا جاؤ اس کے بعد چاہے عمر بھر کے لیے اپنا تصور میرے ذہن سے کھرچ دینا۔ میرا دماغ ماؤف کر کے چلے آنا۔ تمہیں اپنی عزیز ترین زندگی کی قسم ضرور میونخ آؤ۔ ضرور! ضرور!! ضرور!!!

تمہاری

اختر

اختر نے یہ خط دو تین مرتبہ پڑھا۔ کونے پر پنسل سے کتنی ساری آڑی ترچھی لکیریں کھینچیں اور پھر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ شفیع کو پڑھانے کی غرض سے اختر یہ خط دو مرتبہ اس کے کمرے میں گیا لیکن ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد یونہی واپس آ گیا۔ اس نے ایستھر کو ایک مختصر سا جواب لکھا کہ وہ میونخ ضرور آئے گا لیکن امتحان ختم ہو جانے کے بعد۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی لکھ دیا کہ چونکہ اب وہ اپنے آپ کو کمرے میں بند کر کے امتحان کی تیاری کرنے والا ہے اس لیے وہ اس کے خطوں کے جواب تفصیل سے نہ دے سکے گا اور اگر کبھی اسے وقت پر

جواب نہ ملے تو وہ گھبرائے نہیں اور اپنے ساتھ ہی اسے بھی پریشان نہ کرے۔

یہ خط اس نے پوسٹ تو کر دیا لیکن تمام رات سوچتا رہا کہ پتہ نہیں یہ خط پڑھ کر اسٹیلا کا ردِ عمل کیا ہو۔ شاید وہ جذبات کی رو میں بہہ کر خودکشی کر لے یا خط پڑھ کر وہ پرزے پرزے کر ڈالے۔ مجھے بھلا دے اور جب میں میونخ پہنچوں تو مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دے۔ بہت ممکن ہے وہ خود یہاں پہنچ جائے اور مجھے ساتھ لے کر کسی ایسے جزیرے میں چلی جائے جہاں سے کسی کو کسی کی خبر نہیں آتی۔ لیکن میں ایسا کمزور تو نہیں کہ چڑیا کی طرح مسحور ہو کر اجگر کے منہ میں چلا جاؤں۔ میری بھی تو انفرادیت ہے میں بھی تو سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ آخر میں کیوں بچے کی طرح انگلی پکڑ کر اس کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ بھلا اس طرح کیسے ہو گا۔ میں اس کا ڈوگی تو نہیں ہوں!

اگلے دن صبح ہی صبح کسی نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا اور جب اس نے پٹ کھولا تو سٹیلا کا ہنستا ہوا چہرہ نمودار ہوا وہ ہاتھ میں پتھے کی بنی ہوئی ایک چھوٹی سی ٹوکری اٹھائے کھڑی تھی اور آج اس نے ہلکا سا میک اپ بھی نہیں کیا تھا۔ اختر اسے خوش آمدید کہتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا اور جب وہ اندر آ کر کرسی پر بیٹھ گئی تو اس نے کہا۔

"کل سے تم مجھ سے ملنا بند کر دو گے اور ہم ایک مہینے تک ایک دوسرے کی شکل نہ دیکھ سکیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ آج سارا دن ہم اکٹھے رہیں۔ میں تمہیں جی بھر کے دیکھوں اور اس کے بعد اپنے کالج سے ایک مہینے کی چھٹی لے کر گھر بیٹھ رہوں اور تم آخری پرچہ کر کے سیدھے میرے یہاں آؤ اور ہم وہ رات ٹیمز کے کنارے ادھر ادھر گھوم کر گزاریں۔" پھر اس نے ٹوکری کی طرف اشارہ کر کے کہا: "اس میں لنچ کا سامان ہے اور میں نے اپنے ہاتھ سے تمہارے لیے سینڈوچز تیار کیے ہیں۔ کیا تمہیں سینڈوچز پسند ہیں؟"

"کیوں نہیں۔" اختر نے چٹکارا بھر کر کہا: "مجھے تو یہ بہت ہی مرغوب ہیں۔ ہمارے یہاں

انہیں شاہی ٹکڑے کہتے ہیں اور انہیں نمک کی چاشنی میں پکاتے ہیں۔"

"نمک کی چاشنی میں!" سٹیلا نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں ہاں نمک کی چاشنی میں۔ وہ ایک خاص چیز ہوتی ہے۔ افسوس کہ لندن میں ایسی چاشنی تیار نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کے لیے ہندوستان کی آب و ہوا کی ضرورت پڑتی ہے۔ تم ہندوستان آؤ گی تو کھلائیں گے۔"

سٹیلا نے آنکھیں بند کر لیں اور نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر سر پیچھے ڈال دیا۔ اختر سیٹی میں کاموڈ کی دھن بجا کر کپڑے بدلنے لگا اور سٹیلا اسی طرح خاموشی سے کرسی میں دراز ہوئے ہوئے سانس لیتی رہی۔

جب وہ باہر نکلے تو زور کی بارش شروع ہو گئی اور سٹیشن تک پہنچتے پہنچتے ان کے سارے کپڑے بھیگ گئے۔ گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے اختر نے اپنے رومال سے سٹیلا کے بازوؤں اور ہاتھوں کو خشک کیا اور جب اس نے نچوڑنے کی غرض سے رومال کو ایک بل دیا تو پہلا قطرہ گرنے سے پہلے اس نے بل کھول کر رومال کو جھٹکا اور اسے اپنی ناک کے قریب لا کر کہا۔

"دیکھو اس میں سے تمہاری خوشبو آنے لگی ہے۔ میں بھی کتنا بدنصیب ہوں، تمہارے لمس کو اس سنگین پلیٹ فارم پر رولنے لگا تھا۔" سٹیلا نے مسکرا کر بھرپور نگاہوں سے اسے دیکھا اور نظریں نیچی کر لیں۔

تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد دن بھر بارش ہوتی رہی۔ گہرے بادلوں نے آسمان کو ڈھانک رکھا تھا اور سارے شہر پر رات کی سیاہی چھا رہی تھی، ٹریفک کے ہارن معمول سے زیادہ شور مچا رہے تھے اور سڑکوں کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ اس تاریکی میں گاڑی بجلی کی طرح تڑپتی ونڈسر کی طرف بڑھ رہی تھی اور اختر اور سٹیلا ٹھنڈی نشستوں پر اجنبیوں کی طرح خاموش بیٹھے تھے۔ سٹیلا کے پاس ڈھیروں بے چین سوال تھے۔ اختر کے پاس بہت سے تسکین دہ جواب تھے لیکن موسم کی فوری تبدیلی نے انہیں

سوگوار بنا دیا تھا۔ لوگوں کی گفتگو سے ظاہر ہوتا کہ مینہ ابھی نہیں تھمے گا اور مطلع کئی دن تک صاف نہ ہوگا۔ جہاز رانی سے دلچسپی رکھنے والے رودبار کے بارے میں باتیں کر رہے تھے جو ایسے موقعوں پر سفر کے قابل نہیں رہتی جہاں ان دنوں میں راہ نمائی کا کام بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔ گاڑی کے لوگ آج معمول سے زیادہ باتیں کر رہے تھے اور موسم کی ناخوشگواری کو اپنی گفتگو میں ڈبو کر ماحول سے بے خبر ہو جانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ لیکن سٹیلا اپنے امڈتے ہوئے جذبات کو خاموشی کے دبیز پردوں تلے چھپا رہی تھی اور اسے اس طرح دیکھ کر اختر بھی چپ چاپ بیٹھا تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ راستہ کٹتا رہا اور سکوت کے ابریشمی بادل ادھر ادھر پھیل کر ان کی نگاہیں دھندلاتے رہے۔ ڈنڈسر کہرے اور اندھیرے میں لپٹا ہوا تھا جب وہ قلعے کے مینار پر چڑھنے لگے تو پھر زور کی بارش شروع ہو گئی۔ سٹیلا اختر سے ایک زینہ آگے تھی اور اپنے سکارف کو کندھوں پر ڈالے اس کے کونے مٹھی میں پکڑے ہوئے ہوئے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اختر ٹفن دان ہاتھوں میں جھلاتے ہوئے اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ اوپر سے اترنے والوں کی ہنسی اور سیٹیوں کی آواز سن کر وہ دیوار سے لگ جاتے اور جب پورا گروہ ان کے قریب سے گزر جاتا تو وہ پھر سیڑھیاں چڑھنی شروع کر دیتے اوپر پہنچتے پہنچتے اندھیرا چھٹ گیا۔ لیکن بارش کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ سٹیلا نے اپنے سکارف کو اسی طرح پکڑے نیچے دیکھا۔ صحن میں مرد اور عورتیں بالشتیوں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے اور چھینٹے ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ اختر آلتی پالتی مار کر زمین پر بیٹھ گیا۔ سٹیلا نے پلٹ کر دیکھا اور کہا۔

" ذرا اٹھو میں یہ سکارف بچھا دوں نہیں تو تمہاری پتلون خراب ہو جائے گی ۔"

" کوئی بات نہیں :" اختر نے کہا : " مجھے کریز ٹوٹی اور میلی پتلونیں ہی اچھی لگتی ہیں ۔"

سٹیلا نے سکارف فرش پر پھینک دیا اور اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اختر نے ٹفن دان کی طرف دیکھ کر کہا۔

" پتہ نہیں مجھے برکھا رت میں اتنی بھوک کیوں لگتی ہے۔ یہی جی چاہتا ہے کہ جو چیز سامنے

آئے بنا دیکھے نکل جاؤں:

"تو میں ٹفن دان کھولوں؟" سٹیلا نے پوچھا۔

"ہاں ہاں" اختر نے آنکھیں گھما کر کہا" اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے"۔

ایک ڈبہ سینڈوچز سے بھرا ہوا تھا۔ دوسرے میں سیب کے ٹکڑے اور چاکلیٹ کی ٹکیاں۔ اختر نے ایک سینڈوچ اٹھا کر اس کا منہ ذرا سا کھولا اور پوچھا۔

"یہ کس چیز کا سینڈوچ ہے؟"

"سؤر کا" سٹیلا نے بھولپن سے کہا۔

اختر ہنسا اور سینڈوچ کے دونوں پرت علیحدہ کر دیئے۔ مکھن میں چپڑی خاکستری گوشت کی پتلی سی تکونی تہہ کا ایک کونہ ٹوٹ کر اوپر کے پرت سے چمٹ گیا اور باقی نچلے ٹکڑے سے اسی طرح لگی رہی۔ اختر نے دونوں ٹکڑے اپنی ہتھیلیوں پر رکھ کر ہاتھ پھیلا دیئے اور مسکرا کر پوچھنے لگا۔

"تمہیں معلوم نہیں کہ ہم لوگ سؤر کا گوشت نہیں کھاتے"۔

سٹیلا حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگی اور اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

"میں نے پڑھا ہے کہ مسلمان سؤر کا گوشت نہیں کھاتے لیکن میرا خیال تھا کہ وہ ترقی یافتہ مسلمان جو بلا جھجک شراب پیتے ہیں۔ شاید سؤر کا گوشت بھی کھانے لگے ہوں"۔

"ہرگز نہیں" اختر نے دعوے سے کہا" ازل کا شرابی مسلمان بھی اس ناپاک چیز کو ہاتھ نہیں لگاتا"۔

"مجھے بڑا افسوس ہے" سٹیلا نے لجاجت سے کہا" اگر میں جانتی تو ایسے سینڈوچز ہرگز نہ بناتی۔ لیکن اب تم کیا کھاؤ گے"؟

اختر نے گوشت کی تہہ کو پرت سے چھڑاتے ہوئے کہا" میں گوشت اتار کر انہیں مکھن توس سمجھ کر کھاؤں گا"۔

"نہ! نہ!!" سٹیلا نے اپنے ابرو ذرا سے سکیڑ کر کہا" یہ بہت بری بات ہے۔ تمہارے مذہب

کی رو سے تو ڈبل روٹی کا یہ ٹکڑا ابھی ویسا ہی ناپاک ہو گیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" اختر نے ہنستے ہوئے کہا۔"میں ایسا کٹر نہیں۔"

سٹیلا نے اس کی کلائی پکڑلی اور پیار سے بولی۔"تم کٹر نہیں ہو تو نہ سہی۔ لیکن میں اس معاملے میں بہت قدامت پسند ہوں۔ میں تمہیں یہ ٹکڑے ہرگز نہ کھانے دوں گی۔"

"خواہ مجھے زور کی بھوک لگی ہو۔"

"ہاں۔"

"اور خواہ میں بھوک سے مر جاؤں؟"

"ہاں۔"

"تو تمہاری مرضی۔" اختر نے دونوں ٹکڑے ڈبے میں ڈال دیئے اور سیب کا ایک ٹکڑا اٹھا کر چبانے لگا۔ سٹیلا نے پنیر کے ایک ٹکڑے کو کتر کتر کر کھانا شروع کر دیا۔ سینڈوچز کے ڈبے کو پرے دھکیل دیا۔

اختر نے کہا۔"مجھے تو بھوکوں مارا ہے اب خود بھی سینڈوچز نہیں کھاتی ہو۔"

"نہیں کھاؤں گی۔" سٹیلا نے بچوں کی طرح منہ چلاتے ہوئے کہا۔

"کیوں۔"

"میری مرضی۔"

"لیکن اس کا کوئی سبب بھی ہو۔"

"ہے ایک۔"

"کیا؟ آخر مجھے بھی تو معلوم ہو۔"

"ہمارے مذہب میں بھی یہ چیز حرام ہے۔"

"وہ کب سے؟"

"آج سے" سٹیلا نے منہ لٹکا کر کہا۔"ابھی ابھی وحی اتری ہے۔"

اس پر دونوں ہنسنے لگے۔

بارش اسی طرح ہو رہی تھی اور مینار کی سیر کرنے والے ڈیوڑھی میں رکے ہوئے تھے۔ یخ ہوا مینار کی چوٹی سے رگڑ کھا کر سیٹیاں بجانے لگی تھی اور دور دور کے چھینٹے ٹپک ٹپک کر اندر آ رہے تھے۔ سٹیلا نے سمٹ کر کہا۔

"کس قدر خراب موسم ہے۔ مجھے ایسی رات میں خواہ مخواہ کوفت ہونے لگتی ہے۔ گو مجھے لندن میں رہتے کافی عرصہ ہو گیا ہے لیکن میں یہاں کے موسم سے مانوس نہیں ہوئی اور ایسے ہی ہر گھڑی مجھے یہی احساس ہوتا رہتا ہے کہ میں اس سرزمین میں ایک نو وارد ہوں۔"

اختر نے کہا۔ "ہمارے دیس میں لوگ ایسے موسم کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ گیت گا گا کر اور دعائیں مانگ مانگ کر وہ قدرت سے ایسے موسم کو طلب کرتے ہیں اور جب آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھا جاتی ہیں اور بگلوں اور کونجوں کی سفید سفید قطاریں وائلن کے مدھم سر بجاتیں، دھواں دھار فضاؤں سے گزرتی ہیں تو ہمارے دیس کی لڑکیاں جھولا جھولتی ہیں۔ پینگیں بڑھاتی ہیں اور ملہاریں گاتی ہیں۔ کسان لوگ گیتوں کی تانیں اڑاتے ہیں اور لڑکے بالے میدانوں میں نکل کر طرح طرح کے کھیل کھیلنے لگتے ہیں۔

"تو مجھے اس دیس میں لے چلو۔" سٹیلا نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے یہ دیس ذرا بھی پسند نہیں۔ مجھے اس ملک کی کوئی چیز بھی اچھی نہیں لگتی۔ میں تمہارے وطن میں زندگی گذارنا چاہتی ہوں اور تمہارے ملک میں دفن ہونا پسند کرتی ہوں۔ مجھے وہاں لے چلو اس کے بعد میں تم سے کوئی فرمائش نہ کروں گی۔ خدا کے لیے مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔"

اختر نے کہا۔ "وہاں جا کر کیا کرو گی۔ تمہیں وہ ملک پسند نہ آئے گا۔ تم تھوڑے ہی عرصے میں گھبرا جاؤ گی اور پھر ولایت آنے کے لیے ترسنے لگو گی۔"

اختر فرش پر بیٹھ گیا اور اپنا سر سٹیلا کی گود میں رکھ دیا وہ چاکلیٹ کی ایک چھوٹی سی ٹکیا کو انگلیوں میں گھما رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "جس طرح مشرق کے رہنے والوں کو

مغرب پسند نہیں آتا اسی طرح تم کو بھی مشرق راس نہ آئے گا۔ ہم لوگ تمہیں اچھے نہ لگیں گے ہمارے رسم ورواج تمہاری نظروں میں نہ جچیں گے۔ اور تم پریشان ہو جاؤ گی۔ جیسے ہم تمہارے دیس کے لیے پیدا نہیں ہوئے تم بھی ہمارے ملک کے لیے وجود میں نہیں آئی ہو۔"

سٹیلا نے اپنی کہنیاں فرش پر جاکر سر پیچھے ڈال دیا اور کہا۔

"میں نے مغرب میں جنم ضرور لیا ہے۔ لیکن میں مشرقی ہوں۔ میرا وجود لندن میں رہتا ہے۔ لیکن میرا جی ہندوستان میں بستا ہے اور میں اپنے ذہن اور وجود کے درمیان خارجی حالات کو اور زیادہ دیر تک حائل دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں کبھی شکایت نہ کروں گی۔ تم میرے ساتھ رہو گے تو میں کچے گھر میں رہ لوں گی۔ برتن صاف کیا کروں گی۔ کھانا پکاؤں گی۔ کپڑے دھویا کروں گی اور میں تمہیں یقین دلاتی ہوں اختر کہ میں بہت جلد اردو سیکھ لوں گی اور چند ہی دنوں میں تمہاری معاشرت سے مانوس ہو جاؤں گی اور اگر مجبوراً ہمیں تمہارے رشتہ داروں سے دور جاکر دیہاتی زندگی بھی بسر کرنی پڑے تو مجھے فصل بونے چارہ کاٹنے اور نلائی کرنے سے بھی عار نہ ہوگی۔ میں صبح اٹھ کر گائیں دوہا کروں گی۔ مرغیوں کو دانہ ڈالا کروں گی اور اپنے ہاتھوں سے چھاچھ بلو کر مکھن نکالا کروں گی۔ بہت ممکن ہے کبھی جاگتے میں مجھے اپنے پیرس کے اپنی درسگاہوں کے اپنی سہیلیوں کے خواب دکھائی دے جائیں لیکن میں وعدہ کرتی ہوں کہ ان سے متعلق تم میری زبان سے ایک فقرہ بھی نہ سن پاؤ گے اور مجھے اپنے آپ پر پورا بھروسہ ہے۔ بولو مجھے ساتھ لے جاؤ گے۔ اپنے ساتھ رکھو گے۔ اپنے دیس میں مرنے دو گے؟ بولو اختر!

بارش ہوتی رہی۔ اندھیرا سمٹتا رہا، پھیلتا رہا اور تاجر خاندان کا آئی۔ سی۔ ایس ہونے والا نونہال زرخیز کھیتوں اور ناگوری بیلوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ گائیں ڈکرا رہی تھیں۔ بادل گرج رہا تھا۔ ریوڑ کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ چرواہے گاتے چلے آرہے تھے۔ کلیسا کی محرابوں میں کانسی کی گونج ڈوب رہی تھی اور حمد کے دھیمے دھیمے سر بلند ہو رہے تھے۔ یوروشلم کے گڈریے کے سامنے یورپ گھٹنے ٹیک کر اس کے گن گائے جاتا تھا۔

اختر کا کمرہ بند ہو گیا تھا اور اس نے ہر ایک سے ملنا ترک کر دیا تھا۔ شفیع کو اس کے کمرے میں دن میں ایک بار آنے کی اجازت تھی اور وہ بھی پندرہ منٹ کے لیے گلیکسو بسکٹ کے بہت سے ڈبے پلنگ کے نیچے رکھ لیے گئے تھے اور گاڑھے دودھ کا ایک ڈبہ تھوڑا سا کھول کر میز پر ڈال دیا گیا تھا۔ رات کا کھانا موقوف ہو گیا اور دن کے وقت ناشتے کے بجائے سوکھے بسکٹ چبائے جاتے اور گاڑھے دودھ کو شہد کی طرح چاٹا جاتا۔ پڑھتے پڑھتے اختر کو اگر کبھی شدت کی بھوک محسوس ہوتی تو وہ پلنگ کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک بسکٹ نکالتا اور تکیہ کا سہارا لیے کتاب پر نگاہیں جمائے بسکٹ کر کنے لگتا۔ اس نظر بندی کے چوتھے دن دوپہر کے وقت اختر کو ایستھر کا تار ملا۔

"اختر تم آتے ہو کہ نہیں؟"

اختر نے شفیع کو یہ بتائے بغیر تار گھر جاکر ایستھر کو ایکسپریس ٹیلیگرام بھیج دیا۔

"ابھی نہیں آسکتا۔ پچیس دن اور انتظار کرو۔"

شفیع نے اختر کی اس جرأت پر خوش ہو کر اسے گلے سے لگا لیا اور پیٹھ ٹھونک کر کہا۔

"شاباش بیٹا دنیا میں ایک کام تو کیا ہم تم سے بہت خوش ہیں۔ بولو کیا مانگتے ہو۔"

اختر نے سیس نوا کر کہا۔ "گرو جی! آپ کی اور پرماتا کی دیا سے بڑے آنند سے ہوں۔ اس سمے کوئی اچھیا من میں نہیں جب ہو گی بنتی کروں گا۔"

اختر یہ نام کر کے اپنے کمرے میں آگیا۔

تکیئے کا سہارا لیے کتاب پر نگاہیں گاڑے اختر جب ایک فقرے سے دوسرے کی طرف بڑھتا تو وہ بھی ایستھر کے تار کا مضمون بن جاتا۔ سگرٹوں کی ڈبیا ختم ہو گئی۔ گلیکسو بسکٹ ایک ایک کر کے ٹھکانے لگ گئے۔ کتابوں پر کتابیں بدل گئیں۔ لیکن ان کے نفس مضمون میں تبدیلی نہ ہوئی۔ تاریخ، فلسفہ، فارسی، انگریزی ہر کتاب سمٹ کر ایک فقرے میں محدود ہو گئی۔

"اختر تم آتے ہو کہ نہیں؟"

اس نے پھر کپڑے تبدیل کیے۔ الیسٹھر کے تار کو جیب میں رکھا اپنے تار کی رسید پھاڑ دی اور ٹیکسی لے کر تھامس کک پہنچ گیا اور اگلے دوپہر کے طیارے سے میونخ کیلئے ایک سیٹ مل گئی۔

اگلے دن اختر اور شفیع لندن ایئر ڈروم کے ریسٹوران میں چائے پی رہے تھے تو اختر نے اپنا سگریٹ ایش ٹرے میں رکھ کر ہاتھ جوڑ کے کہا۔

"گورو جی! بڑا کشٹ مجھ پر آیا ہے۔ میری سہاتیا کیجیے۔ آپ نے وچن دیا تھا پورا کیجیے۔"

شفیع نے جل کر کہا: "بکواس نہ کر سیدھی طرح بتا۔"

اختر نے ہوائی سفر کا تھیلا کھولا اور اپنا پیڈ نکال کر کاغذوں کے نیچے اپنے دستخط کرتے ہوئے کہا۔

"یار اگر گھر سے میرے نام کوئی خط آئے تو ان پر اس کا جواب لکھ دینا کہ اختر چونکہ پڑھائی میں مصروف ہے اس لیے خطوط نویسی میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔"

"اور اگر سعیدہ لکھے کہ جواب مختصر دو لیکن اپنے ہاتھ سے دو تو میں کیا لکھوں۔"

"وہ کبھی بھی ایسے نہیں لکھے گی۔" اختر نے قلم روک کر کہا: "یار وہ بڑی بھولی ہے۔ اسے تو بس میری خیریت ہی مطلوب ہوتی ہے۔ خواہ وہ تمہاری وساطت سے معلوم ہو یا اخبار سے یا میرے اپنے خط سے۔"

"فرض کرو وہ نہ مانے۔" شفیع نے پوچھا۔

"تو تم جواب نہ دینا۔" اختر نے دستخط کرتے ہوئے کہا: "خط رکھ چھوڑنا میں آکر خود جواب لکھ دوں گا۔"

شفیع نے پیڈ لے کر دو تین صفحوں کو دیکھا اور نظریں اٹھائے بغیر پوچھا: "اور مجھے تو لکھتے رہو گے نا؟"

"کمال کرتے ہو یار۔" اختر نے ہنس کر کہا: "میں لام پر تو نہیں جا رہا۔ چاچا ایک ہفتے میں لوٹ آؤں گا۔"

شفیع خاموش ہو گیا اور دونوں چائے پینے لگے۔

ٹیکسی ڈرائنگ سٹرا سے پر جا کر رکی - سڑک سے دو سیڑھیاں اونچی ایک پرانی وضع کی حویلی ایستادہ تھی - اختر نے انگلی کے اشارے سے پوچھا کہ یہی وہ مقام ہے تو ڈرائیور نے کرخت زبان کو نرم لہجے میں ادا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سر کے اشارے سے کہا ہاں یہی ہے - اختر نے برآمدے میں داخل ہو کر فرش کی گھسی ہوئی سلوں کو دیکھا اور گھنٹی تلاش کرنے لگا - بغلی کمرے کے باہر ایستھر کے نام کی ایک چھوٹی سی تختی لٹک رہی تھی - اس نے دستک دیئے بغیر دروازے کو آہستہ سے کھولا اور گربہ پائی سے اندر داخل ہو گیا - ایستھر جمائی لے کر بستر سے اٹھی اور آنکھیں کھولے بغیر اپنا ہاتھ بڑھا کر بولی: "اختر"

اختر نے لپک کر ایستھر کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اس کے لبوں کو بوسہ دے کر کہا -

"ٹیکسی باہر کھڑی ہے - اور میرا سامان بھی اسی میں ہے"۔ ایستھر سلیپر پہن کر کھڑی ہو گئی اور بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے باہر آ گئی - ٹیکسی ڈرائیور نے بڑے ادب سے اسے سلام کیا اور سامان باہر نکالنے لگا - اٹیچی کیس اٹھاتے ہوئے اس نے اختر سے کہا -

"دیکھتے کیا ہو اپنا بکس اٹھاؤ - یہ لندن نہیں میونخ ہے اور یہاں پورٹر نہیں ہوتے"

اختر نے بیگ کندھے سے لٹکایا اور بکس اٹھا کر اس کے پیچھے چلنے لگا - کمرے میں داخل ہوتے ہوتے ایستھر نے کہا -

"تم نے تار دے کر خواہ مخواہ پیسے ضائع کئے - مجھے معلوم تھا کہ تم آ رہے ہو - اور

تمہیں معلوم تھا کہ تم رہ نہیں سکو گے تو پھر تم نے تار کیوں دیا۔"

"کیا بات ہے۔" اختر نے بیگ اتارتے ہوئے کہا: "چھوٹتے ہی اولیاؤں والی باتیں شروع کر دیں۔ شکر ہے کوئی پیغمبر جرمنی میں پیدا نہیں ہوا۔ ورنہ خدا جانے تم اور کس قسم کے دعوے کرتیں۔"

ایستھر مسکراتے ہوئے پلنگ پر بیٹھ گئی اور اپنا جوڑا کھول کر پھر باندھنے لگی۔

اختر نے کہا: "کیوں تکلف کرتی ہو۔ بال لمبے نہیں تو کیوں خواہ مخواہ بل دیے جاتی ہو۔ ہندوستانی لڑکی بننا کچھ ایسا آسان بھی نہیں۔"

ایستھر نے اسی طرح بل دیتے ہوئے پوچھا: "راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"کوئی خاص نہیں۔"

"اور ہمارا گھر آسانی سے مل گیا تھا؟"

"ہاں تمہارا گھر تو آسانی سے مل گیا تھا۔ لیکن۔۔۔۔"

"لیکن کیا؟"

"لیکن تم آسانی سے نہیں ملیں۔"

"کیوں؟"

"کیوں کیا۔" اختر نے انداز محبوبی سے کہا: "میں کتنی دیر تمہارے پلنگ کے پاس کھڑا یہ سوچتا رہا کہ تمہیں جگاؤں یا سونے دوں۔"

"ہونہہ۔" ایستھر نے مسکرا کر کہا: "مجھے تم کیا جگاؤ گے۔"

اختر نے پوچھا: "لیکن تم یہ سرشام سو کیوں گئیں۔"

"بس یونہی۔" ایستھر نے پوری آنکھیں کھول کر جواب دیا: "مجھے نیند آ رہی تھی میں سو گئی۔"

اختر نے کہا: "میری جان تم تو مزے سے سویا کرتی ہو اور ہم رات رات بھر انگاروں پر لوٹا کرتے ہیں۔"

"شاباش"۔ الیستھر نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم بڑے فرمانبردار ہو۔ اچھا اب اٹھو تمہیں اپنی امّی اور خالہ سے ملاؤں۔"

ایک بڑے کمرے میں الیستھر کی ماں اور اس کی خالہ شطرنج کھیل رہی تھیں۔ اور ان کے پاس ایک الیشن کتا اگلی ٹانگوں پر تھوتھنی رکھے آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ قدموں کی چاپ سن کر اس نے آنکھیں کھولیں اور الیستھر کے ساتھ ایک اجنبی کو داخل ہوتے دیکھ کر تن کر کھڑا ہو گیا۔ الیستھر نے جرمن میں اسے کچھ کہا اور وہ دم ہلاتا ہوا ان کے پاس آ گیا۔ الیستھر کی آواز سن کر شطرنج کھیلتی ہوئی عورتوں نے گردنیں موڑ کر ادھر دیکھا اور بساط چھوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ الیستھر نے مسکراتے ہوئے اپنی زبان میں اختر کا تعارف ان سے کرایا اور جب اختر نے جھک کر انہیں سلام کیا تو خالہ نے الیستھر کو مخاطب کر کے کچھ کہا۔ الیستھر نے ہنستے ہوئے اختر سے کہا۔

"میری خالہ کہہ رہی ہیں کہ ان کا تصور تمہارے متعلق بڑا عجیب سا تھا کہ سر پر ایک بڑا سا پگڑ باندھے۔ زمرد کی کلغی لگائے بڑی بڑی مونچھوں والا ایک سیاہ فام آدمی اندر داخل ہو گا۔ جس کے پیچھے ڈفلیاں بجانے والی لڑکیاں ہوں گی اور چیتے کی کھالیں بغل میں دبائے بہت سے لوگ اور گرد ہوں گے اور وہ پرنام کر تا منتر جپتا ایک کونے میں آسن جما کر بیٹھ جائے گا!"

اختر نے جواب دیا۔ "پتہ نہیں ہندوستانیوں کی بود و باش کے متعلق تم لوگوں کے شکوک کب رفع ہوں گے۔ ہم بھی تو تمہاری طرح کے انسان ہیں اور بقول ہٹلر تم بھی تو آرین ہو۔"

الیستھر نے بھنویں سکیڑ کر کہا: "اس منحوس کا نام نہ لو مجھے وہ زہر لگتا ہے۔"

"اس لیے کہ اس نے قیصر کے مداحوں کی جاگیریں ضبط کر لی ہیں۔" اختر نے پوچھا۔

"صرف اس لیے نہیں۔ بلکہ اس کی اور بھی بہت سی وجوہ ہیں۔"

اختر ہنس پڑا اور سر ہلا کر کہنے لگا: "چاہے کچھ بھی سمجھو لیکن اس سے نفرت کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ ہٹلر کے دورِ حکومت میں تمہارے کھیت بحق نازی سرکار ضبط ہو چکے ہیں اور ....."

"چلو یونہی سہی۔" الیستھر نے چڑ کر کہا: "لیکن تم کیا اس کے سگے ہو جو ایسی ہمدردی جتا

بیے ہو۔"

"اختر نے کہا: "افسوس تو یہی ہے کہ میں ہٹلر کا سگا نہیں۔ ورنہ اس کی شان میں ایسی گستاخی کا ہرگز متحمل نہ ہوتا۔"

ہٹلر کا لفظ سن کر دونوں عورتیں غور سے ان کی گفتگو سننے لگی تھیں اور جب اختر نے دوبارہ اس کا نام لیا تو الیستھر کی ماں نے اپنی بیٹی سے جرمن میں سوال کیا جس کا مختصر سا جواب دے کر الیستھر نے اختر سے کہا۔

"چلو اوپر تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دوں۔"

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اختر نے پوچھا: "تمہاری امی کیا کہہ رہی تھیں۔"

"کچھ بھی نہیں۔" الیستھر نے جواب دیا۔

"ضرور کچھ ہے۔" اختر نے کہا: "بات کرتے ہوئے ان کے تیور کڑے پڑتے تھے۔"

الیستھر نے کہا: "ایمان سے تمہارے متعلق نہیں پوچھ رہی تھیں۔"

"کوئی بات نہیں۔" اختر بولا: "ہم بھی جلد ہی یہ آغ ناغ شرخنک سیکھ لیں گے۔"

کمرے میں داخل ہو کر الیستھر نے مدہم سا بلب روشن کر دیا اور پلنگ کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

"آج کی رات یہ پلنگ تمہارا ہے اور اس کمرے کی ہر چیز تمہاری ہے۔"

"اور کل؟" اختر نے پوچھا۔

"کل میں تمہارے لیے کہیں بندوبست کر دوں گی۔" الیستھر نے اس کی طرف گھوم کر کہا۔

"امید ہے اکیڈمی میں تمہیں ایک کمرہ مل جائے گا۔"

"تو گویا میں تمہارے ساتھ یہاں نہیں رہوں گا۔"

"یہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔" الیستھر نے سر ہلایا: "ہمارے یہاں یہ رواج نہیں۔ مہمان یا تو ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں یا انہیں.....

بڑے بے مروت لوگ ہو تم " اختر نے رنجیدہ ہو کر کہا۔ دور دراز کے مہمانوں سے بھی یہ سلوک کرتے ہو تو اچھا نہیں کرتے "

ایستھر نے کوئی جواب نہ دیا اور بستر ٹھیک کرنے لگی۔

یہ پرانی وضع کا ایک لمبا سا کمرہ تھا جس کی اونچی کھڑکیاں باہر سڑک کی طرف کھلتی تھیں۔ اور ان کی چوکھٹوں پر پیتل منڈھا ہوا تھا۔ اندر کمرے کی دیواروں سے بھاری بھاری زرہیں لٹک رہی تھیں اور لکڑی کے کارنسوں پر زنگ آلود خود پڑے تھے۔ کھڑکیوں کے درمیان ایستھر کے آباؤ اجداد کی قد آدم روغنی تصویریں آویزاں تھیں۔ جن کا روغن جگہ جگہ سے اکھڑ گیا تھا اور خدوخال دھندلے پڑ گئے تھے۔ ان تصویروں کے دائیں بائیں قدیم طرز کی دو دھاری تلواریں لٹک رہی تھیں۔ جنہوں نے قیصر کی حمایت میں لاکھوں انسانوں کے کلیجے چاٹے تھے اور ہزاروں کا خون پیا تھا اور اب سالہا سال سے بیکار پڑی تھیں۔ ایستھر نے ایک آبنوسی الماری کا پٹ کھولا اور پلٹ کر کہا۔

میں نے تمہارے لیے موم بتیوں کا ایک بنڈل منگوا رکھا ہے۔ تم کمرے میں موم بتی جلا کر سونے کے عادی ہو نا؟"

" ہوں " اختر نے آہستہ سے کہا اور ہولے ہولے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ ایستھر نے بنڈل آگے بڑھاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور اختر بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔ ایستھر کا سر پیچھے جھک گیا۔ اس کے بازو ڈھیلے ہو کر ٹوٹی ہوئی ڈالیوں کی طرف لٹک گئے۔ ہاتھ کی گرفت ماند پڑتی گئی اور موم بتیوں کا بنڈل فرش پر گر پڑا۔ وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔

" میں نے تمہارا کتنا انتظار کیا۔ کتنی مرتبہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر میں اپنی کھڑکی سے تمہاری راہ تکتی رہی مگر تم نہ آئے۔ سب بے وفا محبوب کی طرح مجھے ستاتے رہے۔ بھیانک خوابوں کی طرح مجھے بے چین کرتے رہے۔ ہر گھڑی مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ تم سائیکل پر سوار ہو کر ہمارے

یہاں آئے ہو اور ایک پاؤں ہماری سیڑھیوں پر رکھ کر سائیکل پر بیٹھے بیٹھے گھنٹی بجا رہے ہو۔ میں دبے پاؤں کمرے سے باہر نکلتی لیکن سیڑھیوں کے پاس کوئی بھی نہ ہوتا اور گھنٹی اسی طرح بجتی رہتی بتاؤ تم سچ مچ کیوں نہ آئے۔ میرے بلائے بغیر کیوں نہ چلے؟" اچانک اس کا لہجہ بدل گیا اور اس نے اختر کے بازو اپنی انگلیوں میں جکڑ کر کہا "لیکن تم کیوں آئے۔ میں نے کہا تھا کہ اگر بلاؤں تو بھی نہ آنا۔ اگر میں لکھوں تو بھی نہ چلنا۔ پر تم نے میری بات نہ مانی۔ جتنے اچھے تم مجھے لگتے ہو اگر اتنی ہی اچھی تمہیں میں بھی لگتی تو تم کبھی میری بات نہ ٹالتے۔ کبھی یہاں نہ آتے۔ لیکن میں تمہیں اچھی نہیں لگتی۔ تمہیں مجھ سے پیار نہیں۔ ایستھر سے تمہیں محبت نہیں۔ تمہیں تو اپنے آپ سے پیار ہے اور تم اپنے آپ سے ملنے یہاں آئے ہو" پھر اس نے اختر کو پرے دھکیلتے ہوئے کہا "جاؤ یہاں سے جلد چلے جاؤ۔ میرا دیس چھوڑ دو۔ میونخ چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو۔ خدا کے لیے اختر آج ہی یہاں سے چلے جاؤ۔ ابھی چلے جاؤ۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو یہ گھر روحوں کی آماجگاہ بن جائے گا۔ بھوتوں کا مسکن بن جائے گا اور لوگ اس آسیب زدہ مکان کے قریب سے بھی نہ گذرا کریں گے۔

اختر نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کا شانہ تھپکنے لگا۔

اگلے دن اختر کو بنک سے ملحقہ ایک عمارت میں کمرہ دلوا دیا گیا اور وہ اپنی چند کتابوں سمیت اس کمرے میں براجمان ہو گیا۔ دو بجے تک ایستھر اکیڈیمی میں رہتی اس کے بعد سیدھی اس کے یہاں آتی۔ شام کی چائے اور کھانا اختر ان کے یہاں کھاتا اور پھر اپنے کمرے میں آ کر سو رہتا دو چار دن تک تو اختر اپنی کتابیں پڑھتا رہا لیکن اس کے بعد اس نے جرمن زبان سیکھنی شروع کر دی اور بلاناغہ ایستھر سے سبق لینے لگا۔ شام کو چار بجے چائے سے فارغ ہو کر ایستھر کی ماں اور خالہ بساط لے کر بیٹھ جاتیں اور اختر باری باری ان کے ساتھ شطرنج کی بازیاں کھیلتا رہتا۔ ایک آدھ گھنٹہ ایستھر بھی ان کے پاس بیٹھی لیکن پھر ناک بھوں چڑھا کر اپنے کمرے میں چلی آتی اور اندر سے دروازہ بند کر کے شام کے کھانے تک وہیں بند رہتی۔ گونگے اور بہرے کھلاڑیوں کی یہ چوکڑی شطرنج میں کچھ اس طرح مصروف ہو جاتی کہ انہیں دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی۔ حتےٰ کہ ملازمہ گھنٹی بجاتی

اور وہ مہروں کی ترتیب نگاہوں میں بھانپ کر کھانے کے کمرے میں چلے آتے۔ الیستھر منہ پھیلائے ہونٹ لٹکائے کھانے کی پلیٹیں ادھر ادھر سرکاتی رہتی اور جب اختر اس سے کوئی سوال کرتا تو وہ بڑے تحمل سے کہتی۔

"تم شطرنج کھیلے جاؤ۔ مات دو اور مات کھاؤ۔ تمہیں ان باتوں سے مطلب"۔ اور وہ چپکا ہو جاتا۔ اختر نے دراصل بڑی بوڑھیوں کی حمایت حاصل کرنے اور ان پر اچھا اثر چھوڑنے کے لیے شطرنج شروع کی تھی ورنہ اسے اس کھیل سے کچھ ایسی دلچسپی نہ تھی۔ چال چلتے ہوئے وہ ہمیشہ الیستھر کے متعلق سوچتا رہتا کہ اب اس نے کتاب اٹھائی ہوگی ورق پلٹا ہوگا۔ بلاٹنگ پیپر پر پنسل سے ایک منی سی تصویر بنائی ہوگی اور اب اپنا جوڑا پھر باندھا ہوگا۔ یہ سوچتے ہوئے وہ فیل اٹھا کر گھوڑے کی چال چل دیتا جس پر الیستھر کی ماں یا خالہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ٹوک دیتیں لیکن یہ کھیل بہت جلد ختم ہوگیا جب ایک دن ہزار تلاش کے باوجود مہروں کا ڈبہ اور بساط کہیں نہ مل سکی اس دن اختر بڑی دیر تک الیستھر سے باتیں کرتا رہا اور اگلے دن کا سبق بھی وہیں لے لیا۔ دوسرے روز دوپہر کو اکیڈمی سے لوٹتے ہوئے جب الیستھر اس سے ملی تو ہنس کر پوچھنے لگی۔

"میری جان آج شطرنج کی بازی نہیں ہوگی؟"

اختر نے منہ لٹکا کر کہا: "بساط اور مہرے ہی گم ہو گئے۔ کھیلیں کیسے ــــ نئی بساط آئے گی تو دیکھا جائے گا"۔

الیستھر نے تنک کر کہا: "آنے دو نئی بساط۔ وہ بھی کیا بھٹی میں نہ جھونکی جائے گی"۔

"بھٹی میں"۔ اختر نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں"۔ الیستھر نے جواب دیا "تمہاری پہلی بساط اور مہرے میں نے ہی کچن کی بھٹی میں ڈالے تھے اور آئندہ جتنی بساطیں آئیں گی ان کا حشر بھی یہی ہوگا۔"

اختر نے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا: "تمہیں میرا کھیلنا برا لگتا ہے؟"

"سخت بڑا" ایستھر نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔ "تمہیں گھنٹوں کھیل میں مصروف دیکھ کر میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں گولی مار دوں۔"

اختر نے مسکرا کر پوچھا: "پھر گولی ماری کیوں نہ؟"

"گولی!" ایستھر نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ "تمہیں تو بھول بھی نہیں مارا جا سکتا میرے چاند۔"

اس دوپہر کو انہوں نے گھر ٹیلیفون کر دیا کہ آج چونکہ ہم پکچر دیکھنے جا رہے ہیں اس لیے شام کی چائے پر ہمارا انتظار نہ کیا جائے لیکن پکچر جانے کے بجائے ایستھر اسے اینکشٹ گارڈن لے گئی۔ میوزم کے چاروں طرف چکر کاٹتا ہوا یہ باغ مالٹے، سنگترے اور گریپ فروٹ کے پودوں سے پٹا پڑا تھا۔ پودوں کے درمیان مخملی گھاس کی کشادہ شاہراہ باغ کے بیچوں بیچ چل رہی تھی اور اس کا سلسلہ کہیں ختم نہ ہوتا تھا۔ سرو کے مخروطی پیڑوں نے چھوٹی چھوٹی جھیلوں کو گھیر رکھا تھا جن میں پر فیخ ٹیلیں سفید راج ہنس اور سیاہ بطخیں تیر رہی تھیں۔ ایستھر نے اختر کے بازو کا سہارا لے کر پوچھا۔

"تمہیں یہ باغ پسند ہے؟"

"بہت"۔ اختر نے اس کی طرف جھک کر کہا۔

"تو آؤ، تھوڑی دیر کے لیے اس جھیل کے کنارے بیٹھیں اور ان جانوروں کا نظارہ کریں۔"

راج ہنس پانی میں اپنی گردن ڈبو کر خوراک تلاش کر رہے تھے اور ان کے سفید سفید دھڑ کنول کے ادھ کھلے پھولوں کی طرح ادھر ادھر تیر رہے تھے۔ سیاہ بطخیں گردنوں کے پھن اٹھائے شفاف پانی پر پیرتے ہوئے مدھم مدھم لہریں پیدا کر رہی ہیں اور ٹیلیں ان دو انسانوں کو کنارے پر اس طرح بیٹھے دیکھ کر اگلی جانب کھسک گئی تھیں۔ ایستھر بظاہر جھیل کی طرف

دیکھ رہی تھی۔ لیکن اس کی نگاہیں تخئیل کی چناروں بھری وادی سے پار ہو کر ایسے مقام پر پہنچ گئی تھیں جہاں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اختر پتلی پتلی گھاس کے تین ستواں پودوں کو اکھاڑے بغیر چوٹی کی طرح گوندھ رہا تھا۔ جوں ہی وہ سرسبز پتیوں کی آخری نوک گوندھ کر چھوڑتا تینوں پودے ذرا کسما کر علیٰحدہ علیٰحدہ ہو جاتے اور وہ فوراً نئے سرے سے مشاطگی شروع کر دیتا۔ ایک مرتبہ اس نے اپنے ہاتھ سے سعیدہ کے بالوں میں کنگھی کی تھی اور پھر خود ہی انہیں گوندھ کر ان میں گوٹے کے گول چکروں والا مُوباف ڈالا تھا۔ جو سر کی ذرا سی جنبش سے جھم جھم چمکتا تھا۔ لیکن آج گھاس کے یہ ہرے ہرے تنکے قابو میں نہیں آ رہے تھے اور کھل کھل جاتے تھے۔ ایستھر نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"آج سے پورے دو سال ادھر کی بات ہے کارل مجھ سے آخری مرتبہ یہیں ملا تھا اور ہم شام گئے تک اسی جھیل کے کنارے یوں بیٹھے رہے تھے جیسے ہمیں بولنا نہ آتا ہو۔ میرے لیے وہ بڑی اندوہناک شام تھی۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ زمین پھٹ گئی ہے اور میں اس کی دراڑ میں اترتی چلی جا رہی ہوں۔ میرا دم گھٹ رہا ہے آنکھیں ابلی پڑتی ہیں۔ میں چیخنا چاہتی ہوں اور چیخ نہیں سکتی دیوار کا سہارا لے کر رکنا چاہتی ہوں اور میرے پوٹے پھٹے جاتے ہیں۔ ناخن اکھڑ جاتے ہیں اور دونوں ہاتھ خوناخون ہو جاتے ہیں۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اختر کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھاتے ہوئے کہا "اس کے بعد کارل مجھے نہیں ملا۔ اور نہ ہی اب وہ مجھے کبھی مل سکے گا۔"

آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اور ہری ہری گھاس کو روندتے ہوئے وہ آگے پیچھے چل رہے تھے۔ سارے باغ پر خاموشی چھا رہی تھی۔ رات کی تاریکی پھیلنے لگی تھی اور درختوں کی چوٹیاں مٹیالے دھندلکوں میں تحلیل ہوتی جا رہی تھیں۔ سنگترے کے ایک گھنے پیڑ کے پاس رک کر ایستھر نے کہا۔

"اس پیڑ کے نیچے ہم آخری بار ملے۔ میں نے اسے الوداعی بوسہ دیا اور سویٹ پیز کا

ایک پھول اس کے کالر میں لگا دیا۔ کارل کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں ۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر بول نہ سکتا تھا۔ وہ میرے سامنے دوزانو ہونا چاہتا تھا اور اس کی ٹانگیں اس کا کہا نہیں مان رہی تھیں۔ میں نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔ میں کیا کروں کارل مجھ سے بے ایمانی نہیں ہوتی جھوٹ نہیں بولا جاتا اور میں تم ایسے انسان کو دھوکا نہیں دینا چاہتی۔ میں نے راتیں جاگ جاگ کر تم سے محبت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن میں ناکام رہی۔ میں نے تمہاری تصویر کے سامنے جھک کر کئی مرتبہ اپنی محبت کا اعتراف کیا لیکن میرے دل نے گواہی نہ دی میں نے چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے کئی مرتبہ اپنے آپ کو سمجھایا مگر میرا دل نہیں مانا۔ میں تمہیں فریب دینا نہیں چاہتی۔ بہروپ بھر کر تمہارے سامنے آنا نہیں چاہتی۔ مجھے تم سے محبت نہیں ہوتی کارل میں کیا کروں۔ مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں، کارل میری باتوں کا جواب دیئے بغیر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے چلا گیا۔ میں اس پیڑ کے نیچے بیٹھ کر اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی حتیٰ کہ میرے آنسوؤں نے جلد ہی اس کا وجود بھی دھندلا دیا۔ اس نے گھر جا کر پستول سے خودکشی کر لی۔ مجھے پتہ ہے کہ اب وہ مجھے کبھی بھی نہ مل سکے گا۔ میں عمر بھر اس کی صورت نہ دیکھ سکوں گی۔ اس کی حسرت ناک موت نے میری زندگی کو کئی سال آگے دھکیل دیا لیکن مجھے اس سے اب بھی محبت نہیں ہوئی۔ مجھے اس پر اب بھی رحم نہیں آتا۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔" ایستھر نے اختر کے کندھے پر سر رکھ دیا اور کہنے لگی "بتاؤ نا مجھے کیا ہو گیا ہے۔ کس چیز نے مجھے اس درجہ سنگدل بنا دیا ہے اور وہ کونسا خمیر ہے جو مجھے ایسا کٹھور کر گیا ہے۔ بولو نا اختر میں کون ہوں کیا ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہیئے۔"

لیکن اختر اسی طرح خاموش کھڑا رہا اور اس نے ایستھر کو تھپکنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ ایستھر نے اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ کر کہا۔

"تم بھی مجھے چھوڑ دو گے اور ایک دن مجھ سے منہ موڑ کر وائیلڈ لینڈ چلے جاؤ گے۔ جہاں کے لوگ زہریلے سانپ پکڑتے ہیں۔ ہاتھی کی سواری کرتے ہیں اور مہینہ مہینہ مورتیوں کے آگے سرنگوں رہتے ہیں۔ لیکن تم کیوں جاؤ گے۔ کہاں جاؤ گے اور کس لیے جاؤ گے۔

ہندوستان تمہارے قابل نہیں۔ تمہارا دیس تمہارے لیے اجنبی ہے۔ تمہارے وطن کے بسیرے تم سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ تم میرے ساتھ رہو۔ میونک میں بسو اور جرمنی کے باشندے بن جاؤ۔ ہم اکٹھے رہیں گے۔ نئے نئے مقالے لکھا کریں۔ بحثیں کریں گے اور شام کے وقت ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اس دیس کی سڑکوں پر گھوما کریں گے۔ سارا میونخ ہمیں دیکھا کرے گا اور ہم ایک دوسرے کو دیکھا کریں گے۔"

اختر نے اس کے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"مجھے منظور ہے۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ زندگی بھر ہم ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑیں گے اور مر کر بھی اکٹھے ہی رہیں گے۔ مجھے جرمنی پسند ہے۔ میونک پسند ہے۔ تم پسند ہو۔ مجھے اپنے دیس سے ذرا بھی محبت نہیں۔ وائیلڈ لینڈ سے رتی بھر دلچسپی نہیں۔ میں تو تمہارے ساتھ میونخ میں رہنا چاہتا ہوں۔ بولو مجھ سے شادی کرو گی؟"

ایستھر نے چونک کر اختر کو پرے دھکیل دیا اور اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔

"میں تم سے شادی نہیں کروں گی اختر! تم سے شادی نہیں کروں گی۔ اگر تم میرے ساتھ رہے تو میرا کوئی ہم وطن تمہیں مجھ سے چھین لے گا۔ اور میں تمہارے ہوتے ہوئے اکیلی رہ جاؤں گی اور اور میونخ کی ساری سڑکیں ویران ہو جائیں گی۔ انگلشے گارٹن اجڑ جائے گا اور میں بھٹکی ہوئی روح کی طرح ہر بستی میں گھوم کر اسے خراب آباد بنا دوں گی ــــ میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔ تمہیں واپس جانا ہو گا۔ اپنے دیس کا سفر اختیار کرنا ہو گا۔ وائیلڈ لینڈ میں زندگی بسر کرنی ہو گی۔ محبت بُری چیز ہے اور شادی تو اس سے بھی بری ہے۔ میں تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ تمہیں تکلیف میں ڈالنا نہیں چاہتی۔ تم مجھے بڑے اچھے لگتے ہو۔ بہت ہی اچھے۔ اگر تمہارا حشر بھی کارل کا سا ہوا تو میں کیا کروں گی۔ تم آج ہی لوٹ جاؤ۔ لندن کی بجائے ہندوستان چلے جاؤ۔ پھر مجھے اطمینان ہو جائے گا۔ قرار آ جائے گا اور میں تمہیں کبھی یاد نہ کروں گی۔ بولو آج ہی چلے جاؤ گے نا؟"

اختر نے ہنس کر اس کا سر اسی طرح سہلاتے ہوئے کہا۔

"پتہ نہیں بعض اوقات تمہیں کیا ہو جاتا ہے۔ عجیب سی باتیں کرنے لگتی ہو۔"

شفیع کا تار آیا کہ تم ایک ہفتے کے لیے گئے تھے لیکن آج بارہ دن ہو گئے اور تمہاری واپسی کی کوئی خبر نہیں۔ اختر نے اسے ایک مفصل خط لکھ کر بھیجا کہ میں ہر روز آنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن آ نہیں پاتا۔ میونخ بہت بڑا ہی دلچسپ شہر ہے اور یہاں کی اکیڈمی تو اتنی پیاری ہے کہ طالب علم امتحان پاس کرنے کے بعد بھی اسے چھوڑنا پسند نہیں کرتے اور ریسرچ کا کام شروع کر دیتے ہیں۔ میں بھی دن بھر اسی اکیڈمی میں گھومتا رہتا ہوں۔ جرمن زبان سیکھ رہا ہوں اور اب مجھے تھوڑی شد بد ہو گئی ہے۔ پوسٹر پڑھ کر مطلب سمجھ لیتا ہوں اور اخبار کی سرخیاں دیکھ کر خبر کا اندازہ لگا لیتا ہوں۔ ایستھر تو مجھے ہر روز جانے کو کہتی ہے پر میں چند دن اور یہاں گذارنا چاہتا ہوں تم فکر نہ کرنا پڑھائی جاری ہے اس شدت سے تو نہیں لیکن پھر بھی امید ہے کہ پاس ہو جاؤں گا اور تم سے زیادہ نمبر حاصل کر لوں گا۔ اگر سعیدہ کا کوئی خط تمہارے یا میرے نام آیا تو مجھے بھیج دینا اور کسی خط کی ضرورت نہیں۔ اور بنک والوں کو میرا یہاں کا پتہ دے دینا تاکہ اس ماہ کی رقم مجھے میونخ پہنچ جائے، اس خط کے ساتھ اختر نے شفیع کو سعیدہ کے نام بھی ایک چھٹی روانہ کی تاکہ وہ لندن کے کسی ڈاک خانے سے سپرد ڈاک کر دی جائے اور کم از کم چچا کے گھر میں کسی کو اختر کے لندن سے باہر جانے کا علم نہ ہو۔

اختر کے میونخ روانہ ہو جانے کے دو دن بعد سٹیلا اس سے ملنے آئی۔ شفیع نے بتایا کہ وہ چند دنوں کے لیے جرمنی گیا ہے اور عنقریب ہی لوٹ آئے گا۔ سٹیلا نے اس کے بند کمرے کو ایک نظر دیکھا اور شفیع سے اس قدر کہا کہ تم نے اسے امتحان کے دنوں میں کیوں جانے دیا۔ اور اگر ایسی کوئی ضرورت پڑ گئی تھی تو مجھے ٹیلیفون کر دیا ہوتا۔ اس کے بعد اس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر اس سے مسکرایا نہ گیا اور وہ شفیع سے ہاتھ ملا کر اپنی ٹیکسی میں سوار ہو گئی۔

امتحان کے دن جوں جوں قریب آتے جاتے تھے۔ شفیع کو فکر پڑتی جاتی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اختر وقت پر نہ پہنچ سکے اور امتحان میں نہ شریک ہو سکے، لیکن پھر وہ یہ سوچ کر چپ ہو رہتا کہ اختر ایسا بچہ تو نہیں کہ دور دراز کا سفر طے کر کے امتحان کی غرض سے یہاں آیا ہو اور یہاں پہنچ کر امتحان میں شرکت ہی نہ کرے۔ کبھی کبھار اس کو اختر کے فیل ہو جانے کا اندیشہ بھی ہوتا لیکن اسے فوراً ہی یاد آجاتا کہ وہ اپنے ساتھ کتابیں لے گیا ہے اور کتابیں کھیلنے کے لیے تو لے جائی نہیں جاتیں۔ ان ساری تسلیوں کے باوجود اس کے دل میں بعض اوقات عجیب خیالات پیدا ہونے لگتے اور ایک گمنام سے خوف سے اس کی طبیعت بوجھل سی ہو جاتی ان کی دوستی کی مدت بہت ہی قلیل تھی لیکن شفیع کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ازل سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور اچھی طرح سے پہچانتے ہیں۔

میونخ اکیڈیمی کی سالانہ ضیافت پر الیستھر کی طرف سے اختر بھی مدعو تھا۔ ہال کے مرمریں فرش پر جوڑے ناچ رہے تھے اور کونے میں پچاس سازوں کا آرکسٹرا بج رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک چھوٹی سی میز کے گرد الیستھر اور اختر ارغوانی رنگ کی شراب پی رہے تھے اور پیار بھری باتیں کیے جاتے تھے ہر دو تین منٹ کے بعد کوئی طالب علم یا مہمان اختر کی پچھلی نشست پر آکر تھوڑی دیر کے لیے کھسر پھسر کرتا اور منہ لٹکائے واپس چلا جاتا الیستھر نے نیم باز آنکھوں سے اختر کی طرف دیکھا اور کہا۔

اگر حسن اکتسابی ہے تو شاید اس کا رویّہ مجھے یوں نہ کھلتا۔ لیکن اگر یہ عطیۂ خداوندی ہے تو یہ ہر ایک سے ایسا برتاؤ کیوں کر رہی ہے؟

"کون؟" اختر نے پوچھا۔

"یہ ملکۂ عالیہ جو تمہارے پیچھے تشریف فرما ہیں۔"

اختر نے پیچھے مڑ کر حیرت نگاہوں سے دیکھا۔ ایک بلا کی حسین لڑکی جھلا جھل گاؤن پہنے اپنے

گلاس سے کھیل رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ادھیڑ عمر کا ایک آدمی تھک جانے کے باعث میز پر کہنیاں ٹیکے اونگھ رہا تھا۔ اختر نے اس کا جائزہ لینے کے بعد پوچھا: یہ کون ہے؟

"کیمسٹری کی ایک طالبہ ہے۔" الیستھر نے بے پروائی سے کہا: منچلے نوجوان اسے مس میونخ خیال کرتے ہیں اور سال بھر تک اس کے ساتھ ناچنے کی تمنا کو کلیجے کے ساتھ لگا کر پالتے رہتے ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں کہ ہر لڑکا اس کے پاس آکر ناچنے کی درخواست کرتا ہے اور یہ رد کر دیتی ہے۔"

اختر نے مسکرا کر کہا۔ "تو انہیں اپنے حسن پر بڑا ناز ہے۔"

"کچھ ایسے ہی ہے۔" الیستھر نے ہلکی سی جمائی لے کر کہا: لیکن اس کا مان شاید یہاں تک نہ پہنچتا اگر ہال کے سارے لوگوں نے اس پر اپنی نگاہیں مرکوز نہ کر دی ہوتیں۔

اختر نے ہر شخص پر ایک پھسلتی ہوئی نگاہ ڈالی جو شراب کا گھونٹ بھرتے ہوئے اور پنیر کا ٹکڑا کاٹتے ہوئے کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا اور جب وہ اپنی نشست سے اٹھی تو سب کی نظریں اس کے وجود سے لپٹ گئیں اور اس کے ساتھ ساتھ سرکنے لگیں۔ وہ اختر اور الیستھر کے پاس آکر رکی اور ذرا خمیدہ ہو کر الیستھر سے جرمن میں باتیں کرنے لگی۔ الیستھر نے اختر سے کہا۔

"یہ تمہارے ساتھ ناچنے کی خواہش مند ہے اور درخواست لے کر آئی ہے۔ اٹھو اور اس کے ساتھ ناچو۔"

اختر نے کہا: "اور اگر میرا جی نہ چاہتا ہو تو۔"

"تمہارا جی نہ بھی چاہتا ہو تو بھی تمہیں اس کے ساتھ ناچنا ہوگا۔" الیستھر نے کہا: کسی خاتون کی درخواست رد کرنا انتہائی بدتمیزی ہے، اٹھو!"

اختر نے کہا: "خدا کی قسم میرا جی نہیں چاہتا اور میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ لیکن اگر یہ تمہارا حکم ہے تو سر کے بل ناچنے کو بھی تیار ہوں۔"

الیستھر نے کہا: "میں کیوں حکم دینے لگی، تمہاری اپنی مرضی ہے۔ لیکن اگر اس کے ساتھ نہ ناچے تو یہ انتہائی بدتہذیبی ہوگی۔"

"پرواہ نہیں" اختر نے لاابالی پن سے کہا: "آگے میں کونسا رکھ رکھاؤ کا پابند ہوں، جو لوگ میری اس حرکت کو بدتہذیبی پر محمول کریں گے۔ میں بدتمیز ہوں تو بدتمیز ہی سہی"۔

الیستھر نے اس لڑکی سے معذرت کی اور کہہ دیا کہ چونکہ میرے دوست کی طبیعت ٹھیک نہیں وہ ناچنے سے معذور ہے اور تم سے معافی کا خواستگار ہے۔ وہ بادلِ ناخواستہ اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی اور ہال کے لوگ سرگوشیاں کرنے لگے۔

اختر نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا۔

"بھلا میں اس کے ساتھ کیوں ناچوں۔ یہ مس میونخ ہوگی تو لوگوں کے لیے ہوگی میرے لیے تو یہ ایک عام لڑکی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ ہاں اگر میری مس میونخ ذرا بھی اشارہ کرے تو میں موت کا ناچ ناچنے کو تیار ہوں"۔

الیستھر نے کہا "میں کیوں تمہارے ساتھ ناچنے لگی کیا مجھے اپنے مقام کا علم نہیں جو تمہارے جیسے جنگلی کے ساتھ ناچنے کی تمنا کروں"۔

"شاباش" اختر نے طنزیہ لہجے میں کہا "خوب وفا کا صلہ دیتی ہو۔ تمہاری خاطر ہم نے اس آفتِ جان سے رقص نہیں کیا اور اب تم ہی ہم سے رکھائیاں کر رہی ہو"۔

الیستھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اپنا رومال آستین میں اڑستے ہوئے بولی: "باہر چلو اندر بیٹھے بیٹھے تو جی گھبرانے لگا ہے"۔

بڑے دروازے سے گذر کر وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چل کر ہال کی پشت پر آ گئے۔ جہاں پام کے بڑے بڑے پودے لکڑی کے چوکور گملوں میں دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ الیستھر نے کہا۔

"ادھر آؤ۔ چوتھی قطار میں ایک گملا خالی پڑا ہے اس کا پودا سوکھ گیا تھا۔ اور ابھی تک اس میں نیا پودا نہیں لگایا گیا۔ وہاں بیٹھ کر سگریٹ پیتے ہیں۔ آج میرا جی بھی سگریٹ پینے کو چاہ رہا ہے"۔

اختر اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور پودوں کے چوڑے چوڑے پتے لمبی لمبی انگلیاں بڑھائے ان کی راہ روک رہے تھے۔ چلتے چلتے الیستھر ایک دم رُک گئی اور مڑ کر کہنے لگی۔

"اگر تم اس لڑکی کے ساتھ ناچتے تو میں تمہارا منہ نوچ لیتی ۔۔۔۔"

"آخر کیوں؟" اختر نے بات کاٹ کر پوچھا۔ "اگر مجھے پہلے اس کا علم ہوتا تو ضرور اس کے ساتھ رقص کرتا۔"

الیستھر نے کہا۔ "آخر اسے پوچھنے کی جرأت ہی کیوں ہوئی۔ کیا وہ جانتی نہیں تھی کہ تم صرف میرے لیے یہاں آئے ہو اور میرے ہی لیے پیدا ہوئے ہو۔"

اختر نے ہنس کر کہا۔ "تو یہ سوال اس سے پوچھا ہوتا۔ مجھ سے کیوں استفسار کیا جا رہا ہے۔"

"تم سے اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ تمہاری کسی نہ کسی حرکت نے ضرور اسے شہ دی ہے ورنہ وہ جسارت کیوں کرتی۔ خدا کی قسم اگر تم اس کا ہاتھ تھام کر رقص گاہ کی طرف چل پڑتے تو میں بھرے ہال میں تم سے الجھ جاتی اور سب کے سامنے تمہارا گلا دبا دیتی۔"

"میرا کیوں؟" اختر نے حیران ہو کر کہا۔ "اس کا نہیں جس نے مجھے آمادہ کرنا چاہا۔"

"ہرگز نہیں۔" الیستھر نے تن کر کہا۔ "اس کا کیوں دباتی۔ اس پہ مجھے کون سا مان تھا اور میری وہ کیا ہوتی ہے۔ مجھے اپنی چیزوں پہ ہمیشہ اعتماد رہا ہے اور جونہی انہوں نے مجھ سے بے وفائی کی میں نے ان کو نابود کرنے میں سر دھڑ کی بازی لگا دی۔"

پھر وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اختر کو اپنے بچپن کا واقعہ سنانے لگی کہ مصالحے کی ایک گلابی رنگ کی گڑیا سے اسے کس قدر پیار تھا۔ جسے وہ لمحہ بھر کے لیے بھی اپنے آپ سے جدا نہ کرتی تھی۔ رات کو اپنے ساتھ سلاتی۔ صبح کو اپنا منہ دھونے سے پیشتر اس کا منہ دھلاتی، کپڑے پہناتی اور چائے کی میز پہ اپنے برابر والی کرسی پہ بٹھا کر جھوٹ موٹ چائے پلاتی ان دنوں اس کا چچا چند دنوں کے لیے میونخ آیا اور اس کے ساتھ الیستھر کی ہم عمر

اس کی بیٹی بھی تھی وہ گڑیا دیکھ کر مچل پڑی اور ایستھر سے درخواست کرنے لگی کہ وہ ایک منٹ کے لیے اس کو بھی گڑیا کندھے سے لگا کر تھپکنے کی اجازت دے مگر ایستھر نہ مانی۔ اس پر وہ رونے لگی اور ایستھر کی ماں نے گڑیا چھین کر اس لڑکی کو دے دی اور کہا اگر شام تک ایستھر تمہاری گڑیا کو ہاتھ بھی لگائے تو مجھے بتانا میں اس سے سمجھ لوں گی۔ ایستھر کو گڑیا کے چھن جانے کا افسوس نہ تھا لیکن بیبی بری طرح شکست کھانے کا بہت صدمہ تھا۔ اس نے کسی طرح آنکھ بچا کر گڑیا اڑائی اور چپ چاپ کچن میں جا کر کیک بنانے والی بھٹی میں ڈال دی۔ یہ واقعہ سن کر اختر نے کہا۔

"پھر تو تم سے ڈرنا چاہیئے"۔

"مجھ سے نہیں" ایستھر نے کہا "ہر جرمن عورت سے ڈرنا چاہیئے۔ یہ دنیا کی بڑی سے بڑی چیز برداشت کر لیتی ہے لیکن محبت کے معاملے میں کسی قسم کی دست اندازی یا رقابت کی متحمل نہیں ہوتی"۔

اختر نے ہنس کر کہا "یہ خوب ہے۔ دست اندازی کوئی کرے اور محبوب خواہ مخواہ میں مارا جائے۔ بھلا یہ کہاں کی منطق ہے"۔

"یہ ہمارے یہاں کی منطق ہے" ایستھر نے جواب دیا "اور بڑی خوبصورت منطق ہے — تمہیں پسند نہیں؟"

اختر نے کہا "پسند کیوں نہ ہو گی بھلا مجھے تو تمہارے یہاں کی ہر چیز پسند ہے"۔

اور یہ دن گذرتے رہے جیسے بوجھل بوڑھے سال نے قدم روک لیے ہوں۔ مہینہ دبک کر سو گیا ہو اور تاریخیں آگے نہ بڑھ رہی ہوں۔ شفیع نے خط لکھ کر تاریں بھیج کر اختر کو امتحان کی تاریخ یاد دلائی۔ ایک ملاقاتی کی زبانی جو میونخ آ رہا تھا اختر کو پیغام بھیجا کہ خدا کے لیے جلد آؤ۔ امتحان کوئی ہنسی کھیل نہیں کہ گاتا اور دوڑے۔ اس کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔ کئی لوگوں سے ملنا ہے۔ انٹرویو کے لیے سفارشیں تلاش کرنی ہیں۔ لیکن اختر نے کسی چیز کیطرف

توجہ نہ دی اور امتحان کو جوتوں کی دکان سمجھ کر دل ہی دل میں اس کی بولی دے ڈالی ۔ ایستھر نے بھی اس معاملے میں کوئی دخل نہ دیا اور کبھی پرسش نہ کی اور ڈپٹی کمشنری کا ادھ پکا پھل شاخ سے ٹوٹ کر لمبی لمبی گھاس میں گم ہوگیا اور جس دن اس کا پہلا پرچہ تھا اس دن وہ اور ایستھر گاڑی میں سوار مورناد کی طرف اڑے چلے جارہے تھے ۔ ان کے پاس ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا جس میں نہانے کا اونی لباس بڑی احتیاط سے تہہ کر کے رکھا ہوا تھا ۔ آج مورناد کی جھیل میں نہانے کا پروگرام تھا ۔ ایستھر اختر کو تیراکی سکھلانے لے جارہی تھی اس کا خیال تھا کہ انسانی زندگی میں سمندری سفر ایک ناگزیز حقیقت بن کر رہ گیا ہے اور ایسے سفر میں اگر جہاز کسی چٹان سے ٹکرا جائے یا آگ کی لپیٹ میں آجائے تو اس شخص کی کیا حالت ہوگی جسے تیرنا نہ آتا ہو اور اگر وہ شخص اختر ہو تو ! ایستھر نہیں چاہتی تھی کہ اختر کبھی بھی دوسرے جانداروں کی طرح موت سے ہمکنار ہو ۔ وہ کم از کم اپنی زندگی میں ایسی خبر سننے کی روادار نہ تھی کہ اختر کو کچھ ہوگیا ہے ۔

سردی بہت بڑھ گئی تھی اور مورناد تک پہنچتے پہنچتے یخ ہوا چلنے لگی تھی ۔ جھیل کے کنارے پہنچ کر اختر نے کہا ۔

" ایسی یخ ہوا تو یوں ہی میری پسلیوں میں پیوست ہوتی جارہی ہے اگر میں نے کپڑے اتار دیئے تو یہ میرے جسم پر تلوار کی طرح چل جائیگی ۔ ذرا اس کی کاٹ تو دیکھو ۔"

ایستھر نے کہا : " گھبراؤ نہیں ۔ یہ ہوا تمہیں کچھ نہ کہے گی اور جب تم پانی میں اتر جاؤ گے تو گرم ہو جاؤ گے ۔"

اختر نے ہچکچاتے ہوئے اپنا اوور کوٹ اتارا اور کپکپانے لگا اور قمیص اتارتے ہوئے تو اسے ایسی جھرجھری آئی کہ بتیسی نے کتنے سارے ماترے یکدم بجا دیئے ۔ کاسٹیوم پہنتے ہی اس کی حالت غیر ہوگئی اور کنارے پر اکڑوں بیٹھ کر اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دبا لیا ۔ ایستھر نے پانی کی سطح پر ہوئے ہوئے تھپیڑ مارتے ہوئے کہا ۔

جلدی ادھر آؤ۔ ورنہ تمہیں سردی لگ جائے گی۔"

اختر نے کانپتے ہوئے جواب دیا: "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میری جان نکلی جا رہی ہے اور سردی نے میرے اعضا منجمد کر دیئے ہیں۔"

الیتھر نے منہ میں پانی بھر کر ایک لمبی پچکاری اس کے جسم پر پھینکی اور کنارے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی: "اترو نہیں تو تمہاری ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتی ہوں" اور اس کے کنارے تک پہنچنے سے پہلے اختر غڑاپ سے پانی میں کود گیا۔ یہاں پانی کم گہرا تھا اور اختر کے بازو پر ٹیکے کا اوپر والا نشان لہروں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ الیتھر اسے شناوری کی تعلیم دینے لگی۔ سنجیدہ استانی کی طرح منہ لٹکا کر کے اس نے ایک ہی سانس میں بہت سی ہدایات دے ڈالیں اور اختر کا کندھا تھپک کر بولی: "اچھے بچے اب تیر کے دکھاؤ میں تمہیں سہارا دیتی ہوں۔" اس نے ایک ہاتھ اختر کے پیٹ اور دوسرا چھاتی کے نیچے رکھ کر کہا: "میرے ہاتھوں پر لیٹ جاؤ اور ہاتھ پاؤں اسی طرح چلاؤ، جس طرح میں نے بتایا ہے۔" اختر نے پاؤں زمین سے اٹھاتے ہی بے طرح ہاتھ مارنے شروع کر دیئے اُونچے اُونچے چھینٹے اڑتے۔ الیتھر نے بوچھاڑ سے بچنے کے لیے اپنا چہرہ ایک طرف موڑ لیا۔ چھاتی کا نچلا ہاتھ ذرا ڈھیلا ہوا اور اختر کو غوطہ آ گیا اس نے جلدی سے پاؤں کے بل کھڑے ہو کر زور سے "اچھوں" کیا اور پانی کی نمک مرچ لگی خوشبو اس کے دماغ میں گھس گئی، آنکھیں مل کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی، اور پھر کچھ کہے بنا سر کندھے پر جھکا کر کان سے پانی نکالنے لگا۔ جب وہ سر کو ذرا سا ہلاتا تو اس کے کان میں ایک بڑا سا دھنا دھنا کر ٹلا چھوں کر کے بجتا۔ بس ایک غوطے اور اس کے بعد کی قواعد نے اختر کو خاصا گرم کر دیا اور اس کے کندھوں کو چاٹتی ہوئی یخ ہوا ماند پڑ گئی! وہ تیرتا رہا، الیتھر اسے سہارا دیتی رہی اور ٹھنڈی ہوا ان کے گرد گھومتی اور ناچتی رہی۔

جب وہ جھیل سے نکلے تو شام ہو چکی تھی۔ کسان گرد آلود ٹوپیاں اور کھلے تسموں کے بھاری بوٹ پہنے گھروں کو واپس آ رہے تھے اور اسلحہ ساز فیکٹریوں کے رات کی مزدوری والے ملازم خاصہ دان ہاتھ میں جھلاتے اپنی نوکری پر جا رہے تھے۔ سڑک کے کنارے

ایک چھوٹے سے ریستوران میں وہ چائے پینے بیٹھ گئے - اختر نے پیالی میں پھونک مارتے ہوئے کہا: "آج انگریزی کا ایک پرچہ ختم ہو چکا ہوگا - اور شفیع دھوبی کے حساب کی طرح بار بار نمبر جوڑ رہا ہوگا"۔

"ہاں" الیستھر نے ہولے سے کہا: "تمہاری پیالی میں میں نے آدھ چمچ چینی زیادہ ڈال دی ہے - یہ تمہارے دوران خون کو درست کرنے میں تھوڑی سی امداد اور کرے گی"۔

اختر نے کہا: "تمہارے ہوتے ہوئے چینی کی ضرورت نہیں - چاند کے فارس ایسی عمیق آنکھیں سورج کی سی گرم شعاعیں چھوڑتی ہیں"۔

الیستھر نے آنکھیں گھما کر بڑے پیارے انداز میں کہا: "اب تمہیں شعور آچلا ہے پہلے تو اپنے آپ سے نگاہ نہ ہٹتی تھی - وہ دن یاد ہے اختر جب میں کونٹی راسو کے ٹوپ ڈیک پر پہلے پہل تم سے ملی تھی"۔

"یاد ہے" اختر نے سگریٹ جلا کر کہا - "کونٹی راسو اور اس ریستوران کے درمیان تمہیں ہی زمانہ پھیلا ہوا محسوس ہوتا ہوگا - میں تو اب بھی ٹوپ ڈیک پر گمیٹ پی رہا ہوں اور تم میری خوشامد کر رہی ہو"۔

"خوشامد"! الیستھر ہنس پڑی اور دیر تک اس کا بدن ہچکولے لیتا رہا۔

شام کے وقت میونک جانے والی آخری گاڑی تیار تھی اور جب وہ سٹیشن میں داخل ہوئے تو گاڑی پلیٹ فارم سے آہستہ آہستہ سرکنے لگی - بچوں کی طرح بھاگ کر وہ گاڑی میں سوار ہوئے اگلے اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے بتیاں روشن ہو گئیں اور باہر کی ساری چیزیں اندھیرے میں تحلیل ہو کر رہ گئیں - چند لمحوں کے لیے گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی اور پھر فراٹے بھرنے لگی - جب دوسرا اسٹیشن آیا تو الیستھر نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر باہر جھانکا - شیشے کے ایک بڑے سے فریم پر سٹیشن کا نام لکھا تھا اور اس کے پیچھے بتی جل رہی تھی - الیستھر نے اختر کا کندھا پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا: "جلدی اترو ہم غلط گاڑی

پر سوار ہو گئے یہ تو مورناو سے بھی آگے جا رہی ہے۔ اختر ہڑ بڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور جلدی سے دروازہ کھول کر پلیٹ فارم پر اتر آئے رسٹیشن سے ایستھر نے اپنی ماں کو فون کیا کہ ہم غلطی سے دوسری گاڑی میں سوار ہو کر مورناو سے بھی دو سٹیشن آگے نکل گئے۔ اب ٹیکسی کا بندوبست کیجیے تاکہ ہم واپس آپ کے پاس پہنچ سکیں۔ اس کی ماں نے کہا کہ تم رات یہاں کسی سرائے میں گذار دو اور صبح پہلی گاڑی سے میونخ پہنچ جاؤ۔

یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ اسٹیشن سے کافی دور ہرے بھرے کھیتوں میں چھوٹے چھوٹے گھر آباد تھے اور ان کی کھڑکیوں سے قدیم چراغوں کی روشنی چمکیں مار رہی تھی جگنوؤں کی اس وادی میں دور سے ڈوبتے ابھرتے گیتوں کی تانیں سنائی دے رہی تھیں اور بہت سے آدمی ایک ساتھ مل کر گا رہے تھے اور گیتوں کے بول ان کے استقبال کے لیے بڑھتے آتے تھے۔ پرانی وضع کی ایک چوبی عمارت کا دروازہ کھلا تھا۔ کمرے میں ایک ساتھ کئی بتیاں جگمگا رہی تھیں اور دروازے کے آس پاس چار پہیوں والی کاٹھ کی بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں جن کے گھوڑے تھوتھنیوں سے اگلی ٹانگیں کھجا رہے تھے اور ان کے سروں کی جنبش سے دہانوں کی زنجیریں بج رہی تھیں۔ اور سر دوال کانوں سے نکل نکل جاتا تھا۔ ایک گاڑی کے پاس ٹھٹھک کر انہوں نے اندر جھانکا۔ یہ قصبے کا شراب خانہ تھا اور سنگ مرمر کے لمبے سے کونٹر پر بیس پچیس اجڈ کسان کھڑے شراب پی رہے تھے۔ وہ نشے میں دھت ہو رہے تھے اور اپنی پوری آواز میں دہقانی گیت گا رہے تھے۔ تین چار گتھم گتھا ایک دوسرے کو ریل دھکیل رہے تھے اور گالیاں بکے جاتے تھے۔ بڑی بڑی مونچھوں والا ایک بھاری بھرکم کسان لکڑی کے ایک کمزور میز پر آلتی پالتی مارے زور زور سے جھوم رہا تھا اور میز اس کے نیچے چرک چوں چرک چوں کر رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی ٹوپیوں میں شراب انڈیل کر اوپر اچھالتے اور چیخیں مارنے لگتے۔ ایستھر نے قدم آگے بڑھایا تو اختر نے اس کی کلائی پکڑ لی اور آہستہ سے کہا: ادھر مت جاؤ۔ دیکھتی نہیں ہو کہ یہ لوگ پاگل ہو رہے ہیں اور انہیں جا و بیجا کی تمیز نہیں رہی ہے۔ نہیں دیکھ کر پتہ نہیں ان پر کیا بھوت سوار

ہو جائے اور جب انہوں نے مجھے تمہارے ساتھ دیکھا تو اور بھی آفت آجائے گی۔

الیستھر نے ہنس کر کہا: "تم انہیں کیا سمجھتے ہو! یہ جرمن کسان ہیں۔ بے ویرین کاشتکار ہیں۔ لندن کے لفنگے نہیں۔" اور وہ کھٹ کھٹ قدم اٹھاتی سیڑھیاں چڑھ گئی۔ اختر نے اپنے اوورکوٹ کے کالر کھڑے کر لیے اور سہما سہما اس کے پیچھے چلا آیا۔ ان دونوں کو دروازے میں داخل ہوتے دیکھ کر انہوں نے شور مچانا بند کر دیا۔ میز والا جلدی سے میز چھوڑ کر فرش پر کھڑا ہو گیا اور اپنی ٹوپی اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ دھینگا مشتی کرنے والے تیزی سے آگے بڑھے اور اٹیچی کیس اختر کے ہاتھ سے لے لیا۔ ہر ایک اپنا اپنا گلاس چھوڑ کر گریبان کے بٹن بند کرنے لگا اور کلال خانے پر کلب کا سا سکوت طاری ہو گیا۔ الیستھر نے کہا: "ہم غلطی سے ادھر آ نکلے ہیں اور ہمیں یہاں رات بسر کرنی ہے۔ کیا آپ میں سے کوئی ہمیں سرائے کا پتہ دے سکتا ہے؟"

"بے شک! بے شک!!" انہوں نے یک زبان ہو کر کہا اور ہولے ہولے قدم اٹھاتے الیستھر کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ ویسی ہی ویران پگڈنڈی پر خراماں خراماں یہ قافلہ جا رہا تھا اور ان کسانوں کے درمیان گھری ہوئی الیستھر بڑی بے تکلفی سے ان سے باتیں کئے جا رہی تھی۔ اختر دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے اور گردن سکیڑ کر کان کالروں میں کیے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ اٹیچی کیس والا کسان اختر کو اس طرح خاموشی سے چلتے دیکھ کر اس کی طرف بڑھا اور آخ ناخ ٹوگ شرٹ کوپ کرنے لگا۔ تو الیستھر نے مسکرا کر کہا: "یہ نہیں جانتا۔"

صبح جب اختر سو کر اٹھا تو اس کی پسلیوں میں میٹھا میٹھا درد ہو رہا تھا اور سانس لیتے وقت ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھتی تھیں۔ الیستھر نے سرائے کی مالکہ سے انڈے اور برانڈی پھنٹوائی اور چائے کی بجائے اس کا ناشتہ کر دیا۔ لیکن میونک تک پہنچتے پہنچتے اختر کی طبیعت کافی خراب ہو گئی۔ اور دو قدم چلنا بھی دوبھر ہو گیا۔ الیستھر نے سہارا دے کر اسے سیڑھیوں پر چڑھایا اور اس کے کمرے میں لے جا کر لٹا دیا۔ اس کے جوتے کھول کر دیر تک تلوے سہلاتی رہی اور جب پاؤں کافی گرم ہو گئے تو ان کے ساتھ مفلر لپیٹ کر ماں کو اپنی آمد سے مطلع

کرنے کے لیے گھر چلی گئی۔

اختر نے ہاتھ بڑھا کر میز سے شفیع کا خط اٹھایا جو اس کی غیر موجودگی میں آیا تھا۔ اس میں بھی وہی رونا تھا۔ کہ تم آئے کیوں نہیں، امتحان کو اہمیت کیوں نہیں دی اور میونخ میں کیوں چھپے بیٹھے ہو۔ آخر میں شفیع نے لکھا تھا کہ مجھے معلوم تھا تم امتحان دینے نہ آسکو گے کیونکہ تمہارا ایسا ارادہ نہیں تھا۔ لیکن میں تمہارے بغیر ہندوستان نہ جاؤں گا۔ تمہیں لینے کے لیے خواہ مجھے میونخ ہی کیوں نہ آنا پڑے میں ضرور آؤں گا اور اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ مجھے ضرور آنا پڑے گا۔

شام تک اختر کا بخار شدت اختیار کر گیا اور وہ نیم بیہوشی کی حالت میں الٹی سیدھی باتیں کرنے لگا۔ الستھر کو فکر پڑ گئی اور وہ اختر کو اسی حالت میں چھوڑ کر قریبی ڈاکٹر کو بلا لائی۔ ڈاکٹر دیر تک اس کا معائنہ کرتا رہا اور جب اس نے نسخہ لکھنے کے لیے پین کھولا تو دبی زبان میں کہا "نمونیہ ہو گیا ہے"۔ الستھر نے پریشان ہو کر پوچھا "خطرناک تو نہیں"۔ ڈاکٹر نے جواب دیا "میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اس کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ ابھی تک دوسرا پھیپھڑا زیادہ متاثر نہیں ہوا۔ لیکن اس کے اثر پذیر ہونے کا احتمال ضرور ہے"۔ اس نے سینے پر مالش کرنے کے لیے ایک دوا تجویز کی اور ٹیکہ دے کر چلا گیا۔ اختر سو گیا تھا لیکن درد کے آثار اب بھی ظاہر تھے۔ الستھر نے ایک نظر اسے دیکھا اور ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ اختر کا سانس رک رک کر چل رہا تھا اور تنفس کے دوران میں گیلے کپڑے کے پھڑپھڑانے کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ الستھر نے گیلری میں جا کر فون کیا کہ چونکہ اختر کی حالت خراب ہے اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں آج رات میں گھر نہ آسکوں گی۔ چند لمحوں کے بعد اس کی ماں اور خالہ اختر کے یہاں پہنچ گئیں۔ ٹیکے کا اثر کم ہو گیا تھا اور وہ سوتے میں کلبلانے لگا تھا۔ دونوں عورتیں دیر تک چپ چاپ بیٹھی رہیں اور الستھر گرم پانی کی بوتل بدل بدل کر اختر کے پاؤں میں رکھتی رہی۔ آدھ گھنٹے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور الستھر کی ماں اور خالہ کو دیکھا۔ انہوں نے اپنی دہشت کو دباتے ہوئے مسکراہٹ بھری نگاہوں سے اختر کو دیکھا اور خالہ نے اس کے بستر پر جھک

کر پوچھا: "اب طبیعت کیسی ہے؟"

اختر نے ہولے سے جواب دیا: "سانس بڑی مشکل سے آتا ہے اور چھاتی میں بلا کا درد ہو رہا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" ایستھر کی ماں نے تسلی دیتے ہوئے کہا: "صبح تک تم ٹھیک ہو جاؤ گے اور یہ ٹیکہ اپنا اثر کیے بغیر نہ رہے گا۔"

اختر نے کوئی جواب نہ دیا تو ایستھر نے کہا: "اسے بلائیے نہیں ڈاکٹر منع کر گیا ہے۔" تھوڑی دیر بعد دونوں عورتیں واپس چلی گئیں اور ایستھر کو تیمارداری کے لیے چھوڑ گئیں۔ خالہ کا خیال تھا کہ اختر نہیں بچے گا کیونکہ اگر دیسی آدمی مغربی ممالک کی ٹھنڈ کھا بیمار ہو جائے تو وہ مشکل ہی سے بچتا ہے۔ لیکن ایستھر کی ماں کو پوری امید تھی کہ اختر صحت یاب ہو جائے گا اور بہت جلد توانائی حاصل کرے گا۔ کیونکہ اختر کی آنکھوں میں اس نے وہ روشنی دیکھی تھی جو صرف زندہ رہنے والوں کی آنکھوں میں ہوا کرتی ہے۔ ایستھر اختر کی ٹانگیں سہلا رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اختر اس بیماری سے شفا پا گیا تو آئندہ پچاس سال تک کوئی حادثہ اس کے قریب بھی نہ پھٹک سکے گا۔ لیکن مشکل تو یہ تھی کہ وہ زندہ رہتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اختر اپنی نیم وا آنکھوں سے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا اور اس کے ذہن میں موت سے متعلق کوئی بات بھی نہ تھی۔ ایستھر نے اس کی کشادہ پیشانی سیاہ چمکدار بالوں اور بوجھل بوجھل پلکوں کو محبت اور ہمدردی کی نگاہوں سے دیکھا اور جھک کر اس کی ٹانگوں پر اپنا سر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر تک وہ بے حس و حرکت پڑی رہی۔ حتیٰ کہ ہلکی ہلکی سسکیوں نے اس کو چھوٹے چھوٹے جھکورے دینے شروع کر دیئے۔ اختر نے بڑی مشکل سے لحاف کے اندر سے ہاتھ نکالا اور اس کا کندھا تھپکنے لگا۔ جب ایستھر نے سر اٹھایا تو بالوں کے بہت سے تار اس کی تھوڑی اور گالوں سے چپکے ہوئے تھے اور ناک کی پھننگ پر ایک موٹا سا آنسو لرز رہا تھا۔ اختر نے اس کے کندھوں میں اپنی نحیف انگلیاں گاڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا اور وہ اس کے

کندھے سے لگ کر پھر سسکیاں بھرنے لگی۔

اگلے دن صبح تک اختر کی حالت ویسی ہی رہی اور جوں جوں دن ڈھلتا رہا طبیعت خراب ہوتی گئی۔ ایستھر نے ڈاکٹر کا علاج ترک دیا اور آئرین کو بلانے کے لیے ٹیکسی بھیج دی۔ آئرین سے اس کی ملاقات ایک ڈرامے میں ہوئی تھی جو میڈیکل کی لڑکیوں نے سٹیج کیا تھا۔ آئرین اس ڈرامے کی پروڈیوسر تھی اور موسیقی کی دھنیں بھی اسی نے نکالی تھیں۔ دو سال پہلے وہ طب کی ایک بھولی سی طالبہ تھی اور بات بات پر ہنس دیا کرتی تھی۔ لیکن امتحان پاس کرنے کے بعد اپنے پیشے میں آتے ہی اس نے وہ شہرت حاصل کی کہ میونک کے بڑے بڑے ڈاکٹر اس کے سامنے ماند پڑ گئے۔ دن رات کی مصروفیتوں اور مریضوں کے پریشان کن برتاؤ نے اس سے وہ ساری مسکراہٹیں تو چھین لیں۔ لیکن اس کا بھولاپن زائل نہ ہو سکا۔ سنہرے بالوں والی اکہرے بدن کی دودھیا سی گڑیا جب سفید کوٹ پہنے آپریشن روم سے باہر نکلتی تو اپنے ہاتھوں اور ناخنوں کو غور سے دیکھتی اور کوٹ اتار کر نرس سے پوچھتی: "میں تھکی تھکی سی تو نہیں لگتی"۔ اور پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر آپ ہی آپ یہ کہہ کر آگے چل دیتی کہ نہیں مجھے ایسے نہیں لگنا چاہیے۔ آخر میں نے کیا ہی کیا ہے۔ آئرین ایستھر کے ان معدودے چند دوستوں میں ایک تھی جن کے پاس ایستھر کبھی کبھار ایک آدھ گھنٹہ بیٹھنے کو موجب تسکین خیال کرتی۔ آئرین آئی اس نے اختر کو اچھی طرح دیکھا۔ ڈاکٹر کا نسخہ پڑھا اور ایستھر کو رائے دی کہ اختر کو بہت جلد ہسپتال میں داخل کرا دیا جائے تاکہ وہ ہمیشہ اس کی نگاہوں میں رہے اور تربیت یافتہ نرس اس کی تیمارداری کر سکے۔ ایستھر کو یہ بات بہت ناگوار گذری وہ اختر کو مرتے ہوئے دیکھ سکتی تھی لیکن کسی دوسری عورت کو اس کے ساتھ ہمدردی سے پیش آتے برداشت نہ کر سکتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایسی حالت میں اختر دم بھر کو بھی اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو اور اجنبی عورت اس کی تیمارداری کرتی رہے۔ اس نے آئرین کو وجہ بتائے بغیر صاف انکار کر دیا اور کہا کہ اگر وہ یہاں اس کی مدد کر سکتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ کسی اور ڈاکٹر کا بندوبست کرے گی۔ آئرین رضامند ہو گئی اور علاج شروع ہو گیا۔

سینے پر ملنے کی دوا ترک کر دی گئی۔ اور اس کے بجائے کمر پر پلستر لگا دیا گیا۔ آئرین کے پہلے ٹیکے سے ہی اختر کی طبیعت سنبھل گئی اور وہ سکون محسوس کرنے لگا۔ دیر تک ایستھر سے باتیں کرتا رہا اور پھر سو گیا۔ اس رات دو مرتبہ اس کی آنکھ کھلی اور صرف ایک مرتبہ اس نے شدّت کا درد محسوس کیا۔ ہدایات کے مطابق ایستھر اختر کو پابندی سے ایک چمچ برانڈی ملی دوا پلاتی رہی۔

آئرین اختر کو دیکھنے کے لیے بھی بلاناغہ تین تین چکر کاٹنے لگی اور اگر اسے ہسپتال سے تھوڑی دیر کے لیے بھی فراغت ملتی تو وہ سیدھی اس کے یہاں چلی آتی۔ اس نے کئی مرتبہ ایستھر سے کہا تھا کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو ایک نرس اس کی مدد کے لیے بھیج دی جائے۔ لیکن ایستھر نے مناسب نہ سمجھا۔

وقت دن رات کے روپ دھارتا آگے بڑھتا رہا۔ اختر کبھی بالکل سنبھل جاتا اور کبھی اس کی حالت پہلے جیسی ہو جاتی۔ اکثر وہ تکیوں کا سہارا لے کر بیٹھ جاتا اور جھلملیوں سے آنے والی دھوپ کی آڑی ترچھی لکیریں گنتا رہتا اور بعض اوقات اس سے کروٹ بھی نہ لی جاتی اور اس کا سانس دیر تک اکھڑا رہتا۔ شفیع کا خط تقریباً ہر روز آتا تھا۔ اس کے پرچے اچھے ہو رہے تھے اور اسے کامیابی کی پوری امید تھی۔ انہی خطوں میں اختر کے گھر والوں کی خیریت بھی لکھی ہوتی۔ سٹیلا کا تذکرہ بھی ہوتا اور اگر اس دوران میں سعیدہ کی کوئی چٹھی آئی ہوتی تو وہ بھی ملفوف ہوتی۔ جس دن اختر کی طبیعت ذرا بحال ہوتی تو وہ شفیع کا خط ایک سرے سے دوسرے تک آہستہ آہستہ پڑھتا۔ پھر اسے تہ کر کے تکیئے کے نیچے رکھ دیتا اور تھوڑی دیر کے بعد اٹھا کر پھر پڑھنے لگتا۔ شفیع تقریباً ہر خط میں لکھا کرتا کہ تئیس کو امتحان ختم ہو رہا ہے اور میں ستائیس کو واپس وطن لوٹ جانا چاہتا ہوں۔ لیکن میں اکیلا نہیں جا رہا تم بھی میرے ساتھ چل رہے ہو۔ میں ستائیس کے طیارے سے دو سیٹیں بک کروا لوں گا اور تمہیں اطلاع کر دوں گا۔ اگر تم وقت پر نہ پہنچے تو تمہاری موت میرے ہاتھ سے واقع ہو جائے گی۔

آئرین کو پہلے مریض سے ہمدردی تھی پھر اس میں دلچسپی ہو گئی اور آخر میں تھوڑا

سا لگاؤ پیدا ہو گیا۔ وہ دن میں کئی مرتبہ اس کا سینہ جانچنے آتی۔ پلستر ملاحظہ ـــــ کرتی اور چارٹ بھر کر چلی جاتی۔ ایستھر کو اس کی یہ آمد و رفت کھلنے لگی تھی اور وہ ڈاکٹر بدل دینا چاہتی تھی۔ لیکن اختر رضامند نہ ہوتا تھا۔ وہ کہا کرتا: "اس کے علاج سے مجھے فائدہ ہو رہا ہے۔ اگر یہ مجھے چھوڑ دے گی تو میری بیماری پھر عود کر آئے گی۔ میں مر جاؤں گا۔" ایستھر کو یہ جملہ بہت ہی ناگوار گزرتا۔ اس نے کئی مرتبہ اختر سے کہا تھا کہ یہ نہ کہا کرو۔ کہ اگر وہ مجھے چھوڑ دے گی تو میں مر جاؤں گا۔ مجھے تمہارے اسی بیان سے وہ زہر لگنے لگی ہے۔

اختر ہنس کر پوچھتا: "بس ابھی سے جلنے لگی ہو!"

"بے شک" ایستھر وثوق سے کہتی اور انڈے پھینٹنے لگتی:

کئی دنوں سے بڑی مزیدار دھوپ نکلنے لگی تھی اور اختر اب رو بہ صحت تھا۔ پلستر ابھی تک نہیں اتارا تھا۔ لیکن اب دوا کے بجائے اسے مختلف وٹامن کی خوراکیں کھلائی جا رہی تھیں اور قوت کے ٹیکے لگ رہے تھے۔ تیئس تاریخ سے دو دن پہلے اس نے شفیع کو اپنے ہاتھ سے ایک مختصر سا خط لکھا کہ ایستھر تمہیں میری بیماری کے متعلق مفصل طور پر لکھتی رہی ہے۔ اب مجھ سے مختصر طور پر سنو کہ میں رو بہ صحت ہوں اور بہت جلد تمہارے پاس پہنچ جانا چاہتا ہوں۔ لیکن ہم شاید ہی روانہ ہو سکیں گے۔ مجھے یہاں چند چھوٹے چھوٹے کام کرنے ہیں اس لیے میں تیس کی صبح کو تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا اسی دن کے طیارے میں دو نشستیں مخصوص کرا لینا اور میرا سامان باندھ کر اپنے کمرے میں رکھ لینا۔ لندن میں چند گھنٹے قیام کرنے کے بعد ہم وطن روانہ ہو جائیں گے۔ سٹیلا کو ہماری روانگی سے ہرگز مطلع نہ کرنا ورنہ بڑی مصیبت ہوگی۔ ایک خط سعیدہ کے نام بھی بھیج رہا ہوں اسے سپرد ڈاک کر دینا۔

دوپہر کو جب آئرین اختر کو ٹیکہ دینے آئی تو ایستھر نہیں تھی۔ اختر تکیئے کا سہارا لیے کتاب پڑھ رہا تھا اور دریچے کی دھوپ اس کے پاؤں سے لگی بیٹھی تھی۔ اختر نے آئرین کو اندر آتے دیکھ کر مسکرا کے سلام کیا اور کتاب میز پر ڈال دی۔ کف کا بٹن کھول کر اس نے آستین اوپر چڑھالی

اور آئرین کی طرف دیکھنے لگا۔ کرسی پر بیٹھنے کے بجائے آئرین نے اس کے پلنگ پر بیٹھ کر ٹیکہ دیا۔ سرنج میز پر رکھ کر وہ دیر تک اس کا بازو سہلاتی رہی۔ اس نے اختر کی نگاہوں میں جھانک کر کہا: "میرا جی تم سے اتنی ساری باتیں کرنے کو چاہتا ہے لیکن ایک تو مجھے انگریزی بہت تھوڑی آتی ہے۔ دوسرے ایستھر سے ڈر لگتا ہے۔۔۔۔"

"وہ کیوں؟" اختر نے پوچھا۔

"تمہاری دوست ہے نا اس لیے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔" اختر نے ہولے سے کہا: "وہ میری آقا تو نہیں۔"

"آقا ہی تو ہے۔ تم پر ہر گھڑی حکم جو چلاتی ہے۔"

اختر ہنس پڑا اور شرارت سے آنکھیں گھما کر کہنے لگا: "تم بھی تو مجھ پر حکم چلایا کرتی ہو کہ یہ مت کھاؤ وہ مت پیو۔ اس طرح نہ لیٹو۔ بٹن مت کھولو۔ کیا تم بھی میری آقا ہو؟"

آئرین کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ اس نے نگاہیں دریچے پر گاڑ کر کہا: "اگر میں تمہاری کنیز بھی بن سکتی تو میں خوشی سے مر جاتی لیکن رونا تو یہ ہے کہ میں وہ بھی نہیں ہوں۔"

اختر نے اسے کندھوں سے پکڑ کر آہستہ سے کھینچا اور وہ ٹوٹتی ڈال کی طرح اس کی طرف لہک گئی۔ اختر کے سینے پر سر رکھے وہ کہہ رہی تھی: "میرے ہاتھوں سے ہزاروں بیمار گزرے ہیں۔ لیکن میں نے تم سا کوئی مریض نہیں دیکھا۔ تم چارپائی پر لیٹے ہوئے بڑے ہی حسین لگتے ہو۔ کیا تم چلتے پھرتے ہوئے بھی ایسے ہی دکھائی دیتے ہو؟ مجھے تمہارے متعلق اس لڑکی نے بتایا تھا جو اکیڈیمی کی سالانہ ضیافت پر تمہارے ساتھ ناچنا چاہتی تھی اور تم نے انکار کر دیا تھا۔ آخر کیوں؟ ایستھر تم پر اس قدر حاوی کیوں ہے وہ تمہیں کسی سے ملنے کیوں نہیں دیتی۔ کیا تم اس کے زر خرید غلام ہو؟ اس کی خاندانی ملک ہو؟ — وہ تمہیں سینت سینت کر کیوں رکھتی ہے — تم میرے مریض ہو۔ میرے ساتھ چلو۔ میرے ساتھ رہو۔ میں نے تمہاری اس قدر خدمت کی ہے اس کا کچھ عوضانہ تو مجھے دو۔ تم بیمار تھے۔ میں نے تمہارا علاج کیا۔ اب میں بیمار ہوں۔

میرا علاج تم کرو۔" وہ بولتی رہی اور اختر اسے لپٹا کر پیار کرتا رہا وہ کہہ رہی تھی :" ایستھر تمہاری پرانی دوست سہی لیکن وہ تم سے پیار نہیں کرتی مجھے تم اپنی دوست نہ سمجھو لیکن میری خدمت کا خیال تو کرو۔ تمہیں بھی ایستھر سے پیار نہیں۔ فرض کرو اگر جہاز پر ایستھر کے بجائے میں تمہیں مل جاتی تو؟ ۔۔۔ وہ تمہیں پیار نہیں کرتی۔ وہ تمہیں پریشان کر کے اس پریشانی سے پیار کرتی ہے۔ بالکل ایسی ہی میری محبت ہے میں صحت مند اختر سے محبت نہیں کرتی مجھے مریض اختر سے پیار ہے۔ بتاؤ کیا میری چاہت بھی اتنی ہی شدید نہیں؟" دروازہ ایک دم کھلا اور ایستھر اندر داخل ہوئی اس نے پھلوں کی ٹوکری میز پر رکھ کر بڑے تحمل سے کہا: "ڈاکٹر آپ چلی جائیں اور اپنا بل بھجوا دیں ۔۔۔ اختر کو آج سے آپ کی ضرورت نہیں۔"

"ہے ہے :" اختر نے چلا کر کہا: "میں اس ڈاکٹر کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں اس کے سوا کسی اور سے علاج نہیں کراؤں گا۔" آئرین اپنا بیگ اٹھا کر چپکے سے باہر نکل گئی۔ ایستھر اختر کے بستر پر گر گئی اور اس کو سختی سے جھنجھوڑتے ہوئے بولی: "تم نے یہ کیا کیا اختر؟ مجھے مار ڈالا۔ اپنے آپ کو قتل کر دیا۔ اب کیا ہو گا؟ میں نے تمہیں کہا تھا۔ یہاں نہ آنا۔ میں تمہیں بلاؤں تو بھی یہاں نہ آنا۔ لیکن تم نہ مانے اب بھی چلے جاؤ، اس دیس سے بھاگ جاؤ۔" گریز کی راہیں کھلی ہیں۔ فرار کے دروازے چوپٹ ہیں۔ بھاگ جاؤ اختر بھاگ جاؤ۔" اور پھر وہ پھوٹ کر رونے لگی۔ اختر چپ چاپ بت بنا اسی طرح لیٹا رہا اس نے حسب عادت نہ تو اس کا کندھا تھپتھپایا اور نہ ہی ایک لفظ زبان سے نکالا۔ ایستھر رو رہی تھی، چیخ رہی تھی اور اختر آنکھیں پھاڑے چھت کو دیکھ رہا تھا۔

چار دن تک آئرین نے ادھر کا رخ نہ کیا۔ ایستھر بھی چپ رہنے لگی۔ وہ اختر کو وقت پر دوا پلاتی۔ پھل کھلاتی اور ٹمپریچر لے کر چارٹ بھر دیتی۔ اختر نے کسی نئے ڈاکٹر کی شکل تک دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے مناسب تیمارداری کا کام ایستھر ہی انجام دیتی رہی۔ ٹیکے نہ لگنے کی وجہ سے اختر پھر کمزور ہو گیا تھا اور اس کے چہرے کی سرخی آہستہ آہستہ

غائب ہوتی جا رہی تھی۔ میونک کی بہاریں رخصت ہو رہی تھیں۔ دریچے کی دھوپ مدقوق ہو گئی تھی اور اختر کا کمرہ دو انسانوں کی موجودگی کے باوجود آسیب زدہ دکھائی دینے لگا تھا۔ جس میں عہد عتیق کے کسی بحری قزاق اور اس کی محبوبہ کی روحیں منڈلایا کرتی ہوں۔

تیس تاریخ کی صبح کو شفیع سارا سامان باندھ کر اپنے کمرے میں کرسی پہ بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور ذرا سے دھوئیں سے اس کا کمرہ گھور گھٹا کی طرح بھر گیا تھا۔ آج سگریٹ کے دودھیا سلیٹی دھوئیں کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا کہ منہ سے نکلتے ہی کھلا جاتا اور بندھے ہوئے سامان کے گرد منڈلانے لگتا۔

سعیدہ نے کالج سے ایک ہفتہ کی چھٹی لے لی تھی اور انتہائی مسرت سے اس کی جان نکلی جاتی تھی۔ کل اتر جی آ رہے ہیں۔ میرے منو تو آ رہے ہیں۔ اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کئی مرتبہ دھرایا اور ریڈیو کھول دیا۔ نجمہ اس کی چارپائی پہ بیٹھی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ سعیدہ نے رسالہ اس کے ہاتھ سے چھین کر پرے پھینک دیا اور کہا: گولی مارو جھوٹی کہانیوں کو خیالی افسانوں کو مجھے یہ بتاؤ کہ میں کل کیا پہن کر ایروڈروم جاؤں؟

نجمہ نے مسکرا کر کہا: ایک تکلم ایک تبسم۔ ایک نگاہ بندہ نواز: سعیدہ نے جھوٹ موٹ چڑ کر اس کی اوڑھنی کھینچ لی اور کہا: تنگ کیوں کرتی ہو۔ سیدھی طرح بتاؤ:

نجمہ نے کہا: غرارہ، قمیص، جالی کا دوپٹہ اور ماتھے پر قمقم کی بندیا:

بارہ بج چکے تھے اور شفیع ابھی تک اسی طرح اختر کا انتظار کر رہا تھا۔ چمڑے کے بڑے بڑے بکس اور ہوائی کمپنی کے نیلے نیلے تھیلے اس کے اردگرد پڑے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اختر آج پانچ بجے سے پہلے نہ پہنچ سکا تو نشستیں منسوخ نہ ہو سکیں گی اور اتنی ساری رقم ضائع جائیگی۔

آئرین اپنا بیگ لے کر اندر داخل ہوئی تو اختر مسکرانے لگا اور چپکے سے ہاتھ اٹھا کر اُسے سلام کیا۔ ایستھر میز پہ جھکی ہوئی کچھ لکھ رہی تھی۔ پاؤں کی آہٹ سن کر اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ آئرین بت کی طرح دروازے کے پاس ایستادہ تھی۔ ایستھر کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے اختر کی

طرف اشارہ کر کے کہا: میں اسے لینے آئی ہوں۔

"کیوں؟" الیستھر اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"اس لیے کہ یہ میرا مریض ہے اور اسے ہسپتال کے علاوہ اور کہیں نہیں رکھا جا سکتا۔"

"یہ میرا مہمان ہے۔" الیستھر نے تحمل سے جواب دیا اور میں اسے ہسپتال میں داخل کروانا نہیں چاہتی۔"

"تم مہمان اختر کو جہاں چاہے لے جا سکتی ہو۔ لیکن مریض اختر میرا ہے۔"

آئرین کے چہرے کا بھولاپن اب بھی برقرار تھا۔

الیستھر نے کہا: میں نے تمہیں ایک دفعہ کہہ دیا تھا کہ یہاں آنے کی زحمت گوارا نہ کرنا لیکن تم پھر یہاں کیوں چلی آئی ہو؟

"میں اختر کو لینے آئی ہوں۔"

"اختر تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔"

"یہ تمہارے پاس نہیں رہ سکتا۔ اسے میرے علاج کی ضرورت ہے۔"

"میں اختر کے تمہارے ساتھ جانے پر اس کی موت کو ترجیح دوں گی۔"

آئرن نے اپنی ہنسی میں زہر گھولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "اب یہ تمہارے ساتھ نہیں رہیگا۔ آج سے یہ میرا مہمان ہے میرا مریض ہے اگر تم اس پہ زیادہ دباؤ ڈالنے کی کوشش کروں گی، تو اس کے نتائج بڑے خطرناک ہوں گے۔ ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ دینے کا وعدہ کر لیا ہے اور ہمارے عزائم بڑے خوفناک ہیں۔ اس وقت تم اسے میرے ساتھ جانے نہیں دیتی ہو۔ لیکن دو ہی دن میں تم ہمیں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے میونخ کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے دیکھا کروگی۔ تم ہمیں تنگ پہنچانے کی کوشش کروگی، تو منہ کی کھاؤ گی اور تمہارا انجام بھی وہی ہوگا جو کارل کا ہوا۔"

الیستھر نے سر اونچا کر کے کہا: "دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت اختر کو مجھ سے نہیں چھین سکتی تم تو۔۔۔۔"

"دیکھ لینا" آئرن نے بات کاٹ کر اپنی طرف اشارہ کیا: "کہ جرمنی کی آنے والی نسلیں اس کمزور ترین طاقت کے گیت گایا کریں گی اور تمہاری حرماں نصیبی کی داستانیں پڑھ پڑھ کر لڑکیاں بستروں میں دبک کر رویا کریں گی۔"

الیستھر نے تلخ ہو کر کہا: "میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔ یہاں سے چلی جاؤ ورنہ مجھے دھکے دے کر نکالنا پڑے گا۔"

آئرن نے جانے کے لیے قدم اٹھایا اور سر موڑ کر کہا: "یہ میری زندگی کا پہلا اور آخری عزم ہے۔ آج رات کے بعد اختر تمہارے پاس نہیں رہے گا۔ یہ میرا چیلنج ہے اور جرمن عورت کے چیلنج سے تم بخوبی واقف ہو۔"

اس نے دروازہ کھٹاک سے بند کر دیا اور باہر نکل گئی۔ الیستھر نے ایک نظر اختر کو دیکھا جو حیران و پریشان ہجے کے اتار چڑھاؤ سے ان کی گفتگو کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا اور ان کے لال بھبھوکا چہروں کو دیکھ کر سہم سا گیا تھا۔ تھوڑی دیر تک الیستھر اسی طرح مبہوت کھڑی رہی۔ پھر وہ بھی اسی طرح دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔

آئرن موٹر چلا رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ اختر مجھے نہیں ملتا نہ سہی لیکن الیستھر کو بھی اپنی طرح محروم کر دوں گی۔ الیستھر سڑک کے کنارے کنارے اپنے آپ سے سرگوشیاں کرتی پیدل چلی جاتی تھی۔ میں میونخ چھوڑ کر کہیں دور چلی جاؤں گی۔ میں اختر کو اس کے وطن بھیج دوں گی — لیکن میں آئرن اور اختر کی شادی ہی کیوں نہ کرا دوں۔ وہ بچی ہی تو ہے ضد میں آگئی — اختر بھی اسے چاہتا ہے اور وہ دونوں ہمعمر ہیں، ایک طبیعت رکھتے ہیں — لیکن اس طرح تو میں خود ہی شکست کھا جاؤں گی — اس نے مجھے چیلنج کیا ہے اور میں اس سے پنجہ لڑائے بغیر ہتھیار ڈال دوں؟ —
ننھی الیستھر اس کے آگے بھاگنے لگی۔ سفید فراک لہراتی ہوئی، بالوں میں سرخ ربن باندھے اور رنگین ننگے بوٹ پہنے وہ اس کے آگے آگے بھاگ رہی تھی۔ اس کی گود میں ایک پیاری سی گڑیا تھی جسے چھیننے کے لیے اس کی چچا زاد بہن اس کا پیچھا کر رہی تھی۔

آئرین نے کہا: مجھے اتنی لمبی زندگی میں ایک شخص سے محبت ہوئی اور اب وہ بھی مجھ سے چھینا جا رہا ہے۔ ایستھر نے کارل کی جان لی۔ اس پر بھی لوگ پروانہ وار اس پہ مرتے ہیں لیکن اب میں اختر کو اس کے پاس نہ رہنے دوں گی ۔۔ میں اپنے پیار کا اپنے ہاتھوں گلا گھونٹ دوں گی، لیکن اسے نیلام نہ ہونے دوں گی۔ اختر مجھ سے محبت نہیں کرتا نہ سہی، لیکن لیکن ۔۔ لیکن وہ مجھ سے محبت کیوں نہیں کرتا؟ اس نے کھٹ سے رجسٹر بند کر دیا اور ڈسپنسری میں چلی گئی۔ ترازو کو ایک طرف ہٹا کر اس نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا چہرے سے اب بھی بھولپن ٹپک رہا تھا، لیکن وہ تھکی تھکی سی دکھائی دیتی تھی۔ اس نے زہریلی ادویات کی الماری کھولی اور شیشیوں کے پاس انگلی منڈلا کر ایک چھوٹی سی شیشی اٹھا کر اپنے بیگ میں بند کر لی۔ آئرین کو معلوم تھا کہ ایستھر رات کو آدھ گھنٹے کے لیے اپنے گھر جا کر کافی بنوا کر لایا کرتی ہے اور وہ رات کے اس لمحے کا انتظار کرنے لگی!

ایستھر نے وہ شام اینگلشے گارڈن میں گزاری، جھیل کے کنارے وہ محصور آدم زاد کی طرح آنسو بہاتی رہی اور سنگترے کے اس پودے سے لپٹ کر اس نے دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا جہاں کارل اسے آخری مرتبہ ملا تھا۔

رات ڈھلتے ہی جب وہ اٹھی تو آئرین کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا۔ اور اس کا چیلنج ایستھر کے کانوں میں سٹیشن کی گھنٹی کی طرح بجنے لگا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پودے کی ایک سرسبز شاخ کو جھٹکا دے کر توڑا اور نگاہوں کے سامنے گھومتے ہوئے چہروں کو سنا کر کہا: مجھے تمہارا چیلنج منظور ہے۔ کوئی ارضی یا سماوی طاقت تمہیں اختر نہ دلا سکے گی۔ وہ آخری سانس تک میرے ساتھ رہے گا اور تم اس کا سایہ بھی نہ دیکھ پاؤ گی۔"

جب وہ اختر کے کمرے میں پہنچی تو اختر سو رہا تھا۔ اس نے دبے پاؤں اس کے پلنگ کے پاس جا کر اسے اچھی طرح سے کمبل اڑھا دیا اور خود باہر نکل گئی۔ گھر پہنچ کر اس نے کافی بنانے کے لیے کہا اور خود اپنے کمرے کی الماری الٹ پلٹ کرنے لگی۔ نیلے رنگ کی چپٹی سی شیشی نکال کر اس نے اپنے پرس میں ڈالی اور کافی کی تھرموس لے کر اختر کے فلیٹ کو روانہ ہو گئی۔ لان کے پاس

اسے یوں لگا جیسے آئرین کی گاڑی آکر رُکی ہو۔ اور دروازہ کھلنے سے پیشتر پھر سٹارٹ ہو کر واپس درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئی ہو۔ اس نے نمبر پڑھنے کی کوشش کی مگر روشنی کم ہونے کی وجہ سے ہندسے اس سے اٹھائے نہ جا سکے۔ سیڑھیاں چڑھ کر اس نے دھک دھک کرتے دل سے گیری عبور کی اور جب وہ اختر کے کمرے میں داخل ہوئی تو اختر جاگ رہا تھا۔ ایستھر نے آئرین کے بارے میں کچھ نہ پوچھا اور پیالے میں کافی انڈیلنے لگی۔ چینی شیشی کا ڈھکنا کھلا اور چینی کے ساتھ ساتھ ایک چمچ سفوف بھی کافی میں تحلیل ہو گیا۔ اختر نے مسکرا کر ایستھر کی طرف دیکھا اور پیالی ہونٹوں سے لگا لی۔ ایستھر نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور جب اختر کافی پی کر پیالی لوٹانے لگا تو اس کا ہاتھ کانپا اور پیالی فرش پر گر کر چکنا چور ہو گئی۔ ایستھر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر پروانہ وار اس پر گر پڑی اور کہنے لگی "تم میرے ہو۔ آئرین شکست کھا گئی اور میں جیت گئی۔ تم آخری سانس لے رہے ہو اور میں تمہارے ساتھ ہوں۔ بہت سے لوگوں نے تمہیں مجھ سے چھیننا چاہا لیکن ناکام رہے۔ بہت سوں نے ایستھر کے گھر میں سیندھ لگا کر تمہیں چرا لے جانا چاہا لیکن ایستھر ہوشیار ہو گئی۔ ایستھر اس دور کی سب سے بڑی عورت ہے میں ہیلن کیلر ہوں۔ ماتا ہری ہوں۔ جون آف آرک ہوں ـــ فلورنس نائیٹنگل ہوں۔ بھلا میں کیا نہیں ہوں" اور جب اختر کی نبضیں چھوٹ گئیں تو اس نے اس کے کان کے پاس منہ کر کے کہا: "آج گیملٹ نہیں پیو گے۔ اٹھو کونٹی راسو طوفان کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ سمندر پھن اچھال رہا ہے۔ اٹھو اختر! ورنہ جان بچانے والی یہ ساری کشتیاں ایک ایک کر کے ختم ہو جائیں گی۔ دیکھو شمو کا اپنی وہسکی کی بوتل آدھی چھوڑ کر نیچے بھاگ گیا ہے۔ تم بھی اٹھو۔ اٹھو نا اختر، اٹھو بھی ـــ اٹھو ـــ دیکھو ـــ دیکھو ـــ" اور وہ دیوانوں کی طرح زور زور سے چیخیں مارنے لگی۔

اگلے دن صبح شفیع اسی طرح سامان کے درمیان بیٹھا ہوا بس کا انتظار کر رہا تھا، جو اسے ہوائی اڈے پر لے جا کر میونک جانے والے جہاز میں سوار کرا رہی تھی۔ چچا اور چچی تیار ہو کر باہر موٹر میں بیٹھے ہارن پر ہارن دیئے جا رہے تھے۔ ہوائی جہاز کے لینڈ کرنے میں صرف پون گھنٹہ

باقی تھا اور انہیں اتنی دور ہوائی اڈے پر پہنچنا تھا - دلہن کی طرح بنی سنوری سعیدہ کو بجنہ باہر نکلنے نہیں دیتی تھی اور چٹکیاں لے کر اور اس کے آگے پھدک پھدک کر گا رہی تھی - او اپنے بالم سے - او اپنے ساجن سے ملنے جاتی ہو — جاتی ہو — اری او گوئیاں ! پورچ میں موٹر کا ہارن بج رہا تھا پاں پاں ! پاں پاں !! اور کمرے سے آواز آ رہی تھی - اوئے ہوئے ہوئے - ہوئے اوئے.......

پیرس ۲۰۵ کلومیٹر
سفرنامہ
محمد اختر ممونکا
قیمت ۵۰ روپے
سنگ میل پبلی کیشنز چوک اردو بازار
لاہور

اشفاق احمد

سفرِ مینا (افسانے، سفرنامے، ناولٹ)

توتا کہانی (ڈرامے)

ایک محبت سو افسانے (افسانے)

مہمان بہار (ناولٹ)

بانو قدسیہ

راجہ گدھ (ناول)

آدھی بات (ڈرامے)

توجہ کی طالب (افسانے)

ممتاز مفتی

علی پور کا ایلی (ناول)

انتظار حسین

بستی (ناول)

علامتوں کا زوال (تنقیدی مضامین)

ڈاکٹر سلیم اختر

کڑوے بادام (افسانے)

محمد اختر ممونکا

پیرس ۲۰۵ کلومیٹر (سفرنامہ)

آ بیل مجھے مار (سفرنامہ)

سفر تین درویشوں کا (سفرنامہ)

سنگِ میل پبلی کیشنز ، لاہور